

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

# سینئر ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2018

معارف  
معراج رسول

PakiBooks.Site



عزم آزادی مبارک  
میری پہچان پاکستان





مدیر اعلیٰ  
عذرا رسول

مدیرہ  
ناٹب مدیر  
یمنی احمد  
اظہر حسین

مینجر اشتہارات  
محمد شہزاد خان  
0333-2256789

سرکولیشن مینجر  
سید منیر حسین  
0333-3285269

انشائیہ

جون ایلیا

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سالوں پہلے لکھے گئے لفظوں کی  
اہمیت جو آج بھی پورے اترتے ہیں  
سپنس کی مجلس مشاورت دستارین کی تاروں  
شیریں باتیں لکھے گئے اور جنہوں نے مشورے

دھوکے باز

علی اختر

غیر ہم

شوید ریاض

ماضی کا گہمیت۔ ہفت روزہ اور بے اختیار  
اگر دلی کے سن آموز اور عبرت آسینہ واقعات  
سرخ رسانی میں معاون  
بن جانے والی ایک معمولی سی بات

رائگاں

مظہر سلیم ہاشمی

رنگ آسمان

ایمان احمد

پریلی شاموں میں  
ایک خون آشام وروداد  
شرق مغرب کے عجیب و غریب اور دلکش و دلچسپ  
کے عبرت آرا شاہوں میں ایرانی پورے پورے

نہالے پتلا

زبیر حسین

مقدس تصویر

شاہ زین رضوان

دھوکے بازوں کے آئینے میں روپ  
بدلتے مکاروں کا دلچسپ قصہ  
ہندوئی پاکیزگی کا پیرا  
اور ہے ایک چور کی کارست

انجاء بشر

ملک صفدر حیات

نرس

محمد الیاس

ایک لمحے ہوئے کیس اور  
جستے ہوئے ترمیموں کا انتخاب  
بدکرداری کی دلدل میں جھلس  
جانے والی ایک نرس کی

قطعہ کہانی

منظر امان

مخفیانہ شعر و سخن

قارئین

بلکے جھلکے انداز میں زندگی کی حقیقت  
کو سمجھائی ایک۔ پراثر تحریر  
آپ کے ہاتھوں کی ایک خوش محنت نگ  
آپ کے ہاتھوں کی ایک خوش محنت نگ

بدعا

محمد فاروق انجم

وقت

حسام بٹ

کچھ حساس محلوں کی گرفت میں  
قید ہونے والے لفظوں کا ماحسرا  
ایک عزم بازی کی بازی گری۔ سنسنی  
خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

بالآخر

ظفر اقبال ظفر

یتیم

ثمر عباس

موت کے خوف زدہ ایک سرریض  
کائنات کا خیالات کا اظہار  
کبھی نہ بچھڑنے والے رشتوں  
کی جہدائی اور انوکھا ملاپ

حضرت موسیٰ

رضوانہ ساجد

شک

بابر اعوان

مصر کی سرزمین پر فرعون  
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال  
ایک ایسا انداز پر جوش پولیس  
آفسر کی باریک بین نگاہوں کا کمال

سنگین خاتمہ

نثار ہادی

کشتہ بازی

انارہ

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی غارت کو سترزل  
کرنے والے غیر فروش لوگوں کی عبرت اثر داستان  
دنیا بھرے لوہے اور پھر سے لطیفے، جھلکے آتشیں  
مسکراہٹیں اور مقصدی بے پروا پ کیلے



## سلا متی کی راہ

صدیوں پہلے کتاب میں لکھا گیا۔  
 ”بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے، تاریکی ہو تو کیسی بری ہوگی۔“  
 چنانچہ اسے شخص اپنے بدن کے چراغ کو کام میں لا اور اپنے گرد و پیش پر نظر کر۔ دیکھ کہ زمانہ نئی بساط بچھاتا ہے اور نئے رنگ دکھاتا ہے اور اب جبکہ دشنام کی آندھیاں گزر چکیں اور چڑھی ہوئی کمائیں اتر چکیں، اپنی زبان کو اپنے دہن میں سلا دے اور کدورتوں کو دل سے بھلا دے۔  
 اور اے شخص! کیا تجھے یاد نہیں کہ لکھنے والے نے کتاب میں صدیوں پہلے لکھا تھا۔  
 ”عیب جوئی نہ کر کہ تیری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔“  
 کیونکہ جس طرح تو عیب جوئی کرتا ہے، اسی طرح تیری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تو ناپتا ہے، اسی سے تیرے واسطے ناپا جائے گا۔

تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر بھی غور نہیں کرتا؟  
 اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا، میں تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟  
 اے شخص! آ..... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب ہم بہم ہوں تو ”ہم“ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہاں وہی ”ہم“ اپنی سرکھویں، اپنی دشمنیوں کو نہ کریں۔ اپنے بھگروں کو اندھے کوئیں میں دھکیلیں اور اپنے قضیوں کو گڑھے میں دفن کریں۔

اے شخص! آ..... کہ اب ہم اپنے پاکستانوں کی خبر لیں اور اپنی چراگا ہوں کو دیکھیں۔ ہم وہ سیل ڈھونڈیں اور وہ راہ نکالیں کہ ہمارے کھیت فصلوں سے چھلک رہے ہوں اور ہمارے دسترخوان ہر نوع کے تر اور خشک میوؤں سے مہک رہے ہوں۔ ہماری پوشاک سونے کے تاروں سے کاڑھی جائے اور ہماری عورتیں لعل و گہر کی دمک سے شب چراغ ہوں۔ ہماری گلیوں میں خوشبوؤں کے کنڈراؤں لیلے جائیں اور ہمارے گھلوں میں خوشیاں بار پائیں۔

حکمت ہمارے ذہنوں میں جگہ بنائے اور خرد ہمارے فیصلوں کو راہ دکھائے، تاریکیاں ہماری بستیوں سے رخصت ہوں اور روشنیاں ہمارے قریبوں کو جگمگائیں۔ دیرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی کو لبھائیں۔ لوٹنے والوں کے ڈیرے برباد ہوں اور انصاف کرنے والوں کے گھروں میں شادیاں بکھیں۔

امن ہمارے سروں پر آسمان بنے اور سلامتی ہمارے پیروں کے نیچے زمین ٹھہرے۔ ہمارے بچے بڑھاپے کی دہلیز کو الٹکیں اور ہمارے جوان زندگی کو گھونٹ گھونٹ پئیں۔ ہماری کنواریاں اپنے گھروں کی ہوں اور ہماری بیاباہوں کے سہاگ سلامت رہیں۔

اے شخص! اب جبکہ جہتوں کی چڑھی ہوئی ندیاں اتر چکیں اور طنر کے سارے تیر کند ہو چکے۔ آ..... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب تو اور میں بہم ہوں تو ”ہم“ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اے شخص! آ..... کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ پر چلیں اور ہمارے بعد کی نسلیں اور ان کے بعد ان کی نسلیں.....!







عزیز ان سب!  
السلام علیکم!

اگست 2018ء کا دغریب شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ لیجئے جناب وقت کی تیز رفتاری دیکھتے ہیں تسلیوں پر محیط تاریخ رقم کرتے ہوئے ہم اکثر وہاں یوم آزادی منار ہے ہیں۔ تمام اہالیان وطن کو جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو مگر جب اس طویل عرصے کی..... بڑی کامرانی دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنا وقت صرف نفسی کی نذر کردیا اور یہ دھڑکی جو ہماری نادر ملت ہے اس کی بقا اور روشن نام کے حوالے سے ہم اپنا حق صحیح طرح سے ادا نہ کر سکے۔ ہمیں بابائے قوم کا عظیم شہر مدنی کی محسوس کرنی چاہیے کہ ان کے دیے ہوئے اس حق کی ہم پیار سے قدر نہ کر پائے۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اگر ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کوتاہیوں کا احساس اور ادراک ہو جائے اور ہم ان کو ازالہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں تو کوئی شک نہیں کہ دنیا کے نقشے پر ایک بھرپور اور کامیاب وطن کے طور پر جانا جائے۔ الحمد للہ اب بھی ہم کسی سے پیچھے نہیں تاہم اپنی خامیوں پر ہمیں خودی نظر پڑنی کی بھی اشد ضرورت ہے۔ پرچہ کی اشاعت کے دوران انکسٹنٹ فیم پور سے زور و شور کے ساتھ اپنے اختیاری مراحل کی جانب کاڑھنے سے..... یہ تو وقت اور حالات ہی بتائیں گے کہ حکومت کس چاٹ کا شکار نہ ہوگی یا مندر طاقت کا شیعہ جو کچھ ہمیں نظر آ رہا ہے وہ..... انکسٹنٹ کیلک کر دو، اجماع حق سے کنڈہ جوڑا، کی عملی تفسیر بن کر سامنے نہ آ جائے۔ بہر حال اللہ سے اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔ انکسٹنٹ کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہوتا ہے کہ تمام قاعدین کو کم از کم ان دنوں بڑی دردمندی کے ساتھ عوام کے بنیادی مسائل کا ادراک بہ غریب ہو جاتا ہے جن کا اعتراض وہ اپنی انکسٹنٹ فیم کے دوران جگہ جگہ پر اور قدرے ریب میں کرتے نظر آتے ہیں۔ اب وہ بات کہ انکسٹنٹ کے بعد ان کا ان مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ بہت اچھا لگ رہا ہے آج کل جب لوگ اپنے بھائی بھائی کی بات یا خوف و خطر کرتے نظر آ رہے ہیں۔ تعلیم دور..... دوٹ لو..... پانی دوٹ لو..... دوٹ لو..... اور دوٹ کو عزت دو..... کوئی صحت کے متعلق بات کر رہا ہے۔ کمال کے لوگ ہیں، کمال کی جملے بازی ہے اور بہت ہی باکمال وہ اشتیارات ہیں جو آج کل لاکھوں روپیہ لگا کر تیار کر کے میڈیا پر بار بار اشتیارات کے حوالے سے دیے جا رہے ہیں۔ اس وقت کوئی ڈراما اتنا اچھا نہیں لگ رہا جتنے اچھے یہ اشتیارات سرگرمیوں کو اجاگر کرنے والے اشتیارات لگ رہے ہیں..... مگر عوام کے مسائل کا حل صرف مسائل کی نشاندہی میں نہیں بلکہ انتخابات کے بعد ان کی طرف بھرپور توجہ دینے میں مضمر ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یوں تو بجلی کے بجھنے کے ہی کے بجھنے پورے ملک میں گتے رہتے ہیں لیکن گزشتہ دنوں کراچی کے عوام کے لیے بجلی مزید اکہتر پیسے کی یونٹ بجلی کرنے کی منظور دے دی گئی ہے۔ دیکھیے اس ضمن میں کیا ہوتا ہے تو کوئی یہی حقیقت ہے کہ چوروں کی حیدرلی سے نہیں اذان کی حیدرلی سے سحاروں میں انقلاب آتے ہیں۔ امید ہے کہ اگلا شمارہ آنے تک سیاسی سدا کے حوالے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہوگا۔ قوم سے کیے گئے وعدے اور دغے پورے کرنے کے انتظامات ہوتے ہیں یا نہیں ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر کے خالص ذاتی مفاد کے نظریات پر کام کرنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دنوں عاجزی کا محور نظر آنے والے یہ خاکسار آنے والے دنوں میں عوام کے درد کا دوا دیکھتے رہتے ہیں۔ ابھی امیدیں اور اچھے خوابوں کا سندھیر لے کر ذرا اب چلتے ہیں اپنی اس بزم دوستاں کی جانب جہاں پیار اور غلوں کی سوغاتیں لیے جا رہیں حاضر ہیں۔

محمد رفیق، واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں، میرا سلام قبول ہو اور گزارش ہوئی عید کی مبارک قبول ہو۔ رسالہ آج آتا ہے بہت خوشی ہوتی ہے اور اپنی رائے دینے کی بھی جلدی ہوتی ہے کہ کہیں محفل میں شامل نہ ہونے والوں میں کسی نہ ہو جائیں۔ یہی کیا کریں کہ کہیں حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہ گرم موسم کے دن وہ بھی روزے سے ہیں تو داد و ثنا اور لائی والوں کا ذکر و زول میں سخت گرم دن اور سب سے بڑھ کر بجلی کا نہ ہونا یہ کراچی والوں کی ہی ہمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے قبول کرے۔ آمین۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی کہانی نا اتفاقی، چاندنی بانی کے متعلق بھی اور اس سے

اس وقت کے حالات بھی معلوم ہوئے، بہت اچھی کہانی ہے۔ اللہ ان کے قلم کو اور روایتی عطا کرے۔ آمین۔ دوسری کہانیوں میں چور چائے شور، فریب آرزو، آخری باب، دھکار، باریک مین، سنگین خاتمہ، خوب کہانیاں ہیں۔ وسیلہ میں محمد الیاس صاحب نے خوبصورت تصویریں بھیجی ہیں۔ کوئی بھی پیش خراب نہیں ہوتا، یہ سچ ہے۔ سفر بخیر میں منظر امام نے ایک منفرد کہانی پیش کی ہے۔ کچھ ایسی صورتیں ہوتی ہیں جن کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا، نہ ہی دل سے نکال سکتا ہے۔ پراسرار محافظ میں نادیہ نور صاحبہ نے قدرت کی مہربانی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ جب اللہ کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے تو کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیتا ہے۔ محفل شعر و سخن بھی اچھے شعروں سے سجی ہوئی تھی۔ آتے ہیں خط کی طرف تو آپ میرا خط شائع کر دیتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ سب لکھنے والوں کو میرا سلام قبول ہو۔ عبدالجبار رومی، علی علی ہیر، محمد شاد نواز، سنے لکھنے والے، محمد صفدر، زرین خان آفریدی، رمضان پاشا، اور میں احمد خان، فضل عباس محمد زبیر ساگر، علیق ربانی انجم، محمد ہمایوں تولی، طارق خان، محمد خواجہ اور ناہید یوسف سب نے سہنس کی روایت میں اضافہ کیا۔ سب کو میری طرف سے بہت بہت عید مبارک قبول ہو۔ اس دفعہ ریاض بٹ..... کا خط محفل میں نہ تھا۔ ریاض بٹ صاحب سے گزارش ہے کہ وقت نکال کر خط ضرور لکھا کریں۔ آپ کا شعر پسند آیا۔

محمد رمضان پاشا، بخش اقبال، کراچی سے تھرہ کر رہے ہیں، اس بار سہنس میں موقع پر مارکیٹ میں آ گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ تین چھینٹوں کے بعد 19 تاریخ کو پرچہ بازار میں آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ (عید کی جو بیٹیاں پھر کیسے پرچہ لیت ہوتا) جولائی 2018ء کا سہنس کا سرورق کافی پرکشش تھا۔ ڈاکر بھائی نے بڑا اچھا ناول بنایا، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ڈاکر بھائی ابھی تک علی ہیں یا رو بہ صحت ہو گئے ہیں؟ جون صاحب کا انشائیہ بہت ہی پر مغز تھا، اسے لکھنے کے لیے خاص دماغ کی ضرورت ہے اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ زویا انکاز کی کہانی آخری باب بہت خوب تھی۔ ناب کلاس کہانی کار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ شامش زویا انکاز..... رنگ آسمان بہت خوب، ایک کہانی میں دو کہانیاں چلا کر کہانی کا کام نہیں۔ اسے آرا راجپوت زندہ باد..... فریب آرزو، نہایت بور۔ کہانی وسیلہ کافی دلچسپ تھی۔ آخر کار بیک صاحب کی کہانی ہمیشہ کی طرح ہی تھی، مگر زبیر نظر کہانی میں ایک نئی جدت سامنے آئی۔ برف کا خنجر، کیا خوب.....! خنجر، تجسس، اور سہنس سے سب کو کہانی تھی، اب آ گیا۔ دھکار کہانی اچھی تھی۔ حسام بٹ کا وقت بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے بٹ صاحب کی سہنس میں ہوجائے اور ہاں وہ جو باریک مین تھا نا اس نے بھی بہت متاثر کیا۔ سفر بخیر اس کہانی کا عنوان امام خاص سے رکھتے تو اچھا تھا۔ پراسرار محافظ اس کہانی کو محفل تسلیم نہیں کرتی۔ (ہوئے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے جناب) سنگین خاتمہ پر تبصرہ اگلے ماہ..... اشعاری محفل کے تمام ہی اشعار قابل داد تھے۔

محمد ریاض بٹ، حسن ابدال سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، ماہ جولائی کا عید کی میٹھی میٹھی خوشبو میں مبارک شمارہ 20 جون کو سبے قرار لگا ہوں کے سامنے آیا۔ خوبصورت سرورق کا حامل شمارہ ایک مسئلہ پر چاندنی طرح چمک رہا تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمدردی ہمیشہ کی طرح سوچ کے نئے در کھول رہا ہے۔ کچھ باتیں سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں اور اثر رہتی ہیں۔ ایک ایک لفظ موٹی کی تو لٹے کے قائل ہے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں قدم رکھنا تو ناخاندانہ پراگشتی دکھ ہوا اور یہ دکھ اس بات کو یاد کر کے دو گنا ہو گیا کہ خط بھی 22 مئی کو بخار میں تھے ہوئے لیٹرکس تک پہنچا تھا۔ اس طرح لیت پچھنے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ بہر حال سہنس سے تقریباً 35 سالہ رفاقت نے جوش مارا اور یہ خط لکھتے بیٹھ گئے۔ (بڑے دل کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں) محفل میں عبدالجبار رومی اس بار کرسی صدارت لے آئے۔ ویل ڈن اور مبارکباد قبول کریں۔ خط کا برقراری بول رہا ہے۔ خوبصورت اور دلکش تبصرہ ہے۔ علی علی ہیر کا خط بھی اچھے انداز میں لکھا، اس بار آپ کا خط بہت مختصر ہے۔ شاید فرین چھوٹے کا ڈر تھا۔ خیر جو لکھا اچھا لکھا۔ محمد شاد نواز خوش آمدید محفل میں آئندہ بھی آتے رہے گا۔ محمد صفدر معاویہ آپ کے خیالات اچھے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی بولی کون سنتا ہے؟ زرین خان آفریدی اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلارہی ہیں۔ رمضان پاشا آپ کی ریگور انٹری اچھی لگتی ہے۔ اور میں احمد خان کا تبصرہ بھی جاندہا رہے۔ ویسے صفات کم کرنے والی بات ہمیں بھی اچھی نہیں لگ رہی۔ (کیا کریں مجھ سے) فضل عباس، بابر عباس آپ نے بڑا اچھا کیا کہ پرانے لوگوں کو آواز دے لی۔ ان کو اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر حاضری لگوانی چاہیے۔ باقی لوگوں کے خطوط بھی اچھے ہیں۔ اب بڑھتے ہیں اصل تبصرے کی طرف یعنی کہانیوں کی طرف۔ اس بار پھر تاریخی کہانی نا اتفاقی ڈاکٹر ساجد احمد لے کر آئے۔ ڈاکٹر صاحب کیا خوب لکھتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے قلم ہی





چلتے گھٹتے ہے۔ اخلاص خاں کی آنکھوں میں گرم سلاخیاں پھیرنے والے سین نے رلا دیا۔ مرزا احمد بیگ صاحب اس بار آخر کار بے کرا آئے۔ بیگ صاحب ہر دفعہ بڑی چالکدستی سے اپنے بے گناہ موکل کو باعزت بری کر دیا لیتے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے بڑی ذہانت سے عابد کو توراہ کر دیا لیکن ساتھ ہی اصل قاتل کی نشاندہی بھی کر دی اور ڈرامائی انداز میں آواز قتل کے متعلق بھی بتا دیا۔ انجم فاروق ساطعی صاحب ہر بار سسپنس سے بھر پور تحریر لے کر آتے ہیں۔ ان کی اس باریک بینی پر غور کیجئے ایک ایسی ہی تحریر تھی۔ بڑی مہارت سے سام نے مجرم پکڑ لیا۔ سیر کو سوا سیر بن کر ملا۔ یہ اور بات ہے کہ مجرم پھر بھی گرفت میں نہ آسکا۔ دھکار بھی ایک اچھی کہانی ہے، جام مظہر سلیم کی۔ حسان بٹ صاحب کی وقت بھی اب تیز ہو گئی ہے۔ کچھ لکھ بدلتے اور آگے بڑھتے واقعات اچھے لگ رہے ہیں۔ کہانی پر ظلم کی گرفت مضبوط ہے۔ منظر امام کی سفر بخیر ایک چونکا دینے والے انجام کی مختصر کہانی ہے۔ مانتا کے جذبات بھی سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ اکبر کو اپنے خیالات پر آخر میں شرمندہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بھی دل کی گہرائیوں سے پڑھ رہا ہوں۔ رضوانہ ساجد کا انداز تحریر قابل تحریف ہے۔“

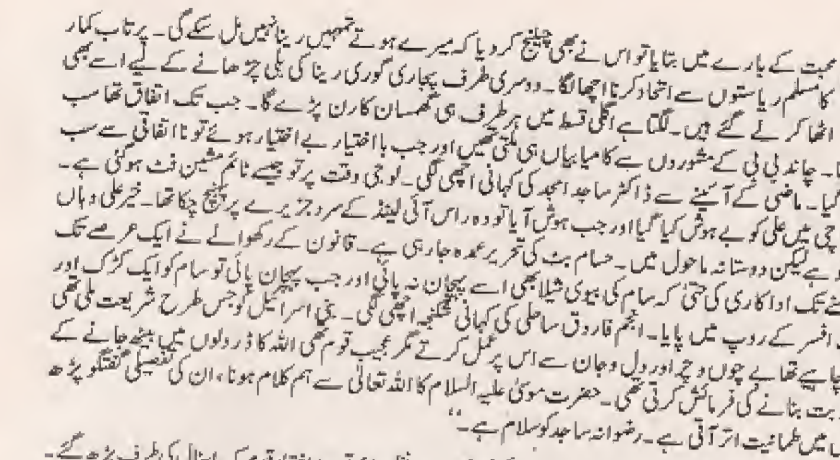
محمد شہاد نواز، عبدالکحیم، شمع خانیوال سے حاضر محفل ہیں۔ سسپنس جولائی 2018ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ عید مبارک کے لوگوں کے ساتھ ایک دلچسپ و دلکش تصویر پر خوبصورتی سے چھپتے ہوئے ہیں۔ شاید عید پر کسی مہمان خاص کی آمد ہے جس کی وجہ سے دروازے میں سراپا انتظار ہے۔ انشائیہ میں حضرت جون انسانوں میں انسانیت کے فقدان کا رونا روتے نظر آتے۔ آپ جسے بولنا سکتا ہیں وہ جب بھی بولے گا آپ کے خلاف بولے گا۔ ہمیں کسی کے ساتھ اچھا نہیں اور نیکی کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ اچھا نہیں یا نیکی لگنے نہ پڑ جائے۔ سفر بخیر، امام صاحب کی بڑی شاندار کہانی تھی۔ ہمارے اذہان اس قدر سختی ہو چکے ہیں کہ اب ہمیں اکثر مثبت چیز بھی منفی نظر آنے لگی ہیں۔ حقیقت جان کر اکبر کا ڈوب مرنے والا حال تھا۔ دھکار، معاشرے کی عکاس بڑی بہترین تحریر تھی۔ طلاق کا لفظ معاشرے میں گالی سمجھا جانے لگا ہے۔ مظہر عورت کو ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرتا چاہے اس طلاق میں سارا قصور مرد کا ہی کیوں نہ ہو۔ طلاق ایک ایسا داغ بن گیا ہے جسے کوئی بھی دھونا گوارا نہیں کرتا۔ راشد جتنا کم گو اور معصوم تھا اتنا ہی کم ظرف اور گھٹیا سوچ کا مالک نکلا۔ وسیلہ میں ماسٹر صاحب نے خان مشتاق اور ساجدہ کے مابین دلی محبت کے لیے کرا کر اور ادا کیا۔ فوسل کے آج کل ماسٹر صاحب جیسے لوگوں کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ جتنی میں آخری دم تک بدحوظ نظر آئے والا سام فاضل، بیٹن لکھا۔ انجام نے چونکا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایمان اور ذوق واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ سنگین خاتمہ میں زید کوئی نفسیاتی مرثیہ لکھ رہا ہے جو اپنی بھاری طرف اچھے والی ہر آنکھ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے۔ نونشاہ سے علیحدگی اور بیاہ سے شادی اگر ہوئی تو کیا گل کھلائے گی، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ آخر کار بیگ صاحب کی اچھی کاوش رہی۔ وقت پڑنے کے لیے طویل وقت درکار ہے اس لیے چھوڑ دی اور رنگ آسمان میں کافی واقعات پر اسرار ہیں جن کو ابھی تک سمجھ نہیں سکا تاہم پورا شمارہ اچھا تھا۔“

ایمان نے زار ارشاد، اسلام آباد سے لکھی ہیں۔ جولائی کے سسپنس کا انتظار 20 جون کو تمام شدہ ہوا اور جیسے ہی شمارے نے ہاتھوں میں کامیاب لینڈنگ کی تو فوراً اسے نائل کو دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ سمجھا آئے پر محفل کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اتنی خوشی سے ہر ماہ تیرہ کر کے میل کرتے ہیں تو انتظار و امید میں بھی باہر آ کر انا مشکل لگتا ہے۔ لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے جب آپ کی ای میل میرے سے غائب ہو۔ عبدالکبار رومی پھر سے سب سے آگے کر سی سنبھالے نظر آئے۔ بہت بہت مبارک۔ اتنا طویل و درمیان تیرہ کیسے لکھ لیتے ہیں؟ ہمارے ہاتھ تو چند الفاظ لکھ کر جواب دے جاتے ہیں۔ بابر عباس صاحب آپ جیسے جنات کو دیکھ کر بھلے مانس انسان یقیناً ڈر رہی جاتے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بھی کسی چیز میں زادی سے کم نہیں اس لیے اپنی خوشی بھی سے باہر نکل آئیں۔ چٹیلی بیر اور زین خان کے تیرے بھی خوب رہے۔ یہی دونو صنف باز کہ ہیں جنہیں دیکھ کر ہر ماہ بھی اس اوکھلی میں سر دے دیتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے وقت کا مطالعہ کیا۔ کساہو پڑو پر قسط رہی۔ سنگین کریم اس ایپشن و تھریل کے انتظار میں بہتوں میں سے کھوت ہے اسی لیے پھل بیٹھا ہی ملا۔ جلی کو نہیں۔ صرف ہم معصوم قارئین کو۔ علی راہ آئی لینڈ تو آپ بھی کبھی لیکن ہڈیوں میں برف ہمارے جم رہی ہے۔ اگر آپ اپنی ہم جلیبیت سے باز نہ آئے تو فروست بابت کا شکار ہو کر دفن ہو جائیں گے۔ اپنا کے منظر سے بچنے پر سکھ کا سانس لیا۔ قسط کا اختتام بھی سسپنس سے بھر پور رہا۔ رنگ آسمان ستارے کی کہانی ہے۔ تال میل جوڑنے

کی کوشش اس قسط میں نمایاں رہی۔ بھجورام تو بچھو کی طرح ذہن مار گیا ہے۔ لیکن یہ سارے بیماریا فری۔ اور جو بانی سارے ایک ہی کھیت کی موسیٰ لگ رہے ہیں بشمول سراج خان غدار۔! دیکھا جائے تو بہت ان ایکٹیکلر رہا سب۔ مزہ آسکا۔ البتہ اگر یہ وہاں کوئی غیر مرئی طاقت تو رکھتے نہیں جو تین بھری جہاز اکیلے تباہ کر دیتیں۔ آخری باب از روایا آغاز۔ کیا کہوں؟ ہمیشہ ہی آپ کچھ انسانی نفسیات کے پہلو کو بھٹ کرتی ہیں، دیکھنے میں معمولی سی بات شاید زندگی بھر کے لیے بچھتا دیا ہی بچھتا دیا جھوڑ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے بچوں کو کھلاؤ سونے کا ٹوالہ۔ دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ لیکن اس قول کو سب پر نہیں نہیں بچھتا پاتے۔ ماں باپ اپنی اولاد کے سب سے بڑے نفسیات دان ہوتے ہیں اگر وہ اپنی اولاد کی بے گناہی کو جان نہ پائیں تو دنیا تو کنکارے پر کھڑی ہی شخصیت کے لیے ہوتی ہے۔ اخلاق کے پیرس کو میں قطعی طور پر قصور وار نہیں کہیں جاسے۔ اچھے لوگ ہمیشہ ہی اپنے کسی عمل یا قول سے ذمے دار بھی وہی رہے۔ ویل ڈن۔! وسیلہ مختصر لیکن جامع۔ اچھے لوگ ہمیشہ ہی اپنے کسی عمل یا قول سے دوسروں کی زندگی ہمیشہ کے لیے سدا ہمار جاتے ہیں اور احسان مندر کر جاتے ہیں۔ عموماً مجھے مرزا بیگ اور صفدر حیات کی کہانیاں آؤٹ آف ڈینڈ لگتی ہیں لیکن آخر کار انہوں نے میرے تمام اندازے سے غلط ثابت کر دیے۔ دن آف ایڈرینگ اسٹوری۔! آواز قتل حیران کن حد تک منفرد رہا۔ جتنی بھی نہایت دلچسپ کہانی رہی۔ مجھے امید تھی جارج واٹس ضرور آئے گا لیکن اس قدر جلدی آنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ لیکن اس کہانی سے ثابت ہوا کہ غیر ملکی پولیس بھی کوئی فرشتہ صفت ہرگز نہیں ہوتی۔ جتنا ہم ان کا ڈھنڈو اپناتے رہتے ہیں۔ جام مظہر سلیم کی دھکار میں معذرت کے ساتھ قصور وار تحلیل بھی برابر کی گئی اور رہی بات راشد کے اپنے احسان جاننے کی۔ تو لا شعوری طور پر انسان ایک ایسی چیز پر آ کر اپنی ذات پر غور و فکر کرتا ہے تو گزرے ایام کے سچ و شیریں لحاظ اسے بچھ کے لگاتے ہیں کہ انسان ٹھیک فیصلہ کیوں نہیں کر پایا۔ تو پھر ایسے الفاظ منہ سے نکل ہی جاتے ہیں۔ اپنی ویز۔ بہت اچھی کوشش رہی آپ کی۔ نشور ہادی کی سنگین خاتمہ مگزی کے جال کی طرح اچھے ہوئے انسان کی کھٹا لگی۔ زید کے اس منٹلی اسٹریس کی وجوہات کیا ہیں، یہ آہستہ آہستہ سامنے آئے گا۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔“

عبدالکبار رومی انصاری کی آمد پورے والا سے ”عید مبارک، پر لطف لحاظ میں خوش کن خیالوں میں ہستی مسکرائی خوبصورت لڑکی بہت ہی پیاری لگی۔ یوں سراپا نائل بے حد اچھا لگا۔ انسانیت زمانوں میں زندہ ہے اور رہے گی۔ ہمدرد دیکھیے اور ہم جہت خود بھی انسانیت کی قدر کریں۔ خوشی کے لحاظ میں کچھ دیر غموں کو بھلانا بھی اچھا ہے۔ وطن کے دیگر کوں حالات میں دل تو ترستا ہے پر سب کا مل کے محفل سنا بھی اچھا ہے۔ اپنا نام اور صدائے دل کچھ کر دل مطمئن ہو گیا اور ہستی مسکرائی چٹیلی بیر کا تیرہ بھی متاثر کن رہا۔ محمد رفاقت دل مطمئن نہیں اور تیرہ مختصر؟ خیر محمد شاہ نواز کی بھی خوب رہی جلی جسات محمد صفدر معاویہ کا تیرہ بھی عمدہ رہا۔ زین آفریدی گرل کا اترا نا بھی تو ادا ہے، شاید یہی ادا سب سے جدا ہے۔ واڈ رمضان پاشا اور نیس احمد خان تو عمدہ ہیں پر بابر عباس کو تو دیکھیں بھی تو لڑکی بھی ماشا اللہ زید سارگر، طلیق ربانی انجم بھی خوب محفل دینت بنے ہیں۔ محمد ہادیوں تولی اور طارق خان بھی عمدہ تیرے میں سب کے دوست بنے ہیں۔ محمد خواجہ کو جی بابر کی طرح زبردست رہی تیرہ نگاری سخت گری میں گھری، حامید یوسف کی بھی عمدہ رہی مہمانداری اور رانا سجاد، بشری افضل، طاہرہ گلزار کو عمدہ ہوا آئے، کب لگا رہے ہیں اپنی باری؟ جس سے محبت ہو اسے واقعی منتظر نہیں کیا جاسکتا، پرنونشاہ اور زید کی محبت بھری زندگی میں نہ رہا عمل کیا زندگی میں سنے سو ڈھکی آئیں گے۔ اب نشور ہادی کی کہانی کا سنگین خاتمہ کیونکر ہوگا یہ تو اگلی قسط میں پتا چلے گا۔ عمدہ کہانی۔ پولیس سے زیادہ تجربہ رکھنے والے باریک بین و ظنیں کو آزمانے لگے کہ زیادہ سے زیادہ اس سے نکل کے ہوں اور پھر جھوٹ موٹ کے قاتل سے بھی ایک لڑکی کا قتل سرزد ہو گیا۔ زید حسین کی کہانی بابر ایک بین اچھی رہی۔ منظر امام کی دلچسپ کہانی میں اکبر کو ایک مالدار و خوبصورت بھوی کے بھائے پیاری سی ماں مل گئی۔ سفر کچھ صحن تو لگا لیکن بخیر گزر گیا۔ مختصر کہانی اچھی لگی۔ اچھے برے حالات انسان کی زندگی میں آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح آزمائش سے گزرتے بیگ صاحب کے موکل عابد تو رہا ہو گئے اور جرم کے نتیجے میں کستاہوار و ف احمد پانی کے بنے آئے سے مدد بچ کوئل کرنے کی وجہ سے دھرا گیا۔ آخر کار میں بیگ صاحب کی حیران کن تیاری اور جرح نے ہمیں کا رخ موڑ دیا۔ عمدہ کہانی۔ زوایا آغاز کی کہانی آخری باب اخلاق احمد کے گرد گھومتی ٹھیک رہی۔ بیچارے کو القاتل نہ کرنے کی صورت میں بھیا تک صورت حال سے گزرتا پڑا۔ رنگ آسمان میں شوکت نے گارڈیا کو اپنی



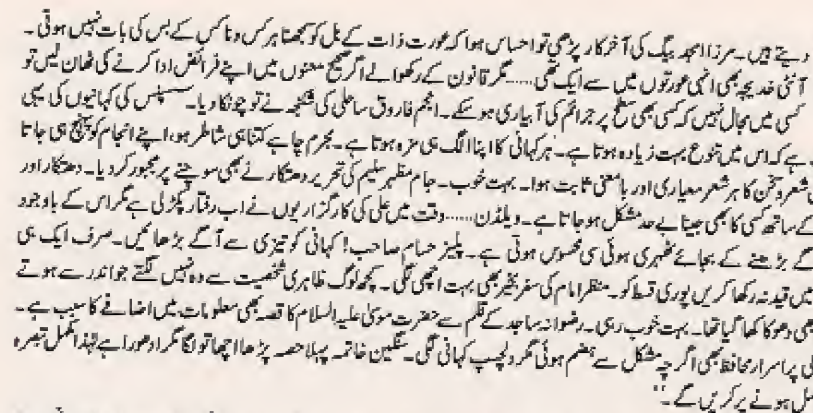


۱۲۰ عدد نان معین کھانگو حیدر آباد سے 'سب سے پہلے تو ہماری طرف سے ادارہ وقار میں توجہ مبارک۔ تاہم ہمیں شکوہ ہے کہ ہم نے 3 ماہ میں نو تارے اور ناظم پر خط پوسٹ کیے مگر آپ نے ہمارے خط کو محفل میں شامل نہ کیا۔ ہمیں دکھ بھی ہوا مگر یہ سوچ کر کہ کٹا جاتا ہے کوٹھالی نہ لے ہوں، ممبر گئے۔ اس وفد پر کچھ کھش کر رہے ہیں۔ سوچتے ہیں محفل میں تبدیل پانی ہے کہ نہیں۔ خیر جو ان کا ایشاء نہ لڑا کہ واقعی دل سے داؤ لگی۔ سستی دور مینی ہے اس میں۔ ہر نقطہ موتی کی طرح، حقیقت کا عکاس ہے۔ اس کے بعد

۱۴۰۰ ذریعہ سلطان کی اردو بازار کراچی سے شاندار حاضری..... ”کاٹل گرل دیکھ کر جانے کیوں زیدہ آپا کے ٹوکے یاد آ گئے جو آخر وہ تک گورا کرنے کے لیے بچا کرتی تھیں۔ چلیں کوئی بات نہیں، اس بار سانولی سلونی عیسیٰ مگر کچروں کا گھری اچھا سا کر لیجئے جو سانولی رنجیت پر سوت کر ہو۔ بہر حال دل کچھا بھجا کر ذرا آگے بڑھے اور جون الیٹیا کی پر مفرغ خر پر پڑھ کر دل کو کچھ شافی کی اور ساتھ ہی تھوڑا سا مال بھی کچھ کم کرائی باتوں پر تو جینیں دے پاتے۔ بہت ہی خوبصورت بات کی جون صاحب نے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ رہتی ہے۔ آگے بڑھے تو سجادہ بھیجو کی اتفاق سے اتفاق پڑی۔ اب سجادہ صاحب کا انداز بیان بھی خاصا بدل گیا ہے۔ اس بار کبھی اس میں مرکزیت کا فقدان تھا۔ مختلف واقعات تھے۔ بہر حال معلومات کے حساب سے تو اچھی رہی مگر زیادہ مزہ نہیں آیا۔ تحریر ریاض کی چور چائے شور، سفر کی معاشرے کی چال بازیوں کو ناپاں کر ڈاٹک۔ لکھ، سمجھو، سوچو۔ ہوسکا۔ ابوالفضل جہاں کی کبھی خیراب آرزو نے تھوڑی دیر سوچنے پر بخیر کر دیا۔

سیدنیس ڈائجسٹ 13





کراچی سے محمد آذین رضوان کی دلچسپ گفتگو 'جولائی 2018ء کا شمار بہت جاندار لگے۔ سب سے پہلے عین خاتمہ کو

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔  
 نادیہ خان، پشاور۔ نمرائیم، کراچی۔ شمل، حیدرآباد۔ مرکان علی، بکھر۔ محمد رئیس، کراچی۔ عدنان سلیم، سرگودھا۔ نور الدین،  
 پور پور خاص۔ طارق خان، کوئٹہ۔ اویس کمال، حیدرآباد۔ اسماعیل خان، بلوچ شاہ۔ اشعر علی، ملتان۔ عمران احمد چغتو،



# دھوکے باز

علی اختر

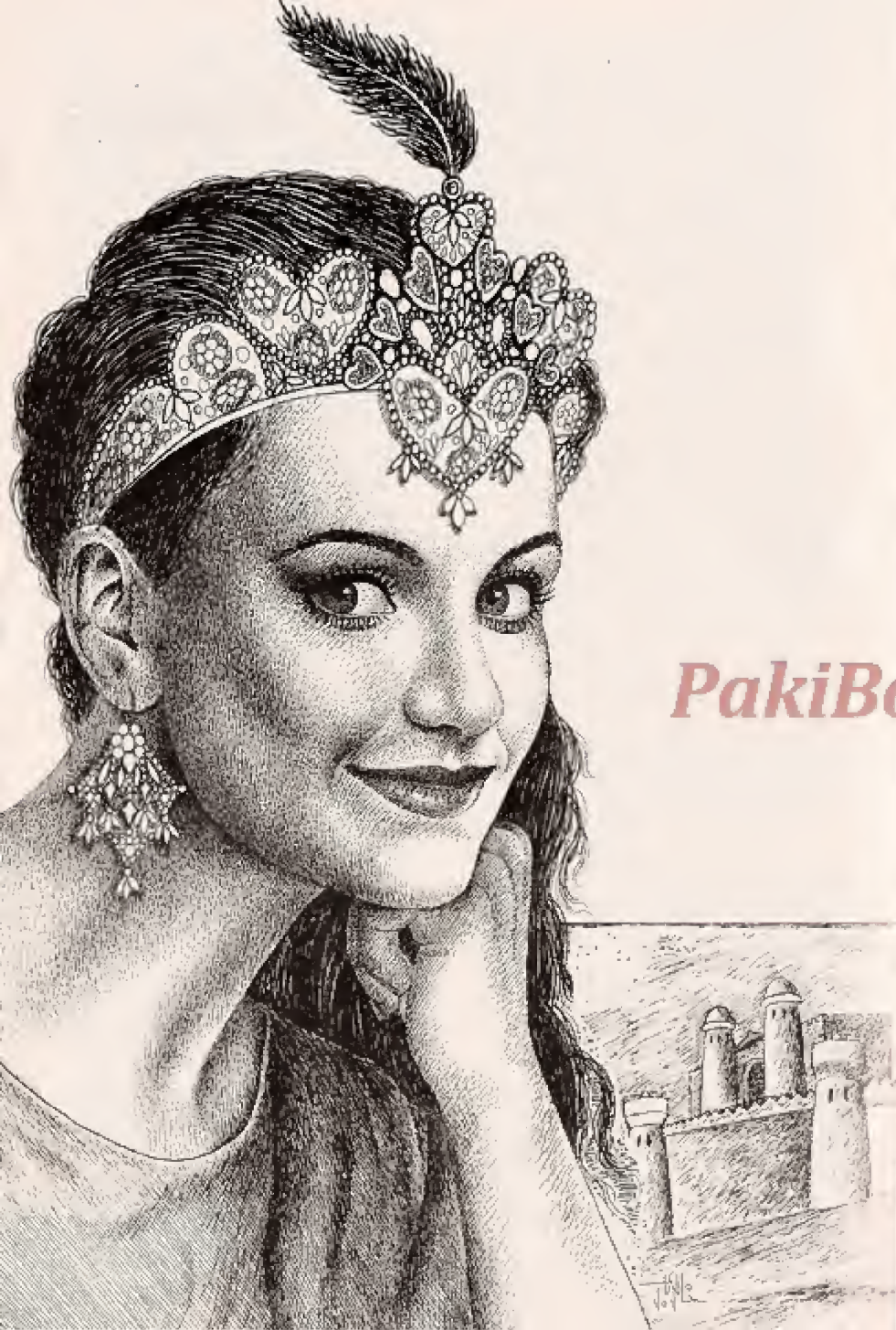
دور کوئی بھی ہو... اختیارات میں رہتا  
کشی اور محبت میں مکروفریب اپنی مثال آپ  
بنتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر واقعات بھی انتہائی گتے  
دنوں کی داستان رقم کر رہے ہیں جب انسان تہذیب  
و تمدن کے لحاظ سے بہت پیچھے تھا، سیکھنے کے مراحل  
سے گزرتے ہوئے عقل و شعور کی منازل طے کرتے ہوئے نئے  
معاشرے کی تشکیل و تزئین میں مصروفِ عمل تھا۔ ملک  
فارس جہاں جنگ و جدل سے برسرِ پیکار لوگ عجیب  
و غریب مذاہب اور دیگر معاشرتی رسوم میں جکڑے ہوئے  
انتہائی سخت قوانین کے زیرِ عتاب ایک مشکل زندگی گزارنے کے  
عادی تھے... وہاں عشق و محبت کی ایسی دلدوز داستانیں بھی  
ماضی کے ان صفحات پر لکھ دی گئیں جو آنے والی نسلوں کے لیے نہ  
صرف دلچسپی و حیرت کا باعث بنیں بلکہ ہمیشہ سبق آموز بھی رہیں  
گی۔ انہی میں سے ایک دھوکے باز عاشق کی محبت کا عبرت افرانجام۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

یونانی افواج نے 401 قبل مسیح ملک فارس کی  
ریاستوں کی موجود اور غار شاہ کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے ان پر  
حملہ کر دیا۔ اس وقت یونان بھی ملک فارس کی طرح چھوٹی  
چھوٹی ریاستوں میں بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کئی بار ایسی  
جنگیں یونانی ریاستوں میں برپا ہوتی تھیں تو کوئی ایک یا دو

تین ریاستیں مل کر اہل فارس کی فوجوں کی امداد کو پہنچ جاتی  
تھیں اور سب مل کر یونانی حملہ آوروں کو شکست دے دیتی  
تھیں۔ اس دور میں ملک فارس بے پناہ فوجی طاقت کا حامل  
تھا۔ اور اگر وہی ساری ریاستیں اس کی فوجی قوت سے خوفزدہ  
رہتی تھیں۔ اس بار بھی ملک فارس کی فوجوں میں اس کا خاص

PakiBooks.Site





## مکافات عمل

جو رشتے تمہیں تکلیف دیں ان سے دوری اختیار کرو۔ وہ خود لوٹ آئیں گے مگر اس وقت جب تمہارے دل سے اتر چکے ہوں گے کیونکہ وہ تمہاری قدر سے نہیں بلکہ پچھتاوے سے لوٹتے ہیں۔ جس کی دی ہوئی تکلیف سے تم آج دور رہو، وہ وہ کل تمہارے پچھتاوے میں روئے گا۔

(شیخ عبدالقادر جیلانی)

مرسلہ۔ ریاض بہت، حسن ابدال

جشید کے زمانے سے پہلے ملک فارس کے میدان جنگ میں لالچی اور پتھروں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے تلوار اور تیر ایجاد کیے۔ کھیتی باڑی، سوت کاٹنے کا فن ایجاد کیا جس سے کپڑے بننے کا رواج پیدا ہوا۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ جشید ہی وہ بادشاہ تھا جس نے دنیا میں آگ کی تعلیم و تشریح شروع کی اور اپنی رعایا کو بھی اس کی تعلیم و تشریح کی جانب رغبت دلائی۔ اس کے مطابق آگ روشنی میں سورج اور ستاروں سے مشابہ ہے اور چونکہ نور کو ظلمت پر بہر حال ترجیح ہے اس لیے نور قاطع تعلیم ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے ناموں کی مناسبت سے قربت الہی کے حصول کے لیے نوری اشیا کی پرستش شروع کر دی۔ مذہب صائین کو ماننے والوں کو حیرانی اور اس سے انحراف کرنے والوں کو تباہی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شہر بھی تھا جو ملک فارس میں موجود تھا اور اس میں لالچی یا پھر جین کے کچھ

کے نئے میں بد حال ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتا اور لالچہ بازان کی فطرت میں شامل تھا۔ یہ کیورٹ ہی تھا جس نے لوگوں کو سکون اور خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے کی ہدایت کی چنانچہ انہوں نے مکمل طور پر کیورٹ کی ہدایات پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ کیورٹ بھی وقتاً فوقتاً اپنی حکیمانہ تقاریر کے ذریعے اہل فارس کے احوال کو درست کرتا رہا۔ اس نے نہ صرف گاؤں اور شہروں میں رہنے کے طریقے عوام کو سکھائے بلکہ اس کے زمانے میں شہر سازی کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ اس نے داند اور درخت شہروں کی بنیاد رکھی۔ کیورٹ کا لقب جیش داد تھا۔ اسی وجہ سے جو بادشاہ اس خاندان میں گزرے وہ انہیں جیش داد یاں کہتے ہیں۔ کیورٹ کی عمر کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے سو سال عمر پائی۔ اس کی مدت حکومت چالیس سال بتائی جاتی ہے۔ کیورٹ جب مرا تو اس وقت ملک فارس کی سرحدیں ہندوستان تک پہنچی ہوئی تھیں۔

کیورٹ کے بعد ظہور ملک فارس کے تخت پر بیٹھا۔ وہ سایور کا باشندہ تھا۔ اس کے زمانے میں ایک شخص ظاہر ہوا جس نے صائبہ مذہب کی بنیاد رکھی جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔ اس مذہب کے بانی کا یہ کہنا تھا کہ مکمل بزرگی، بلندی اور عزت و وقار کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی مسلسل اصلاح اگر کچھ ہے تو بلندی حیات میں ہے۔ ان ستاروں کے اثرات اہل دنیا پر ہوتے ہیں۔ سمندروں کی پیداوار اور ان کی طغیانی بھی انہی کے زیر اثر ہے۔ کچھ ضعیف الاعتقاد لوگ اس کے پیروکار ہو گئے۔

جب ظہور کو قتل کر دیا گیا تو اس کا بھائی جشید تخت

فارس پر بیٹھا یہ اصلاً فارسی تھا۔ اس کے زمانے میں مرزہ فارس پر کثرت سے طوفان آئے۔ اس نے شہر اسطخر کی رکھی اور اپنے زمانے میں شہر شیراز سے 35 میل کے پر ایک سرے تعمیر کی جس کا نام تخت جشید رکھا۔ 17 زمانے میں علم موسیقی کی بنیاد رکھی اور شراب بھی زمانے میں سب سے پہلے تیار ہوئی۔ اس نے پہلے وقت کو سال شمسی سے شمار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ جشید ہی تھا جس نے اپنے ملک فارس میں طوفانوں سے نجات ملنے پر سب سے پہلے رواج دیا جو آج تک چلا آ رہا ہے۔ اس نے دیا اور بے شمار عمارتیں بنوائیں۔ اس نے کئی شہر بھی آباد کیے۔ وہ اپنے آپ بزرگ بلوا نا پسند کرتا تھا۔

میں آیا تو ان میں باہمی اختلافات، فساد اور لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ جنہیں منانے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے کیورٹ سے رجوع کیا اور اسے قوم کا سردار یعنی بادشاہ تسلیم کر کے ..... اسے تاج پہنا دیا۔ لہذا فارس میں وہی پہلا شخص تھا جس نے تاج پہنا۔ اس نے قوم کے لباس میں مناسب ترامیم کیں۔ ملک کا نظام درست کیا اور سماجی و معاشی معاملات کو ایک نچ پر ڈالا اور دوسرے معاملات کو ایک عدل و انصاف فراہم کیا۔ جب اس طرح قوم کی اصلاح کا کام اس کے حسب مشاغل چلتے لگے تو ایک روز اس کے دربار میں ایک خطیب نے اٹھ کر کہا۔

”بادشاہ سلامت! ہم خدا کی نعمتوں کا جتنا بھی شکر ادا کریں، وہ کم ہے۔ اس نے ہمیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہماری قوم ایک عرصے تک دیرانوں میں شکستیں رہی۔ ہم جانوروں کے غول کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے ہمیں رہنے کو جگہ عطا کی۔ ہمیں اپنی بھوک مٹانے کو غلہ یا گراب بھی میرے خیال میں ایک چیز کی کی ہے۔ اگر وہ پوری ہو جائے تو بلاشبہ ہم ایک نہ مٹنے والی قوم بن سکتے ہیں۔“

کیورٹ اس کی طرف فوراً متوجہ ہوا اور پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

”قوم کی سماجی و معاشی اصلاح کسی حد تک ہو چکی ہے اور باقی آئندہ ہوتی رہے گی لیکن ہمارے ہاں اب بھی ایک ایسی شے کی کمی ہے۔“ یہ کہہ کر خطیب خاموش ہو گیا تو کیورٹ سے پوچھنے سے بولا۔

”میرے خرم بات مکمل کر کرو۔ میں نے اپنی دانست میں قوم کو راہ راست اور انصاف و عدل پر لانے کے تمام حربے استعمال کر لیے اور مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ میری قوم نے میری باتوں کو نہ پرانی ہیئتوں اور میرے کہنے کو ہمیشہ پورا کیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟“ کیورٹ نے پوچھا۔

”جس چیز کی کمی رہ گئی ہے، وہ ایک باقاعدہ فکر ہے۔ کسی ملک کی حفاظت اور اس کے دفاع کے لیے لشکر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“ اتنا کہہ کر خطیب بیٹھ گیا۔ کیورٹ نے خطیب کی رائے سن کر اہل دربار سے خطیب کی پیش کردہ تجویز سے متعلق پوچھا تو اہل دربار نے اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ کیورٹ نے پہلی بار فارس میں لشکر کی تنظیم کی ابتدا کی۔ اہل فارس شروع سے ہی اصلاً خانہ بدوش تھے اور بیش سے بے پروا رہے تھے۔ اس لیے جب وہ بھی درباری کھانے کے لیے بیٹھے تو بڑا شور مچا کرتے۔ اکثر شراب

مگھڑ سواروں کا دست شامل تھا جسے پارہیں شوٹ کیا جاتا تھا۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی کہ اچانک ملک فارس کے اس خاص فوجی دستے کے پاؤں اکٹھے گئے یا یہ ان کی جنگی حکمت عملی کی کوئی نئی چال تھی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس دستے کے سارے سواروں نے ایک دم سر پٹ بھاگتے گھوڑوں کی پیچھے پر پیچھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ایک طرف کر لیں اور دونوں پاؤں ایک ہی رکاب پر رکھتے ہوئے اپنے پیچھے دو بارہ یونانی فوجوں کی طرف موڑ لیے۔ انہوں نے گھوڑوں کی بائیں چھوڑ دیں۔ اپنے پیروں سے گھوڑوں کو اڑھ لگاتے ہوئے وہ پیچھے کی طرف ایک ہاتھ میں کمان لے کر دوسرے ہاتھ سے اپنی کمانوں سے تیروں کی بوچھاڑ یونانی فوجوں پر کرنے لگے۔ یونانی افواج کے لیے لڑائی کا یہ منفرد اور انوکھا طریقہ تھا جس نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ ملک فارس کے اسی دستے کی شہرت اور ان کے لڑنے کا انداز اس وقت بہت مشہور تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ اس جنگ میں ملک فارس کا مشہور سپہ سالار سوسیل یونیکر اور اس کی بیوی پڑی براس بھی دوسری خواتین کے ساتھ مردوں کے برابر جنگ میں شریک تھیں اور وہ بھی مردوں کی طرح گھوڑوں پر بیٹھی تیروں کی بارش مخالف سپاہ پر برسا رہی تھیں۔ ملک فارس کے یہ وہی خانہ بدوش تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ 1500 قبل مسیح میں جو بھوک اور سردی سے لگے آکر وسط ایشیا کے مرغزاروں سے آوارہ گردی کرتے ہوئے ملک فارس میں آئے تھے اور ان کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں جا گزیں ہو چکا تھا۔ یہ لوگ خود کو آریا کہلاتے تھے۔ یہ مختلف گروہوں کی شکل میں ملک فارس کے ادھر ادھر کے علاقوں میں بکھر گئے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے سرداروں کے ناموں پر الگ الگ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنائی تھیں۔ ان میں میدین پارہی، ناختری، مقدنی، خوارزمی، مراہی اور پارسی شامل تھے۔ ان گروہوں کے سردار ہی ان کے بادشاہ یا حکمران تھے۔ اس وقت یہاں زرتشت اور صائبہ مذہب پھیلا ہوا تھا جو مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے۔ آگ، پانی، ہوا، طوفان، چاند سورج اور ستارے ان کے خالق اور پالن ہار تھے۔

ملک فارس اس وقت بہت بلند پایہ تہذیب و تمدن، مائتاز معاشرت اور گراں قدر تاریخ کا ملک جانا جاتا تھا۔ ان کا پہلا بادشاہ کیورٹ تھا جو کہ بلحاظ عمر اپنے معاصرین میں سب سے بڑا تھا۔ اس وقت تک اہل فارس کا کوئی باقاعدہ فہرستہ نہ تھا۔ فہرستہ طور پر جب مختلف ریاستوں کا وجود مکمل



اور محرم میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اہل فارس کو بیت پرستی اور ستاروں کے ساتھ پانی، مٹی، ہوا، روشنی، آگ کی عبادت کرتے جب مذہبی گزشتوں کو ہندوستان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے بت پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کی تلقین کی۔ اسے ہندی اور چینی مہاتما بدھ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ سرزمین ہند سے پہلے سندھ کی طرف گیا پھر محفوظ جگہوں سے ہوتے ہوئے جب سرزمین فارس میں پہنچا تو اس وقت وہاں کا حکمران طہورت تھا مگر یہاں بھی تاریخ دانوں میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت فارس پر جشیہ کی حکومت تھی۔

☆☆☆

شہاک ملک فارس کے بادشاہ جشیہ کا پوتا تھا جسے بیوراسب بھی کہا جاتا تھا مگر اہل عرب اسے شہاک کہتے ہیں۔ اسی نے جشیہ کو فتح کیا تھا۔ جشیہ کے دور اقتدار ہی میں بڑاوتوں اور سرکشی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ شہاک وہ بادشاہ تھا جسے کیورٹ کی تربیت یافتہ قوم ملی اور جس کو جشیہ کی فہم و فراست نے ایک عظیم قوم بنا دالا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی والدہ کوئی عربی عورت تھی۔ شہاک مذہب صائب (ستارہ پرستوں) کے حامیوں میں سے تھا اور مظاہر فطرت کا پیر و کار تھا۔

جب رعایا میں سے کوئی بادشاہ وقت کے پاس..... جاتا تو اپنے منہ کو درواں سے ضرور ڈھانپ کر جاتا تاکہ منہ سے نکلنے والی ہوا کی آلودگی بادشاہ وقت کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے نزدیک جب آدمی بیمار ہو جاتا تو وہ کسی عدد کے علاوہ کسی شفقت اور خصوصیت کو جو کائنات میں نہ رہتا تھا بلکہ وہ قابلِ نفرت ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک بیماری اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ اس شخص پر بری قوت نے قابو پایا ہے۔ اس لیے قریبی رشتے دار بھی اسے نظر انداز کر دیتے اور اسے زندگی کی ضروریات سے بھی محروم کر دیا جاتا۔

کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں عالم وقت کی نیت اور اس کے کام میں محنت و کاوش کرتے ہوئے وقت لگتا تھا۔ یہی اہل فارس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اہل فارس کو ترقی کی ان منازل تک پہنچانے میں کیورٹ اور اس کے بعد جشیہ نے اپنی اپنی دانست موجب جتنا حصہ ڈالا تھا، اس کے سارے مؤرخ محرف تھے۔ کیورٹ نے اپنی جگہ ہی ہوتی اور آوارہ قوم کو سوار کرنے اور سدھارنے میں جہد محنت کی۔ اس نے آداب طعام کے بارے میں نہ صرف عملی اقدامات اٹھائے بلکہ نفس و جسم کے معاملے میں اپنی حکیمانہ تقاریر

سے انہیں درست سمت بھی دی۔ اس کے بعد طہورت کے عہد تک آتے آتے فارس کی سرحدیں ہندوستان تک پھیل چکی تھیں۔ اب نہ صرف ملک فارس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر بلکہ یونان کی کبھری ہوئی کمزور ریاستوں کے بادشاہ بھی فارس کی حکومت اور ان کے شہنشاہوں سے خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ طہورت کا دور حکومت جب اپنے اختتام کو پہنچا تو اس کا بھائی جشیہ تخت فارس پر بیٹھا۔ اس نے ملک فارس میں مختلف صنعتوں کو فروغ دیا۔ ملک فارس کے گھر گھر میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے مختلف عمارتیں بنوائیں اور کثرت سے شہر بسائے۔ اس نے اپنے لیے شہر اصغر سے قریب ایک نیا شہر بنایا جس میں نہایت خوب صورت اور عالی شان عمارتیں جو اہرات سے ستون بنوائے گئے جن کے درمیان ایک بہت بڑا تخت اپنے لیے بنوایا۔ اس تخت کی ایک خولی تھی کہ ایک تو یہ اپنی اونچائی اور چوڑائی کے لحاظ سے بہت اونچا اور بڑا تھا۔ دوسرے اس کی پشت پر اس نے فرشتے کے بڑے بڑے پر بنوائے۔ چونکہ یہ لوگ فرشتوں کو بھی پوجتے تھے اس لیے اس شہر میں ہر آنے والا سب سے پہلے اس تخت کو سلام کرنے ضرور آتا۔ اس طرح وہ کہتا تھا کہ جب تک وہ یہاں حاضری نہیں دے گا، اس وقت تک وہ گناہوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کو تخت جشیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کے نشانات ابھی تک باقی ہیں۔

جشیہ کی شاندار سلطنت کے خاتمے پر اس کا پوتا شہاک تخت پر بیٹھا۔ اس کا درست نام بیوراسب تھا۔ اس کی والدہ کا نام آگ تھا مگر اہل عرب اسے شہاک کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ حقیقت یمن کا رہنے والا تھا لیکن اس نے یمن کو فارس کے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ یہ انتہائی عالم اور سفاک انسان تھا۔ ملک فارس کی تباہی و بربادی جس قدر اس کے دور میں ہوئی، نہ تو اس سے پہلے بھی ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے بعد کسی نے اہل فارس پر اس قدر مظالم ڈھائے۔ اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ جشیہ کو بھی اسی نے قتل کر دیا۔ یہی وہ بادشاہ تھا جس نے ملک فارس میں سب سے پہلے نہ صرف مجرموں بلکہ عام لوگوں کو ان کے جرائم پر پھانسی دینا شروع کی اور لوگوں کو قید کر کے کوڑے مارنا شروع کیے۔ لوگ اس سے ہر وقت خوفزدہ اور ہراساں رہتے تھے۔ بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جس کے بارے میں چاہتا، مقدمہ چلائے بغیر یا کوئی جرم ثابت کیے بغیر موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا بلکہ ایسی سزا سنانے کا اختیار

دھوکے باز

بادشاہ کی ماں اور اس کی بڑی ملکہ کو بھی حاصل تھا۔ کسی عام شہری بلکہ کسی امیر و رئیس کو بھی یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے اس خالسانہ فعل پر مصداقے احتجاج ہی بلند کر سکے بلکہ عوام کو ہر حال میں بادشاہ کے آگے سر جھکانا ہے اور اس کے منہ سے نکلنے والا ہر جملہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ شہاک نے اپنی حکمرانی کی دھماک بھانے کے لیے سنے سے نیا حریہ استعمال کیا تاکہ اس کی دہشت عوام پر قائم رہ سکے۔ بادشاہ کی قوت کا دوا دہ اور اس کی جنگی افواج اور طاقت پر ہوتا تھا۔ اہل فارس کے لیے بادشاہ کا حکم تھا کہ ملک کا ہر شہری جس کی عمر پندرہ اور پچاس سال کے درمیان ہوتی، اس پر لازماً ہتھیار کر دے ورنہ فوجی خدمات ادا کرے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک باپ نے اپنے چار بیٹے میدان جنگ میں بھیج دیے۔ ان میں سے ایک بھائی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے پانچویں بھائی کو اجازت دی جائے کہ وہ بوڑھے والدین کی خدمت کرنے اور کھیتی باڑی کرنے کے لیے ان کے پاس رہ جائے۔ بادشاہ نے غم دیا کہ اس کے پانچویں بھائی کے جسم کو دو حصوں میں کاٹ دیا جائے اور جس طرف سے فوجوں نے گزرا ہے، اس راستے پر اس کے جسم کا اوپر والا حصہ اور دوسری طرف نیچے والا حصہ رکھ دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ اس کی اس ظالمانہ اور سنگدلانہ حرکت پر کسی کو پانچویں کی جرأت نہ ہوئی اور فوجی بیڑا اپنی زمینیں بچاتا ہوا اس دھوکھو کریں مارتا ہوا گزرتا رہا اور عام لوگ بادشاہ سلامت زندہ باد کے فلک شکاف نعرے لگاتے رہے۔

جشیہ کے بعد آنے والے ملک فارس کے تمام حکمرانوں نے رعایا کی طرف سے توجہ بٹانے خود کو عیاشیوں میں ڈوب دیا تھا۔ ان کے احوال آفرات ہو گئے تھے۔ فوجات تو کجا اب اپنی ہی سلطنت میں انتشار پسندی کے علاوہ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ دربار اور درباری امور پر فحش کے سارے انتظامات موجود تھے۔ شاہی تخت ہال کے سرے پر پروے کے چیمپے رکھا جاتا تھا۔ سلطنت کے اعلیٰ عہدیدار، وزراء اور امراء پروے سے ایک مقررہ فاصلے پر بیٹھتے تھے۔ درباریوں کی جماعت اور دوسرے ممتاز لوگوں کے درمیان ایک لوہے کا جنگلا حائل رہتا تھا۔ اچانک پردہ اٹھتا تھا اور شہنشاہ تخت پر بیٹھا رشم و کخواب کے نیچے کا سہارا لگائے سونے اور ریشمی تاروں سے بنا ہوا لباس پہنے جلوہ گر ہوتا تھا۔ تاج سونے اور چاندی کا بنا ہوا اور زرد، یا قوت اور موتیوں سے مزین

تھا۔ بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے لٹکا رہتا تھا۔ یہ زنجیریں اہل قدر بار یک جہیں کہ جب تک کوئی شخص تخت کے قریب آ کر نہ دیکھتا اسے نظر نہ آتی تھیں۔ اگر کوئی دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا تھا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے لیکن حقیقت میں تاج اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس کا وزن تقریباً اڑھائی من کے قریب تھا۔

جو شخص بھی فارس کے ان بادشاہوں کے حضور حاضر ہوتا تھا، اس کو یہاں کے قدیم دستور کے مطابق سامنے آ کر سجدہ کرنا پڑتا تھا۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان فرق کو اور بھی کئی طریقوں سے ظاہر کیا جاتا تھا مثلاً جس روز بادشاہ اپنے جسم سے فاسد خون یا بیماری کی حالت میں جو کھیں لگوانا یا کوئی دوا کھانا تو لوگوں میں منادی کر دوا دی جاتی تاکہ تمام درباری اور اہل تخت میں سے کوئی اور ایسا کام نہ کرے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی اور اس دن دین و علاج کرے گا تو پھر بادشاہ پر اس دوا کا اثر ٹھٹھ جائے گا۔

ان کی مخصوص مجالس میں بھی یہ احتیاط برتی جاتی اور پردہ داری رہی جاتی۔ جب بادشاہ عیاشیوں میں یا شراب نوشی میں مشغول ہوتا اس وقت بھی اس کے اور بادشاہ کے ساتھیوں اور درباریوں کے درمیان پردہ لٹکا رہتا اور ایک خاص درباری جسے خرم ہاش کہا جاتا جولاہا کسی فوجی جرنیل کا بیٹا ہوتا، وہ حاضر ہوتا اور ایک شخص کو حکم دیتا کہ وہ بلند ہو کر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے۔ "اے زبان۔ اپنے سر کی حفاظت کر لینی آداب شاہی کو ہمیشہ سامنے رکھ کیونکہ تو آج بادشاہ کے دربار میں بیٹھا ہوا ہے۔"

وہ یہ اعلان بلند آواز میں کرتا تاکہ عیاشی میں مصروف اور شریک ہونے والا ہر شخص اس اعلان کو سن لے اور ساتھیوں میں سے کسی کو یہ مجال نہ لگے کہ وہ زبان سے بات کرے۔ وہ اشاروں سے ایک دوسرے کو اچھا مذا سمجھاتے تھے۔

اس شاندار جاہ و جلال اور ان حقیقی تدابیر کے باوجود بادشاہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا اور اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں اس کے دشمن اس کو قتل نہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے کئی خواب گاہیں بنائی ہوئی تھیں۔ کسی شخص کو اس بات کا علم نہ ہوتا تھا کہ بادشاہ آج کہاں سو رہا ہے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ کے مخصوص کمرے میں اس کی اجازت کے بغیر اس کا اپنا بیٹا بھی داخل نہ ہو سکتا تھا۔



کہا جاتا تھا کہ ایک روز بادشاہ کا بیٹا جس کی عمر تیرہ سال تھی، کو بادشاہ نے ایسی جگہ پر دیکھا جہاں اس کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ آیا دربان نے تمہیں یہاں آنے دیکھا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا۔

”ہاں..... اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔“  
تب بادشاہ نے غصے سے اسے تھم دیا۔ ”جاؤ اسے تیس کوڑے مارو اور اسے دربار کی ملازمت سے نکال دو۔“  
شہناک کے حرم میں بے شمار عیویوں کے علاوہ کئی ہزار لونڈیاں تھیں جو اس کی خدمت کرتیں اور قہر و سردی محفلیں سجاتی تھیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار خدمت گار تھے۔ آٹھ ہزار پانچ سو کھڑے سواری کے لیے سات سو ساتھ ہاتھی، بارہ ہزار غمر سامان لانے اور لے جانے کے لیے، جواہرات اور سونے کے قیمتی برتن ہر وقت اس کے ساتھ جنگ اور دوسرے سفر میں۔۔۔ رہتے تھے۔ بادشاہ اپنے ارد گرد کی دوسری ریاستوں کے ساتھ جنگوں اور جھڑپوں میں لگا ہوا تھا۔ اسے اپنے عیاشی ساتھیوں اور درباریوں سے چمکارا نہ ملتا تھا اور اپنے عزم و حکومت میں اس نے اپنے عوام کا بیٹا حرام کر دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستوں کے بادشاہوں نے بھی عوام پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

مجرموں کو انتہائی اذیت ناک سزا دی جاتی تھی۔ ایک نہایت عام سزا جو خصوصاً باغی شہزادوں کو دی جاتی تھی، یہ تھی کہ آنکھوں میں گرم سلاخی پھروا کر یا کھولتے ہوئے آنکھوں میں ڈلو کر اندھا کر دیا جاتا تھا۔ زندہ آدمیوں کی ساری یا آدمی کھال کھینچوا دینے کا بھی دستور تھا۔ جو لوگ عیسائی مذہب قبول کرتے ان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی جاتی۔ بھی کانوں میں پھینکا ہوا سیدہ ڈال دیا جاتا۔ کبھی زبان بھیج کر نکال لی جاتی تھی۔

سب سے زیادہ دہشت ناک عذاب کی 9 موتیں تھیں جس کی صورت یہ تھی کہ جلا سب سے پہلے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹا جاتا تھا۔ اس کے بعد پاؤں کی، پھر گلانیوں تک ہاتھ کاٹ ڈالتا تھا اور نشتوں تک پاؤں۔ اس کے بعد پھر کہنوں تک ہاتھیں کاٹا اور گھٹنوں تک پنڈلیاں، پھر ناک اور کان کاٹا تھا اور سب سے آخر میں گردن تک سر کاٹا۔ اپنے سیاسی اور مذہبی مخالفین کو اس قسم کی کڑی خیر سزا میں دینا شہناک کا آئے دن کا معمول تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شہناک کو اپنے دیوتاؤں اور امروا مردا کی ناراضگی کا بھی کوئی خوف نہ تھا۔ لوگ جانے اور

انجانے میں اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ جب اس کی حکومت کو آٹھ سو سال گزرے تو قدرت کی طرف سے ایک سزا اسے ملی۔۔۔۔۔ اچانک اس کے کندھوں کے ابھرے ہوئے گوشت پر زخم آ گئے۔ جن کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں رہنے لگا تھا۔ اس نے طرح طرح کے علاج کروائے۔ ملک فارس کے بہترین حکماء سے علاج کروایا مگر زخم ابھی ہونے کے بجائے زیادہ تکلیف دینے لگے۔

جب وہ ہر طرح کے علاج کروا کر تنگ آ گیا تو اچانک ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ ان زخموں کا علاج انسانوں کے مغزوں سے کیا جائے تو اسے آرام آ سکتا ہے۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اگلی رات اسے پھر ایسا ہی خواب آیا۔ چنانچہ اس نے خواب میں دی گئی ہدایت کے مطابق شاہی طباطباق دیا کہ وہ کسی انسان کا مغز نکال کر اسے دے۔ جادو نے بادشاہ کا حکم سنانا فوراً ایک عام بے گناہ جوان کو پکڑ کر لے آیا۔ اسے قتل کر کے اس کے دماغ سے مغز نکال کر بادشاہ کے زخمی کندھوں پر لگا دیا۔ مغز کے تکتے ہی شہناک کو اس طرح لگا، جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔ اس کے درد و آفات محسوس ہوا تو اس روز سے اس کا معمول ہو گیا کہ کبھی کوچوں سے دو آدمی روزانہ پکڑ کر لائے جاتے اور انہیں قتل کر کے ان کے مغز شہناک کے زخموں پر رکھے جاتے تھے۔

☆☆☆

اصنہان بھی ملک فارس کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ انہی دنوں اصنہان کے حاکم کو جب انسانی مغزوں کے حصول کے لیے دونوں جوان نہ ملے تو اس نے ریاست کے ایک لوہار جس کا نام ”کاوہ“ تھا، کے دو بیٹوں کو پکڑ کر شہناک کے دربار میں بھیج دیا۔ اہل فارس کو اس وقت تک شہناک کی ان مذموم کارروائیوں کا پتا چل چکا تھا۔ ”کاوہ“ کے دونوں بیٹے جب چند روز تک نہ ملے تو اسے اس بات کا پتہ لگ گیا کہ انہیں حکومتی کارندوں نے اغوا کر لیا ہے۔ پھر چند ہی روز بعد ان کے قتل کی خبر آ گئی۔ وہ غصے سے بھرا ہوا شہر آیا اور عوام کو شہناک کے ظلم و ستم کے خلاف ابھارنے لگا۔ وہ اپنی دعوت کو ایک لمبی سی کلوزی سے باندھ کر فضا میں بلند کرتا۔ بیٹوں کے مدد سے نے اسے پھل کر ڈالا تھا۔ وہ جنونیوں کی طرح گلی گلی اور چوراہوں، رستوں پر سے گزرتا، دعوتی کو فضا میں بلند کرتا اور آوازیں لگاتا۔

”لوگو..... یہ آزادی کا جھنڈا ہے۔ یہ لوگوں کا شہناک

کے ظلم سے نجات کا راستہ ہے۔ جو لوگ شہناک کے غوثی بچوں سے رہائی چاہتے ہیں وہ اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔“ پہلے تو لوگ اس کی باتیں سن کر ہنسنے اور مذاق کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جاتے مگر وہ بکے ارادے سے اپنے کام میں جتا رہا لیکن جب اصنہان کے گلی کوچوں میں کاوہ روزانہ کلوزی سے بندھی دعوتی کو باندھے فضا میں بلند کرتا اور نعرے لگا کر گزرتے لگا، تب آہستہ آہستہ لوگوں نے اس کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ اب لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس کی باتیں سننے لگے تھے۔ تب اس نے کپڑے پر دعوتی باندھی اور جھنڈے کی شکل دے دی۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس نے گلی گلیوں سے آہستہ آہستہ جھنڈے کو موتیوں اور قیمتی جواہرات سے سجانا شروع کر دیا۔ اس کے مطابق ”ڈور“ ایک عربی لفظ تھا جس کے معنی گوہر اور موتی کے ہیں اور ”دش“ فارسی میں پگڑی کے شیلے کو کہا جاتا ہے۔ یوں اس کے جھنڈے کا نام ”دش کاویانی“ پڑ گیا یعنی ”کاوہ“ کا میرے موتیوں سے جڑا ہوا پگڑی کا شیلہ۔

کاوہ نے نہ صرف اس طرح فارس کے لوگوں کو اس جھنڈے..... تلے اکٹھا کرنا شروع کر دیا بلکہ کاوہ کی آواز اصنہان کی ریاست سے نکل کر ملک فارس کی آواز بن گئی۔ جب شہناک کی آنکھیں کھلیں اس وقت تک کاوہ کا بیٹا ہوا جھنڈا اہل فارس کا شہزادی نشان بن چکا تھا۔ کاوہ نے اپنا یہ انتہائی نشان از حاکمی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران بنایا تھا۔ اب وہ جہاں بھی جاتا، دش کاویانی اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ پھر کاوہ نے ایک اچھا خاصا لشکر تیار کر لیا اور شہناک سے ٹکر لیا۔ اس نے اہل فارس کی مدد سے شہناک کو شکست دی اور اپنی قوم کو آزادی دلائی۔ آزادی کے بعد جب فریدون انتہائی جدوجہد کے بعد بڑی شاق سے تخت فارس پر بیٹھا، اس وقت تک کاوہ اپنی طاقت حاصل کر چکا تھا کہ فریدون نے کاوہ کو فوج کا سپہ سالار اہل بنا دیا۔ کاوہ چنانچہ بھی لشکر کشی کرتا، دش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی سب کامیابیوں کے پیچھے اسی دش کاویانی کا ہاتھ ہے۔ اس نے تیس سال کے عرصے میں ملک فارس کو دشمنوں سے پاک کر دیا۔ جس کے صلے میں فریدون نے اسے اصنہان کا حاکم بنادیا۔ فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا، دش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ پھر یہ جھنڈا جب کھولا جاتا تو جواہرات کی چکاچند سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ بہر حال دش کاویانی اب اہل فارس کا قومی پرچم جانا جاتا تھا جسے اہل فارس کے سیاسی لوگوں کے ساتھ

## قبل مسیح

سین صدی سے نہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں مل سکے آتے ہے۔

اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردش ایام کو بچے کی طرف دوزاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ”ذہنی“ شیش ”آسن“ کرتا پڑتا ہے جو اتنی دشوار ہے جتنا کہ بھانے سنانا، اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہے کہ تاریخ قبل میلاد مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔

اگر یہ مؤرخین کو شاک ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کریں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب بتایا جاتا ہے کہ مردم کی تاریخ قبل 753 قبل مسیح میں پڑی تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کبھی پتا چل گیا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں 753 سال باقی ہیں؟ ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ 753 ق۔ م کو ساتویں صدی مسیح کی تاریخوں میں اصل مسند اشدان کا جہلا نہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں، آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر 350 ق۔ م میں پیدا ہوا اور 323 ق۔ م میں فوت ہوا۔ تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مر؟ استاد جواب دیتا ہے کہ یہ یاد ہے پچھلے اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

## کافی فوائد

میری معلومات عام محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوئی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشم عقل کو کسی طور پر یاد نہیں آتا کہ کافی بانگوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے بانگوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے ارباب ذوق کی کمی نہیں جنہیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس



ساتھ اہلی فن سے بھی دل وجان سے قبول کر لیا ہے۔

ملک فارس میں میدس باقی قبائل سے زیادہ تہذیب یافتہ تھے۔ یہ بڑھاپا لکھتا بھی جانتے تھے۔ انہوں نے 700 قبل مسیح اپنی سلطنت کی بنیاد میدیا کے صوبے میں رکھی اور آکتابانہ (ہمدان) کو اپنا شاندار دارالسلطنت بنایا۔ یہ آشوری بادلوں کے دشمنوں میں شامل تھے۔ دوصدویں کے عرصے میں چھوٹی بڑی جھڑپوں کے بعد میدس (میدیا) والوں نے اس آشوری سلطنت کو برادر کے دکھ دیا اور ان کے دارالحکومت نیوآ کی اینٹ سے اینٹ بھادی۔

جنگی حالات میں جب میدیا والوں نے نیوآ کو تباہ و برباد کر دیا تو ملک فارس کے واقعات کا رخ بھی بدل گیا۔ میدیا خزر کے جنوب مغرب میں آذربائیجان کے پہاڑی علاقے میں آکر آباد ہو گئے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے سے یہاں کی آب و ہوا نے ان پر بہت گہرا اثر ڈالا اور ان کے مردوں اور عورتوں کے رنگ قدرتی طور پر صاف ہو گئے۔ ان لوگوں کے قد لمبے اور جسم کی ساخت مضبوط تھی اور عورتوں کے بال ضرورت سے زیادہ لمبے ہونے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بعض عورتوں کے بال اس قدر لمبے ہو جاتے تھے کہ سنبھالنے نہ سہیلے تھے۔ ان ہی قبائل میں انیفور قبیلہ سرپرست تھا جس کی عورتیں انتہائی خوب صورت تھیں اور آج بھی حسن و خوبصورتی میں یہ عورتیں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کی نسل ”سامی“ تھی۔ ان کی تاریخ کا ایک چینی کھوج کار اور دانشور یوئی جاز ہنگ کے مطابق یہ افراد سامی نسل ہیں۔ یہ قبائل 5 قبیلوں میں بٹ کر سکیا ننگ کے علاقے میں جا کے مختلف سپہ سالاروں کے زیر نگیں ہو گئے مگر ملک فارس کو سالانہ لگان بھجوانے لگے تھے۔ تاریخ قدیم کے مطابق یہ پہلے عیسائیت کے پیروکار تھے۔ یہ اپنے رہن مکن میں انتہائی نفیس اور محنت کش لوگ تھے جو خیموں میں رہتے تھے اور ان کے مرد بھی بھڑ بکریاں چراتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے خاندانوں کی انتہائی وفا دار اور ہر کام میں ماہر تھیں۔

خونانی بھی ایک ایسی ہی لڑکی تھی جو اپنے خاندان کے ساتھ انہی پہاڑیوں کے درمیان ایک خیمے میں رہائش پذیر تھی۔ یہ اپنے حسن اور خوب صورتی کے لحاظ سے پورے قبیلے میں اپنی مثال آپ تھی۔ خونانی کے سر کے بال بچھن سے ہی اس قدر لمبے تھے کہ جب اس کی والدہ اس کے سر میں لٹکی کرتی تو وہ سلجھائے نہ سہیلے تھے اور اکثر اس کی والدہ اس کے اتنے لمبے بالوں کی وجہ سے خود پریشان

ہو جاتی تھی۔ اس کا والد کھوڑوں اور گدھوں کی تجارت کا کام کرتا تھا اور اکثر کاشغر کے بازار میں.... انہیں بیچنے اور خرید کاری کے لیے لے جاتا تھا۔ خونانی گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ گھر میں لگی ہوئی ہاتھ کی کھڑی پر اپنی بھیڑ بکریوں کی اون سے یا تو تالین بنتی یا پھر ان کی اون کو ریشوں اور دھاکوں میں تبدیل کر کے اس سے انتہائی نفیس کپڑے بناتی۔ جب وہ ان کو بناتی تو پھر ان پر کشیدہ کاری بھی کرتی۔ اس نے کشیدہ کاری کا پھر اپنی والدہ اور قبیلے کی دوسری عورتوں سے بڑی مکن اور محنت سے سیکھا تھا اور اب وہ اس میں مہارت حاصل کر چکی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح فارغ وقت میں بے جا ٹھیکے کوونے کے بجائے قریب سے گزرنے والی ران ندی پر چلی جاتی اور اس میں سے گول گول چوڑے بڑے پتھر پختی ریتی۔

ان کے قریب ہی بہت دنوں سے ایک تھنی خاندان آہٹا تھا جس کا ایک خوب صورت بیٹا بھی ران ندی کے کنارے کنارے اپنی بھیڑ بکریاں چرانے آئے لگا تھا۔ اس کے خاندان کی عورتیں ہاتھ والی کھڑی پر مکن اور تالین بنانے لگی تھیں۔ ان کے خاندان کا ایک بڑا آدمی برتنوں پر خوب صورت نقش و نگار بناتا تھا۔ جنہیں وہ بازار لے جا کر بیچ کر روزی روٹی کماتا تھا۔

اس روز بھی وہ ران ندی پر چلی گئی، بیٹے پتھر چن رہی تھی جب وہ لڑکا بھیڑ بکریوں کو پانی پلانے ندی کے قریب آیا۔ کچھ دیر رکنے کے بعد وہ دیر سے دھیرے دھیرے چلا ہوا اس کے قریب آگیا۔ خونانی اپنی ہی سوچوں میں مگن پتھر چن کر اپنے چڑے والی خیمے میں ڈال رہی تھی۔

”اے لڑکی... کیا کر رہی ہو؟“

”میرا نام خونانی ہے... تمہیں کیا... میں جو مرضی کروں۔“

”تم پانی میں ہاتھ ڈالے اسے ٹاپاک کر رہی ہو...“ لڑکے نے جواب دیا۔

”مجھے روکنے سے پہلے خود اپنی طرف تو دیکھو... تمہاری بھیڑ بکریاں صاف شہرے پانی میں منڈ ڈالے اسے گندا نہیں کر رہیں۔“ خونانی نے جھپٹے ہوئے کہا۔

”کہاں رہتی ہو...؟“ لڑکے نے دوبارہ پوچھا۔

”یہیں کی ہوں... پہاڑوں کے بیچ ہمارے خیمے لگے ہیں، ہم کمن ہو، جو مجھ سے اس قدر پوچھ کچھ کر رہے ہو؟“

”میرا نام سیاک بن فرمال ہے۔ ہم کچھ ہی دن پہلے ادھر آئے ہیں۔“

دھوکے باز

”اپنے جانوروں کو ادھر سے نکال لو۔ ابھی سزا (سورج) نکلنے والا ہے۔ عبادت کا وقت ہونے والا ہے۔ معبد کا کوئی رئیس ادھر سے گزرا تو تمہارے ساتھ مجھ پر بھی مصیبت آجائے گی۔ میں تو جاری ہوں...“ یہ کہہ کر خونانی اٹھ کر چلی گئی تو سیاک کی اونچی آواز اسے اپنے پیچھے سے سنائی دی۔

”خونانی! میں کل پھر آؤں گا... تم آؤ گی؟“

خونانی اپنے پیچھے دیکھ کر بے تحاشا ہنسنے لگی، اس کی ہنسی کی آواز دیر تک سیاک کو سنائی دیتی رہی۔

اسی شام جب وہ گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف تھی، اسے کئی بار ایسے لگا جیسے سیاک اس کے ارد گرد ہی کہیں پھر رہا ہو۔ اس نے ہر بار اس سوچ کو چھٹکنا چاہا مگر وہ روپ بدل بدل کر اس کے دماغ میں ارتعاش پیدا کرنے لگی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایک بے چینی سی اس کو لاحق ہو چکی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے سیاک نے اس پر جادو یا منتر کر ڈالا ہو کیونکہ اس زمانے میں جادو اور منتروں پر ان کا پکا اعتقاد تھا اور جادو کے ساتھ ساتھ علم نجوم پر بڑا بھروسہ کیا جاتا تھا۔

تو کیا سیاک بھی کوئی جادوگر یا ساحر ہے جس نے اس کی سوچوں کو جادو کے زور سے بدل کر دکھ دیا ہو، رات بھر اسے یہی خواب آتے رہے کہ وہ ران ندی کے کنارے سیاک کے خیموں پر سر رکھے اس کے ساتھ بیٹھی بیٹھی اور پیار بھری باتیں کر رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے صبح وہ سورج نکلنے سے پہلے ران ندی پر پہنچ چکی تھی۔ اب بڑی شدت کے ساتھ وہ سیاک کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے جیسے دن نکلتا جا رہا تھا، اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آخر وہ انتظار کرتے کرتے زنج ہو گئی اور سوچنے لگی اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ اب سورج بھی چوری آب و تاب کے ساتھ پہاڑیوں سے نکل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ جب اپنے خیمے میں واپس آئی تو اس کے گھر والے سورج دیوتا کی عبادت میں مصروف تھے۔ وہ بھی ایک طرف ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی۔ جب عبادت کر چکی تو ایک بار پھر اس کا رخ ران ندی کی طرف تھا۔ وہ بوجھل اور مایوس قدموں کے ساتھ ندی کے کنارے کنارے ایسے ہی دور تک نکل گئی پھر اچانک اس کی نظر ران ندی سے پرے پہاڑی کی ایک چٹان پر پڑی جہاں بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔

یہ یقیناً سیاک کی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ تھا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔ تھوڑی دور جا کر اس کی نظر سیاک

## ذرائع کامیابی

☆ متعدد جتنا بلند ہوا تھی ہی زیادہ دقتیں اس کی تکمیل میں اٹھانی پڑتی ہیں۔

☆ وہ تو حیات جو آسانی سے حاصل ہو جائیں، کم قیمت ہوتی ہیں۔ قابل قدر فو حیات وہ ہیں جو سخت مشکل کا نتیجہ ہوں۔

☆ کمزور انسان موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن باہمت افراد خود موقع پیدا کر لیتے ہیں۔

☆ قربانی اور کامیابی لازم و ملزوم ہیں۔

☆ جفاکشی کے سمندر کی تہ متوتوں سے بھری پڑی ہے۔

☆ زندگی میں بعض لمبے ایسے بھی ہوتے ہیں جو برسوں سے زیادہ قسٹی ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے گزر جانے کے بعد ہم قیمت دے کر بھی انہیں دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔

☆ مشکلات کا سامنا کرنے کا نام زندگی اور ان پر غالب آ جانے کا نام کامیابی ہے۔

☆ میں نے شہر کلم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے... کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

مرسلہ۔ ریاضت، حسن ابدال

پر بڑی جو بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کے سر پر چڑھ کر بولی۔

”کئی کو یوں بے چینی میں جتا کر کے خود آرام سے بیٹھے ہو۔ تم کہتے بڑے جادوگر ہو۔“

مترجم آواز سنتے ہی اس نے منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور معاً اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ... تم ہو خونانی...“

”ہاں تمہارے سحر کی قیدی خونانی...“ خونانی نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

اس بار ہنسنے کی باری سیاک کی تھی۔ ”جب سیاست کے بڑے بڑے آتش کدے غصہ سے بڑ جائیں تو دل کے آتش کدے سٹلنے لگتے ہیں۔ تم نے خود ہی تو مجھے ڈرایا تھا کہ یہاں معبدوں کے رئیس بہت ظالم ہیں۔“ سیاک نے غصہ سے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”یہاں کے مرد تو اس قدر بزدل نہیں ہیں۔ ہماری میڈیا والوں کی تو عورتیں اس قدر بہادر ہیں کہ وہ جنگوں میں



## تانپورا اور تنبور

پطرس بخاری صاحب نے ایک مرتبہ ریڈیو کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خاں کو تقریر کرنے کے لیے بلایا۔ مولانا تقریر ریکارڈ کروانے کے بعد پطرس بخاری صاحب کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو مولانا نے سوال کیا۔ ”پطرس! یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

پطرس نے ایک لمحہ سوچا اور بولے۔ ”مولانا! آپ کی عمر کیا ہوگی؟“

مولانا یہ سن کر گڑبڑا گئے اور بولے۔ ”بہی کوئی پچھتر سال۔“

پطرس نے جواب سن کر کہا۔ ”مولانا! جب آپ نے پچھتر سال فرق جانے بغیر گڑبڑا دیے تو باقی دو چار سال بھی گڑبڑا لیجئے۔“

مرسلہ۔ جاوید اختر، نا، پاکستان شریف

”لو۔۔۔۔۔ یہ کوئی مشکل بات ہے اور قید خانے تک آنے جانے پر کوئی ہم نوکروں کے لیے کوئی پابندی ہے۔ میں آج ہی کوئی راہ نکالتی ہوں۔“ یہ کہہ کر نوکرانی توکل گئی مگر سعدی کے من میں ایک جوت سی جگہ تھی۔

سعدی جانتی تھی کہ خالصین کو قید رکھنے کے بعد انہیں کن کن اذیتوں سے گزارا جاتا ہے۔

”تو کیا اس خوب صورت انسان کو بھی انہی تکالیف سے گزارا جائے گا اور پھر اس قید کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس نے سوچا۔

”اس کا نتیجہ تو صرف موت ہی ہے۔ دوسری سوچ نے اسے جواب دیا پھر اس رات اسے بڑا اسی بھیا تک خواب دکھائی دیا۔ اسے لگا جیسے اس خوب صورت نوجوان کے دونوں ہاتھ اس کی پشت سے بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلی ہوئی ہیں اور ریاست کے سپاہی اسے قید خانے سے نکال کر لے جا رہے ہیں۔

”اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“ اس نے آگے بڑھ کر سپاہی سے سوال کیا۔

”تم کون ہو لڑکی۔۔۔۔۔ ہٹو ہمارے راستے سے اور ہمارا سفر کھناتہ کرو۔“

ابھی وہ سپاہی سے ایک طرف ہٹنے کو تھی کہ ایک دوسرے سپاہی نے فوراً اسے ٹوکا۔

”او بے ذوق! کیا کر رہے ہو۔ تم اسے نہیں جانتے۔“

”یہ بادشاہ وقت کی بیٹی سعدی ہے۔“ دوسرے

کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس نے فوراً چہ گوئی سے کام لیتے ہوئے سعدی کی تعریفیں شروع کر دیں۔

”میں نہیں جانتا کہ یمن کی شہزادی کو کیسے گوارا ہوا کہ ہم جیسے مظلوموں کی طرف انہوں نے قدم بڑھ فرمایا۔ یہ بندہ پر فقیر آپ کی آمد کا بے حد شکر گزار ہے۔ گو یہ آپ کے شایان شان نہیں کہ یوں کال کوٹھری میں آپ تعریف لائیں مگر میں سمجھتا ہوں یہ آپ کی اہم جیسے لوگوں پر عنایت خسر دانہ ہے۔“

شہزادی سعدی نے پہلی مرتبہ ایک انتہائی خوب صورت اور اپنے ہم عمر شخص کے منہ سے اپنی تعریف سنی تھی۔ عورت ہر دور میں اپنی تعریف سن کر اپنا آپ بارنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ سعدی نے جب اس کے منہ سے اپنے متعلق ایسے الفاظ سنے تو وہ اس کی طرف ہل گئی۔ جب وہ اس سے ملاقات کے بعد واپس اپنے محل میں آئی تو کئی روز دست بیت ہو کر اس سے پوچھا۔

”کیوں شہزادی صاحبہ۔۔۔۔۔ آپ نے اس قیدی کو کیا پایا؟“

”تم نے جو کچھ مجھے سنایا اور جو کچھ مجھے اس کے متعلق آج تک بتاتی رہی ہو، وہ بلاشبہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایسے شخص کو اس کال کوٹھری میں۔۔۔۔۔ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ اس میں اس کے دل میں گھر بننا پانی اور اس کی مدد کے لیے کچھ کر سکی مگر میرے والد کو تو ملک یمن کا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کس قدر ظالم اور سخت آدمی ہے۔“ یہ کہہ کر سعدی خاموش ہو گئی۔

چالاک اور ہوشیار نوکرانسیں باتوں کی تو کھوج میں ہوتے ہیں جہاں انہیں کوئی نرم گوشہ نظر آتا ہے۔ وہ فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

نوکرانی نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔

”اگر آپ ایک اور کرم فرمائی کریں جیسا کہ آپ کے دل میں بھی ہے کہ آپ اس قیدی کے لیے کچھ کر سکیں۔ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس طرح کے خوب صورت انسان کو قید میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں اس کے لیے آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ نوکرانی نے انکساری سے جواب دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو پھر اس قیدی سے راہ دورم بڑھانے کی کوشش کرو اور میری اس کے دل میں جگہ پیدا کرنے کی کوئی راہ اخذ کرو۔“ سعدی نے رک رک کر اپنے دل کی بات کہہ لی۔

یہ سوچ کر وہ دھڑام سے زمین پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ اسے ہوش میں لایا گیا تو اس کی آنکھوں میں سونے موئے ہنسوتھے کسی بد بخت کے خوب صورت سپنے اس طرح بھی بنا آواز کے ٹوٹ سکتے ہیں۔ ان کی مذہبی رسوم میں پانی اور سنی کو آلودہ کرنا بہت بڑا جرم تھا۔۔۔۔۔ اور وہ جانتی تھی کہ ان جرائم کی سزا کیا ہوتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر ہی اس کی آنکھوں کے رانیں ندی سے پانی بہہ رہا تھا اور اس کے سب گھر والے اس کی اس حالت سے پریشان تھے کیونکہ ریاست کے نزدیک یہ ناقابل معافی جرائم تھے۔

☆☆☆☆

کیاؤس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عراق سے نکلے ہوئے تھا اور اس طرح وہ فارس کا پہلا بادشاہ کہا جاتا ہے جو عراق سے فرار ہو کر پہلے یمن پہنچا تھا۔ تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس سے پہلے جتنے بھی ملک فارس کے حکمران ہوئے، ان کا حلق ملک فارس کی اپنی ہی نسلوں سے تھا۔ اس طرح کیاؤس دوسرے ملک سے آکر فارس پر حکمرانی کرنے والا پہلا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ کیاؤس اپنے ملک سے۔۔۔۔۔ یمن آیا۔ اس وقت یمن میں شر بن فریقس کی حکومت تھی جو سیاسی طور پر اس کے خلاف تھا۔ جونہی کیاؤس کی اسے اطلاع ملی تو فوراً اسے گرفتار کر لیا اور ایک تنگ و تاریک قید خانے میں۔۔۔۔۔ ڈال دیا۔ کیاؤس اپنے قد کاٹھ اور رنگ روپ میں بے حد خوب صورت تھا۔ جب اس کی گرفتاری کی خبر ملک یمن میں عام ہوئی اور بڑے بڑے جتنے جرنیلات میں پہنچی تو شہر کی بیٹی سعدی کو بھی اس کی خوب صورتی کی خبر ایک نوکرانی کے ذریعے پہنچی۔ اس وقت تو شاید سعدی اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیتی مگر وقتاً فوقتاً اس کی باتوں نے سعدی کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں شر بن فریقس کو ٹبری کہہ رہے تھے بن دستان چار ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر کیاؤس کی مدد کو آ رہا ہے۔ اب تک اپنی نوکرانی کی باتیں سن کر سعدی کو بھی کیاؤس کو دیکھنے کی تمنا ہونے لگی تھی۔ اوہر ایک روز اس کینز نے سعدی کو یہاں سے قید خانے میں موجود کیاؤس سے ملانے کا موقع ڈھونڈ لیا اور اسے قید خانے میں لے گئی۔ کیاؤس نہ صرف اپنے جسمانی حسن میں بے مثال تھا بلکہ وہ باتیں بھی کمال کی کرتا تھا۔ وہ باتوں کے جال میں لوگوں کو پھانسنے کا ہنر جانتا تھا۔ ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے حکارہ بن نے سوچا کہ اس خوبصورت خانے سے نکلنے کا بہترین راستہ شر بن فریقس کی بیٹی سعدی کے سوا اور

مردوں کے شانہ بشانہ شریک ہوتی ہیں۔ وہ تو گھوڑوں پر بھی پشت کر کے نہیں بیٹھتیں اور نہ ہی تیروں کی بو چھاڑ کر تے گھبراتی ہیں۔ تم کیسے مرد ہو۔۔۔۔۔ میری باتوں سے ہی ڈر گئے۔ دیکھو آج تمہارے آنے سے رانیں ندی پر اڑنے والے خوب صورت پرندے بھی کتنے اداس ہیں۔ وعدہ کرو، تم مجھے یہاں ضرور ملا کر دو اور کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔“ خروانی۔۔۔۔۔ نے جذباتی انداز میں جرات سے کہا۔

”ٹھیک ہے خروانی! میں کل تم سے ضرور ملوں گا۔“

سیاک نے کہا تو خروانی دوبارہ اپنے خیمے میں واپس لوٹ آئی۔ اس کا باپ بازار سے اگلے روز دو پہر کو واپس پلٹا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے کاروبار میں بہت زیادہ منافع ملا تھا۔ وہ خروانی کے لیے بہت سے تحائف لے کر آیا تھا۔ اس کے آتے ہی خروانی بڑی خوشی اور پیار سے اپنے والد کے قریب آ بیٹھی۔

”جانتی ہو، یہ تحائف میں اپنی پیاری بیٹی خروانی کے لیے لایا ہوں۔“ اس نے تحائف اپنی بیوی کے سامنے رکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں، تمہیں تو بس بیٹی کے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔“

”یہ ہے ہی اتنی پیاری کہ واقعی مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“ اس کے باپ نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ پھر وہ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ خروانی کو وقت کا پتا ہی نہ چلا۔

”ارے۔۔۔۔۔ یہ تو مجھے بتانا یاد ہی نہ رہا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو ریاست کے ہر کارے ایک تہایت خوب صورت نوجوان کو پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ وہ نوجوان تھیں چلا رہا تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھے امور امدادی قسم یہ مجھ پر الزام ہے۔ وہ اپنے آپ کو سپاہیوں سے چمکانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سپاہیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ چلا رہے تھے۔ تم نے ہوا اور پانی کو پلید کیا۔ تم رانیں ندی کے پاک پوتر پانی سے منہ دھو رہے تھے اور تمہاری بھیجیں بکریاں ندی میں منہ ڈالے ہوئے تھیں۔ تمہیں پاک اور پوتر پانی کیوں سرعام پلید کرنے پر گرفتار کیا جاتا ہے۔“

یہ بات سنتے ہی خروانی کا رنگ سفید ہو گیا۔ کانٹو بدن میں ہلکے۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ یہ سوچے ہوئے کہ وہ نوجوان سیاک کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہی اس کے کہنے پر رانیں ندی پر آیا ہوگا۔



نے بتایا۔

”شہزادی صاحبہ! میں معافی مانگتا ہوں۔۔۔۔۔“ پہلے نے کہا تو دوسرا فوراً بولا۔

”جلدی سے اسے لے جا کر اس کے دو بھوکے کر کے انہیں چٹانوں کے پاس پھینک آؤ۔ درندے پرندے خود ہی کھا جائیں گے۔“ دوسرے نے جلدی سے کہا۔ اور ستو حرا (سورج) کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے یہ کام کر دو۔ ورنہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی ناراضگی الگ دیکھنا پڑے گی۔“ اس نے نصیحت کی۔ اسے سنتے ہی پہلے نے اپنی کمر سے تلوار اتاری اور اسے سونت کر قیدی کی گردن مار دی۔ مقتول کی شدت کرب سے ایک جھج بلبھ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سعدی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے جسم میں مارے خوف کے کچھلک چلا رہی تھی اور چہرہ ڈر سے ہچکا ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تفتی دیر تک اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتی رہی۔ تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چاہے کچھ بھی ہو، اس قیدی کو ضرور چھڑائے گی۔ اگلے روز اس نے پھر نوکرانی کو طلب کیا۔

”رات تو شہزادی صاحبہ مارے خوف کے مجھے نیند نہیں آئی۔ عجیب و غریب خواب آتے رہے۔“ نوکرانی نے بتایا۔

”میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔“ پھر کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ نوکرانی سے مخاطب ہوئی۔ ”کہو دوبارہ قیدی سے تمہاری ملاقات ہوئی۔“

”ہاں جی۔۔۔۔۔ ابھی کل ہی اس سے ملاقات ہوئی۔ کہہ رہا تھا تمہارے ساتھ وہاں نہیں آئی۔“ نوکرانی نے جواب دیا۔

”پھر۔۔۔۔۔“ سعدی نے بے تابی سے پوچھا۔

”میں نے اپنی طرف سے ادھر ادھر کی لگادی۔ آپ کسی وقت ہوا میں نا۔“ نوکرانی نے کہا۔

”جی تو میرا بھی کرتا ہے مگر اب جان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر ان کے کانوں میں ڈرا بھی جھک پڑتی کہ ان کی لاڈلی بیٹی دشمن قیدی سے ملتی ہے تو ہم سب کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“ نہیں بتا ہے وہ غصے کے بہت برے ہیں۔“

”مگر شہزادی صاحبہ! قیدی بھی تو بہت پرانا ہے۔ جیلوں میں اتنے قیدی پڑے ہیں، بادشاہ سلامت کو جب تک یا نہ دلا جائے، اس وقت تک ان کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ کونسا قیدی قید خانے میں موجود ہے اور کونسا نہیں۔“

”کیا دس کو تقریباً 4 سال ہو چکے ہیں ہماری قید میں۔“ نوکرانی نے تفصیل سے جواب دیا۔

”یہ تمہیں کس نے بتایا؟“ سعدی نے پوچھا۔

”میں ملتی رہتی ہوں اس سے اور اپنا نام کیا دس بھی اسی نے خود بتایا تھا۔ یہ بھی کہ اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈالے تقریباً 4 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مجھے تو یہ بھی علم ہے کہ اس کو یہاں سے چھڑانے کے لیے رستم اپنا فوجی دستہ لے کر ہماری ریاست پر حملہ آور ہو رہا ہے۔“ نوکرانی نے یہی سب تفصیل بھی سعدی کے گوش گزار کر دی۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ اگر ہم رستم کے حملہ آور ہونے سے پہلے پہلے کیا دس اور اس کے ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرادیں تو وہ اور اس کے ساتھی زعدہ بچ جائیں گے۔“ سعدی نے ترکیب بتائی۔

”آپ کی بات تو حکیک ہے۔ اس طرح آپ کا پیار بھی بچ جائے گا۔“ نوکرانی نے شہرہ دیا۔

”مگر جیل کی جالی۔۔۔۔۔؟“ سعدی نے ایک اور سوال کیا۔

”وہ میں خود جیل کے دارو درو سے کسی نہ کسی طرح لے لوں گی۔“ نوکرانی بولی۔

”اس کے لیے کیا دس کو بھی تو اعتماد میں لینا ہوگا۔“ سعدی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آپ اس سے خود بات کر کے دیکھ لیں۔ اس طرح ایک تو آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے گی، دوسرا اسے آپ کی محبت کا یقین ہو جائے گا۔“ نوکرانی نے کہا تو سعدی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اس روز سعدی نوکرانی کے ہمراہ کیا دس سے دوبارہ ملی تو اس نے اپنی یہ تجویز کیا دس کے سامنے رکھی۔

”یہ کیسے ممکن ہوگا؟ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔“ کیا دس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں کیا دس۔۔۔۔۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم سارا کام خفیہ طور پر کریں گے۔ مجھے اس خفیہ راستے کا علم ہے جہاں سے میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نکالوا سکتی ہوں۔“ سعدی نے جواب دیا۔

”مگر سعدی! یہ تم کس کو؟ بہت مشکل اور اپنی جان پر کھیلنے والا کام ہے۔“ کیا دس نے اسے پکا کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل کر سکتی ہوں۔ میری محبت اس قدر بڑل بھی نہیں ہے۔ بس تم اور تمہارے ساتھی تیار رہنا۔ میں جس وقت بھی چھپوں اس کا اشارہ کروں گی تم اور تمہارے ساتھی فوراً نکل جائیں گے۔“ سعدی نے جرات مندانہ لہجے میں کہا۔

اور اسے بھی محض اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ جس وقت سعدی کیا دس اور اس کے ساتھیوں کو ایک خفیہ راستے سے

دھوکے باز

نکال کر لے جا رہی تھی، اسی صبح رستم۔۔۔۔۔ ایک دوسرے راستے سے جو ریاست جوتان سے جیل تک آتا تھا، اس سے ہوتا ہوا یمن کی ریاست تک آ گیا۔ اس نے آتے ہی یمن کا محاصرہ کر لیا اور شمر بن فریقس کو قتل کر دیا۔ واپسی پر وہ کیا دس کو ساتھ لے گیا۔ سعدی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے کیا دس کے کہنے پر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس کے وطن چھوڑ دیا۔

اپنے وطن پہنچ کر اس نے سعدی کی شادی اپنے بیٹے سیادش کے ساتھ کر دی۔ کیا دس چار سال کے بعد رستم کی مدد پر قید سے چھوٹ کر اپنے ملک واپس تو آ گیا تھا مگر اپنی حماقتوں سے باز نہ آیا۔ اپنے ارد گرد کی ریاستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ دراصل وہ جلد از جلد اپنے ملک کو فارس کی طرح وسعت دینے کا خواہاں تھا۔ ملک فارس میں اس وقت افراسیاب بادشاہ تھا جس کے ساتھ اس کی بھی بھی نہیں بنی تھی۔ افراسیاب نے جب دیکھا کہ کیا دس اپنی چھیڑ چھاڑوں سے باز نہیں آتا تو اس نے موقع نصیحت جانتے ہوئے کیا دس پر حملہ کر دیا۔ کیا دس نے ایک بار پھر رستم کو مدد کے لیے کہا۔ اس بار پھر رستم نے کیا دس کی بھرپور طرح سے امداد کی اور رستم نے کیا دس کی طرف سے افراسیاب کا مقابلہ کر کے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ اس جنگ میں افراسیاب مارا گیا۔ پورے عام میں اب یہ مشہور ہو چکا تھا کہ کیا دس رستم کے بغیر کچھ نہیں اور اس کی طاقت محض رستم کی وجہ سے ہے۔

ان ہی دنوں سعدی نے سیادش کے بیٹے کو ختم دیا جس کا نام کثیر درکھا گیا۔ آگے چل کر ہی کیا دس اور سیادش کے بعد سیادش اور سعدی کا بیٹا تخت فارس کا وارث ہوا۔ اس کے بعد ابراہیم جب تخت نشین ہوا تو ملک فارس کا پایہ تخت لٹخ کو بنایا گیا۔

ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا بیتاسف ملک فارس کا بادشاہ ہوا تو ہر اس نے تلخ ہی کو اپنا پایہ تخت بنائے رکھا۔

ہیرس پر اس وقت ہتاسن (ہتاسنیوں) کی حکومت تھی۔ انہوں نے دنیا میں جیل کی بار لکھنے کے فن کو رواج دیا۔ غرور و سازگی اور ان پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کی کھدائی بھی انہی کے دور میں شروع ہوئی۔ ان کے وقت کے فخری اور برنگی (جینس) کے پیالے اور گھوڑوں کا ساز و سامان ملنے کے علاوہ معمار کی کے نمونے اور اصطر کے علاوہ سوسائے کلاہات، بڑے بڑے ستون، شاندار میزبیاں سب ترشی کی آرائشی چٹیاں، باہل اور آشوریہ کے حکمران کی یاد دلاتے

ہیں۔ ان کے حکمرانوں میں قطار اندر قطار ستونوں پر لکھی سی چھت ہوئی تھی جن میں شہنشاہ ملک فارس اور بیرونی ممالک سے آنے والے سفیروں اور امیروں کو بٹھایا جاتا تھا۔

☆☆☆

فارس کے لوگوں کا مذہب فطرت پرستی تھا۔ آریہ قوم مظاہر پرستی کا شکار تھی۔ روشنی، شفاف آسمان، آہنگ ہوا میں، حیات بخش بارشیں ان سب کی مقدس معبودوں کی طرح پرستش کی جاتی تھیں جبکہ حکمت اور نقطہ سالی کو ملعون دیو تصور کیا جاتا تھا۔ مظاہر پرستی کے ساتھ وہ ایچھے آباؤ اجداد کی اردواح کی بھی پوجا کرتے تھے۔ مذہبی چیتاؤں کی جماعت نے اہل فارس کے ذہنوں پر مکمل قبضہ کر رکھا تھا اور جادو وغیرہ کے ذریعے وہ دیوتاؤں کے نزدیک ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

اس مظاہر پرستی کے دور میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ یہ اہل فارس کے قدیم مذہب کا بانی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زرتشت چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ جب زرتشت نے ان مشرکانہ حرکات سے لوگوں کو روکا تو لوگوں نے زرتشت کی مخالفت اس لیے شروع کر دی کہ وہ انہیں ان کے قدیم خداؤں کی عبادت سے روکتا ہے۔

زرتشت آذربائیجان کے صوبے کا باشندہ تھا اور اس کی پیدائش یورپیا جیل کے مغربی کنارے پر ایک قصبے میں ہوئی۔ اس قصبے کا نام بھی یورپیا تھا۔ اس کا عہد شباب تھائی اور شلوٹ گزینی میں بسر ہوا۔ اس وقت وہ ہمیشہ غور و فکر میں مصروف رہتا اس کے مطابق اسے مطابق اسے خواب میں سات مرتبہ بشارتیں ہوئیں۔ لوگ اس کی باتوں کو فضول سمجھتے تھے اور خاص کر آگ کو پوجنے والے نہ صرف اس کی مخالفت کرتے تھے بلکہ اس کی باتوں کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ زرتشت نے لوگوں کو ایسے معجزات دکھائے جنہیں عقل قبول کر سکے

اور اس نے خاص اشیاء کے بارے میں جو باتیں کہیں، ان پر لوگوں نے اس کے گروا کھٹا ہونا شروع کر دیا۔ مثلاً زید اس دن مرے گا اور فلاں شخص فلاں روز بیمار پڑے گا یا فلاں دن فلاں وقت فلاں شخص کے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔

ایک دفعہ زرتشت کے باپ نے ایک مجلس میں اپنے وقت کے بہت بڑے کاہن اور جادوگر کو دعوت دی کیونکہ اس عہد میں شرک کے علاوہ جادو اور نجوم پرستی کا بھی بہت زور تھا۔ اس نے اس کاہن کو اپنے کمالات دکھانے کے لیے کہا۔ جب زرتشت کو معلوم ہوا تو اس نے سخت احتجاج کیا اور التجا کی کہ برے راستوں کو چھوڑ کر خدا کے واحد کی



پرستش کی جائے کیونکہ وہی تمام انسانوں کا رب، قاضی الحیات ہے۔ چادوگر نے زرتشت کو اپنے جادو کی قوت سے ڈراتا چاہا۔ مگر زرتشت نے کہا کہ تیرا جھوٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرے پاس تمہاری ان تمام باتوں کا توڑ موجود ہے۔ جس سے میں لوگوں کو اپنی چائی کا یقین دلاتا ہوں۔

اہل فارس شروع سے ہی خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے تھے جس میں کوئی نظام تھا، نہ اخلاق۔ اگر کسی شہنشاہ نے اس کی تربیت کی بھی تو کچھ عرصے بعد وہ سب کچھ بھلا کر دوبارہ اپنی اسی آبائی زندگی کی طرف پلٹ گئے۔ اہل فارس نے زرتشت کو اپنی اذیتیں دیں کہ اس کی ہمت جواب دے سکی۔ وہ چیخ اٹھا اور خدا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے خدا سے کہا کہ میں ملک میں جاؤں، کس طرف کا رخ کروں۔ میرے عزیز واقرباء نے میری بات سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔

بالآخر زرتشت اس کے بعد بلخ کی طرف روانہ ہوا اور بڑی مشکلات سے بادشاہ کے دربار تک اسے رسائی حاصل ہوئی۔ دین زرتشت کے دشمنوں نے بڑی کوشش کی کہ اس کی آواز بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ کئی دلوں کی تنگ دلوں کے بعد ایک دن بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔ زرتشت نے انور امزدا کی عبادت کی طرف بادشاہ و گشتا سپ کو دعوت دی۔

بادشاہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا لیکن اس کے دربار میں موجود پروہت، کاہن اور جادوگر اپنی جلدی اپنے آبائی دین سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ تین دن تک دونوں اطراف سے دلائل دیے جاتے رہے۔ جادوگروں، پروہتوں اور کاہنوں کی دلیلیں بڑی گتھلگتھلک اور پیچ دار تھیں جبکہ ان کے مقابلے میں زرتشت کی تعلیم نہایت سادہ دلائل پر مبنی تھی۔ بالآخر زرتشت کو ان پر فتح نصیب ہوئی اور وہ بارہویں کو کھٹک فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ اب انہوں نے زرتشت کے خلاف خفیہ سازشیں شروع کر دیں اور زرتشت کو قید میں ڈال دیا مگر بادشاہ کے دل سے زرتشت کے دلائل اور تعلیمات کو نہ نکال سکے۔ ایک روز قید خانے کے نگران نے دربار میں جب تمام درباری جا چکے تو بادشاہ گشتا سپ سے کہا۔

”جہاں پناہ! اگر جاں بخشی کی جائے تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بڑے دلوں سے یہ بات میری روح کو بھینچوڑ رہی ہے۔“ نگران بولا۔

”ہاں..... ہاں کہو.....“ گشتا سپ نے جواب دیا۔

”میں کہتے دلوں سے اپنی ان گناہ گوارا گتھوں سے

دیکھ رہا ہوں کہ حضور نہ تو درباری امور میں دلچسپی لے رہے ہیں اور نہ ہی کھانی رہے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میری طرح آپ کا ہر وفادار اس بات پر بہت رنجیدہ اور پریشان ہے۔“ نگران نے تفصیل سے بتایا۔

”میں خود نہیں جانتا کہ اس کا کیا سبب ہے، لیکن اچھے بیٹھے مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ زرتشت..... کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے کہ وہ کسی پر اپنی مرضی اور اپنا فیصلہ نہیں چھوڑتا..... اور زرتشتی کسی کو اپنے سننے دین کی طرف نہیں بلاتا۔“

کچھ دیر کے توقف کے بعد بادشاہ دوبارہ بولا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ بس یہی غم اور فکر مجھے نہ تو کچھ کھانے دیتا ہے اور نہ ہی کسی کام میں میراں لگتا ہے۔“ بادشاہ جب خاموش ہوا تو درباریان بولا۔

”بادشاہ سلامت! اس کی باتیں تو میرے بھی دل کی گتھی ہیں مگر اس کی تمام باتیں درست بھی نہیں ہیں، پھر اس کی تعلیم میں اس قدر الجھاؤ اور جھجک ہے۔“ درباریان نے جواب دیا۔

”بات تو تمہاری بھی مجھے درست لگتی ہے مگر اس کے باوجود اس کی باتوں میں جو سچائی مجھے نظر آئی، شاید تم بھی اس تک نہ پہنچ سکو۔“ بادشاہ نے یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیا۔

زرتشت دھیرے دھیرے اپنی تعلیمات جاری رکھے ہوئے تھا۔ پہلے دس سالوں میں اس کے عقیدے عقیدت میں صرف ایک شخص داخل ہوا۔ جب وہ صوبہ خراسان کے شہر کھارم میں گشتا سپ سے ملے آیا اور اس کے سامنے اپنی تعلیمات کو رکھا تو اس بادشاہ کے وزیر کے دو لڑکے اور درباریان سے مکالمے کے بعد اس کی اپنی ملکہ اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے لیکن اس کے نئے دین کو ترقی اور عروج اس وقت حاصل ہوا جب بادشاہ گشتا سپ خود اس کے عقیدے مندوں میں شامل ہو گیا۔

جب زرتشت کا دین اس کی سوچ کے مطابق \* اس قدر جلدی نہ پھیل پایا تب جوئی علماء نے ”زوغ“ کے نام سے اس کی تفسیر لکھی اور اس کی شرح کو بھی عوام کسب کیا۔ زرتشت کی تعلیمات میں یہ بھی تھا کہ آگ کی حرمت عبادت کرانے والے پروہتوں پر بھی لازم ہے۔ وہ جب فرمان گاہ پر مذہبی رسوم ادا کرنے لگے تو اپنے منہ پر کپڑا باندھ کر رکھے تاکہ اس کی سانس سے آگ آلودہ نہ ہو۔

ان کے نزدیک جب انسان بیمار ہو جائے تو وہ کسی خصوصی توجہ اور شفقت کا مستحق نہیں رہتا بلکہ وہ قابل نفرت

ہو جاتا ہے کیونکہ بیماری اس بات کی علامت ہے کہ اس پر بڑی قوت نے قابو پایا ہے۔ اس لیے قہری رشتے دار بھی اس کو نظر انداز کر دیں۔

جب کوئی زرتشتی قریب المرگ ہو جاتا ہے تو روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے سینے پر رکھ دیتے ہیں اور ایک ٹکڑا اس کے قریب لایا جاتا ہے۔ اگر وہ کتا اس روٹی کے ٹکڑے کو کھالے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص مر گیا ہے۔ مرنے کے بعد اس کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مرنے والے کو زمین میں دفن نہیں کرتے کیونکہ اس طرح مٹی جو کہ ان کے نزدیک پاک ہے، وہ پلید ہو جاتی ہے۔ اس کو نذر آتش کر کے بھسم بھی نہیں کرتے کیونکہ آگ ان کی مینو ہے۔ وہ اس کی آلائشوں سے ناپاک ہو جاتی ہے۔ وہ لاش کو ایک گھر سے کوئیں جس کو وہ دھمہ کہتے ہیں، اس میں لٹکا دیتے ہیں۔ گوشت خور پرندے کو،ے، چیلٹیں، اور گد بھٹ جھپٹ کر اس کا گوشت فوج لیے لیتے ہیں۔

ایک انگریز تاریخ دان فریوری حقیق کے مطابق جب زرتشت کی وفات ہو گئی تو..... وہ مظاہر فطرت جن کی عبادت کو زرتشت نے بالکل ختم کر دیا تھا، وہ پھر واپس لانے لگے تھے اور امورا مزدا کے ساتھ ساتھ ان کی بھی پوجا کی جانے لگی تھی۔ توحید خالص کے عقیدے کو اہل فارس نے آہستہ آہستہ ترک کر دیا اور قوم نے اپنی عبادت گاہوں میں پرانے بتوں کو بھی سجا کر رکھ لیا۔ شرک اور کفر کے جس بھنور سے زرتشت نے اپنی قوم کو نکالا تھا، وہ پھر بھنور میں بھنس گئے تھے۔

اسی دوران کوروش اعظم نے میڈیا والوں کو کھٹک دے کر اپنے جدا بجد ہمناس کی بنیاد رکھی۔ 331 قبل مسیح میں ہمناس (ہٹائیوں) کی سلطنت اپنے اختتام کو پہنچی اور ان کی جگہ ملک فارس آشکانیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ آشکانی لوگ خانہ بدوش تھے اور ان کے قبیلے روس اور چین کی سرحدوں کے قریب میدانوں میں گھومتے رہا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ بھی ہٹائیوں کی طرح پارسی (فارسی) نسل سے تھے لیکن یہ ان سے زیادہ مذہب اور..... اپنے طویل عہد حکومت میں اصلاً خانہ بدوش ہی رہے۔ جو ہٹائی ان دنوں اپنے وطن سے..... دور نکل کر جنوب مشرق میں آباد ہوئے، اس صوبے کو ہٹائی پرتھو (پرسو، پہلو) کہتے تھے۔ رومن انہیں پارٹیا والے (پہلوی) کہتے تھے۔ پارٹیا والوں اور یونان میں شروع دن سے ہی دشمنی رہی۔

☆☆☆

پارتھیا بھی ملک فارس کے دوسرے صوبوں کی طرح ایک صوبہ تھا جو خراسان اور استرا آباد کی حدود میں واقع تھا لیکن ملک فارس کا ایک حصہ تھا اور پارٹھیا کے رہنے والے ملک فارس کو خراسان اور دوسرے مالی اخراجات ادا کرتے تھے۔ پارٹھیا قوم نے اپنے ہامت اور بہادر شخص ارٹھک کی سرکردگی میں یونان کو کھٹک دی اور عہد آشکانیوں کی بنیاد رکھی۔ پارٹھیا قوم بڑی ہی بہادر قوم تھی۔ یہ وہی قوم تھی جس کی عورتیں بھی جنگجو تھیں۔ یہ اپنے مردوں کی طرح گھوڑوں پر سواری کرتے ہوئے دونوں پاؤں ایک رکاب میں کر لیتیں اور گھوڑوں کو تیز رفتاری سے دوڑاتی تھیں۔ یہ باہر تیرا اندازوں کی طرح بھاگتے ہوئے گھوڑوں پر اپنا رخ بھی تبدیل کر لیتی تھیں اور دشمن پر نیروں کی بوچھاڑ کرنے کے بھرتے بھی واقف تھیں۔

ارٹھک کی قائدانہ اور فاتحانہ صلاحیتوں کے باعث پارٹھیا والوں نے بڑی شان سے..... اپنی آزاد حکومت کی بنیاد رکھی اور بحران کی فوجات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پارٹھیا کے لوگ کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے، دیگر جاہل اقوام کی طرح وہ اپنے اسلاف کے مجسموں کی عبادت کرتے۔ یہ لوگ بھی ہٹائیوں کی طرح زرتشتیوں سے متاثر ہوئے اور وہاں ہی خداؤں کا طراز اور ہمناس کو ماننے لگے۔ ان کے نزدیک مزدا، نیکی کا خدا تھا اور اہرمین شر کا دیوتا۔ ان کے ہاں پھر سورج اور چاند کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ جادو اور منتروں پر ان کا راسخ اعتقاد تھا۔ دل ڈیوراں لگتا ہے۔

”پارتھیا کے ہاں جادو اور علم نجوم پر بڑا بھروسہ کیا جاتا تھا اور کوئی اہم کام شروع کرنے سے پہلے نجومیوں سے مشورہ کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جب سورج طلوع ہوتا وہ اسی وقت کی عبادت کرتے اور سورج کو اس کے پرانے نام ”سزرا“ سے یاد کیا جاتا پھر آہستہ آہستہ انہوں نے آگ کی پرستش سے متاثر نہ شروع کر دیا اور سورج چاند وغیرہ... کی پوجا میں اتنے متوجہ ہو گئے کہ بڑے بڑے آتش کدے ٹھنڈے ہو گئے۔“

یورپین خانہ بدوش پارٹھین سے زیادہ وحشی تھے۔ پارٹھین اور یورپین کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ وحشی صرف پارٹھین کے قابو میں آتے تھے مگر بعض اوقات پارٹھین بھی ان سے دب جاتے تھے۔

رومی عالمگیر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور وہ دیکھتے تھے کہ جب تک پارٹھیا والے ان کی راہ سے نہیں ہٹ



جاتے، وہ اپنی اس خواہش کو بھی پورا نہ کر پائیں گے کیونکہ تین صدیوں سے یہ دونوں سلطنتیں آپس میں برسرِ کار تھیں۔ وہ کی بار آپس میں ٹکرائیں تھیں مگر حتمی طور پر نتیجہ کسی کے حق میں نہیں نکلا تھا۔ روم کے فرمان روا اب اس بات کو تسلیم کرنے لگے تھے کہ جب تک پارٹیا والے ان کی راہ میں رکاوٹ بنے رہیں گے، وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ پارٹیا والے نہ صرف حصولِ اقتدار میں اہل روم کے حریف تھے بلکہ تجارت میں بھی وہ ان کے مد مقابل تھے۔ چین کا ریٹیم ملک فارس سے ہو کر روم پہنچ سکتا تھا۔ پارٹیا والے اپنی ضرورت پوری کیے بغیر مغرب کی طرف چینی ریشم پہنچنے ہی نہ دیتے تھے اور برآمد کی ہوئی چیز کی بڑی قیمت وصول کرتے تھے۔ پارٹیا والوں کو اگر اپنے حیران داز... فوجیوں کا ذمہ تھا تو دوسری طرف روم کے جمہوری حکمرانوں نے اپنی فوج میں فولادی نظم و نسق برقرار رکھا ہوا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح کا ایک یونانی تاریخ دان پولی بیس لکھتا ہے۔

”جمہوریت کے ابتدائی سالوں میں روم کے تمام شہریوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ فوجی خدمات سرانجام دیں۔ ان رومی سپاہیوں میں سے پہرے کی حالت میں جو سپاہی سو جاتے، ان کے خلاف کارروائی کے لیے فوجی عدالت کا اجلاس طلب کر لیا جاتا اور جو سپاہی مجرم ثابت ہوتا، اس پر سنگ باری کر کے اسے وہیں ختم کر دیا جاتا اور جو کسی وجہ سے زندہ رہ جاتے، ان کو گھروں میں واپس آنے کی اجازت نہ تھی اور خاندان کا کوئی فرد حکومت کے خوف سے انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رومی فوج میں رات کے وقت چوکیداری کے تقاضے بڑے اہتمام سے پورے کیے جاتے تھے۔ اس لیے رومی فوج کی کامیابیوں کا شادہ دلانہ انعام و اکرام اور وحشیانہ سزاؤں پر موقوف تھیں۔ اسی بنا پر یہ جمہوری مملکت آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ برطانیہ سے مصر تک اور ماریطینیا سے آرمینیا تک رومیوں کا سلطانی پرچم لہرانے لگا اور اس وسیع و عریض مملکت کے باشندے اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے کہ وہ رومی شہری ہیں۔“

ابتدائی رومی جمہوریت کی حکومت، حکومتِ عدلیہ تھی (چند لوگوں پر مشتمل) یعنی اولیٰ گارچی کیونکہ امراء کا ایک چھوٹا سا طبقہ تمام عدلیہ کی سرکاری عہدوں پر مسلط تھا۔ عوامی نمائندوں کو طبقہ امراء کی اجارہ داری پسند نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ رومیوں نے عملی مصلحت پسندی کے پیش نظر عوامی نمائندوں کے مطالبات کو

تسلیم کر لیا اور نظامِ حکومت میں ترمیم کر دی گئی۔ مملکت روم کے عوامی نمائندوں کو یہ شکایت تھی کہ سلطنت کا قانون تحریری طور پر نہیں لکھا گیا اس لیے وہ اپنے حقوق کا پورا تحفظ نہیں کر سکتے۔ اس شکایت کے پیش نظر ایک خاص کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ جس نے پہلی مرتبہ 449 قبل مسیح میں رومی قانون کو تحریری شکل میں مرتب کیا۔ اس تحریری قانون کو ”بارہ تختیاں“ کہتے تھے کیونکہ یہ لکڑی کی بارہ تختیوں پر کندہ کر لیا گیا تھا۔

مگر ان اصلاحات کے باوجود ان کی وسیع و عریض سلطنت میں وقت کے ساتھ ہر طرح کی انتظامی اور معاشری خرابیاں رونما ہونے لگیں۔ ظاہری طور پر اگرچہ جمہوری حکومت اپنے تمام اداروں کے ساتھ قائم تھی لیکن اس کے یہ ادارے رفتہ رفتہ بے اثر ہوتے چلے گئے اور ان میں نہ یہ قوت رہی کہ بیرونی حملہ آوروں کی یلغار کے سامنے بند باندھ سکیں اور نہ اتنا دم روبا کہ وہ اندرون ملک بے چینی کی آغوشے والی لہروں کو قابو میں لاسکیں۔

پارٹیا نے بھی ملک روم کے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور روم پر چڑھائی کر کے اس کے بہترین جرنیل کیرے کو شکست دی۔ رومیوں کے متعلق تاریخ دان کہتے ہیں کہ وہ یونانیوں کے جانشین ہیں کیونکہ ان کے سیاسی معاشری اور معاشی نظریات بڑی حد تک یونانی علماء کے نظریات سے متاثر ہیں۔ یونان کا غلط برخورد کے شالی ساحل پر واقع ہے اور یہ مختلف پہاڑی سلسلوں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان وہادیاں ہیں جہاں آمد و رفت کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے باعث ایک متحدہ حکومت قائم کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونان کا غلط بے شمار چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں پر مشتمل تھا جو کہ اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں کافی حد تک آزاد تھیں۔ زراعت صرف پہاڑوں کے درمیان وادیوں میں ہو سکتی تھی۔ اہل یونان بمشکل گزر اوقات کر سکتے تھے۔ سکندر اعظم کے زمانے تک ان لوگوں کی یہی کیفیت رہی۔ آبادی کی ضرورت مقامی چشموں سے پوری ہوتی تھی مگر ان چشموں پانی اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا جس سے پورے طور پر کاشتکار کی جاسکے۔ یونان کی ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ بھی تھی جس کے ذریعہ کسانوں کی زندگی کم آمدنی وجہ سے اور بھی اجیرن تھی۔ اس لیے وہ اپنے دولت ہمسایوں سے قرض لینے پر مجبور تھے۔ قرض خواہ جتنے سود انہیں قرض دیتے۔ کم آمدنی کی وجہ سے مقررہ صوفوں کے

1۱۱ کی بہت مشکل مرحلہ تھا کہ وہ اپنی محدود آمدنی سے اپنا اور ہال بچوں کا پیٹ پالیں یا قرضہ ادا کریں۔ جب وہ مقررہ عیار پر قرض نہ ادا کر سکتے تو ان کی جائیداد ان سے چھین لی جاتی اور بعض اوقات انہیں اپنی شخصی آزادی سے بھی محروم ہونا پڑتا۔ اس لیے غریب لوگ بڑی بے اطمینانی کا شکار تھے۔ اس کے علاوہ یونان کی دو مشہور ریاستیں ایتھنز اور سپارٹا تھیں۔ سپارٹا کے اہل باشندے جو یونان کی پوری آبادی کا پانچ سے دس فیصد تھے، یہی طبقہ حکمران تھا۔ فوج بھی انہی کے جوانوں پر مشتمل تھی۔ وہ صرف یونان پر حکومت کرتے تھے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ سپارٹا کے شہریوں کو فوجی تربیت بڑی سختی سے دی جاتی تھی، جو لوگ فوجی تربیت حاصل کرنے سے معذور یا صحت کے لحاظ سے کمزور ہوتے یا جسمانی اعتبار سے عیب دار ہوتے، انہیں امران طبقے کی طرف سے اجازت تھی کہ ان کو ایک غاریا پہاڑوں کے درمیان کسی ویرانے میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ سردی سے خود بخود مر جائیں یا کوئی درندہ انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ بھی ممکنات میں سے تھا کہ کوئی رحم دل غلام انہیں اپنالے۔ سات سال کی عمر میں بچے کی تربیت شروع ہو جاتی تھی۔ ان بچوں کو والدین سے الگ ہونا پڑتا۔ انہیں جسمانی ورزشوں کے ایک سخت امتحان سے گزرنا پڑتا۔ حسبِ اوقاف ان کے ساتھ ساتھ انہیں پڑھنا اور گانا سکھایا جاتا۔ زیادہ زور جسمانی طور پر نشیانی لڑنے، دوڑنے اور جنگ میں اسلحے کے استعمال پر دیا جاتا تھا۔ انہیں چوری کے طریقے بھی سکھائے جاتے اور انہیں باقاعدہ اس بات کی تربیت دی جاتی کہ وہ چوری کرتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو گرفتاری سے بچائیں اور اگر کوئی بچہ گرفتار ہو جائے تو وہ اقبالِ جرم نہ کرے۔

ان یونان لڑکیوں کو بھی حکومت کی نگرانی میں نہایت سخت ورزشوں سے گزارتے تھے اور باقاعدہ ان کے لیے ورزشوں کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ وہ صحت مند مائیں بن سکیں۔ یوں وہ بھی مردوں کی طرح فولادی اعصاب کی مالک بن جاتیں۔ وہ اپنے بچوں کو جنگ کے لیے بھیجتیں تو ان پر تمہارے لاش آئی چاہے۔ اہل سپارٹا نے زندگی کے ہر لمحہ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا لیکن زندگی کے ہر لمحہ سے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا جس کی بنا پر انہیں ایک طور سے وہ ہمیشہ پسماندگی کا شکار رہے۔

یونان ہی کی سرزمین تھی جہاں ایڈیٹر فارابی،

سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفر اور دانشور و حکماء پیدا ہوئے۔ اسی دھرتی پر فلسفہ پیدا ہوا مگر یہاں کی ایک ریاست ایتھنز میں چاندی کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر شدید مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ انہیں ذخیرہ میں جبر کر رکھا جاتا تھا۔ ان سے زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ارسطو جو بذاتِ خود ایک فلسفی تھا، وہ غلام کی یوں تعریف کرتا نظر آتا ہے۔

”مزدور ایک ایسا آلہ ہے جس میں جان ہو۔ یہ ایک مشین ہے، جس میں جان ڈال دی گئی ہے اور وہ تمام انسانی احساسات و شعور سے محروم ہے۔“

ایک دوسرا فلسفی افلاطون اسے پیچھے چھوڑتا ہوا یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

”اگر عوام الناس اور اہل فکر کے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور مقررہ وقت پر وہ پیدا نہ ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ بچہ جو جسمانی طور پر ناقص ہو، وہ لڑکا جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں، وہ کمزور مرد جس سے کوئی نفع نہیں وہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید نہیں (ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے) کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ اس مثالی شہر کے باشندوں کی تعداد اس سطح سے اوپر نہ ہو جن کی سعادت مندی کی ذمہ داری اٹھائی جاسکتی ہے۔“

یونان کا سب سے پہلا بادشاہ فلیس تھا جسے ٹھوڑے پائے کا شوق تھا بلکہ وہ ان کا عاشق تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام پائس اور بعض نے فلیٹوس بتایا ہے جو زیادہ مشہور ہے۔ اس نے سات سال تک یونان پر حکومت کی اور اسی کے بیٹے کا نام سکندر تھا۔

☆☆☆

سکندر کا باپ فلیٹوس ریاست مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ مشرق میں بابل سے اٹھ کر بخت نصر کے مصر، شام، عراق اور فلسطین کے علاوہ مغرب کے دور دراز علاقوں پر فوجی حملوں اور ان کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت سے قبل یونانی ملک فارس کو سلا اندر خراج ادا کیا کرتے تھے جس میں بے شمار قیمتی تحائف کے علاوہ مرغی کے انڈوں کی شکل میں ڈھلے ہوئے اتنے ہی وزنی، ہنر شدہ سونے کے سکے بھی ہوتے تھے اور اس خراج کے ساتھ اٹھارہ اطاعت کا مراسلہ بھی ہوتا تھا لیکن فلیٹوس کے بیٹے سکندر نے تخت پر بیٹھے ہی پہلے اپنے ارد گرد کی چھوٹی ریاستوں پر حملے کر کے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کیا۔



ان فتوحات کی وجہ سے اس کا حوصلہ بڑھا تو اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے کی خاطر پوری دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت فارس میں دارالابن دارا کی حکومت تھی جس نے فارس کی مختلف ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد ایک بار پھر ملک فارس کو عظیم الشان کامیابیوں سے روشناس کروایا تھا۔ سکندر نے فارس کی اس پرانی رسم کو توڑتے ہوئے خراج دینے سے انکار کر دیا۔ جب دارالابن دارا نے پہلی رسم کو دوبارہ سے جاری کرنے کا تقاضا کیا تو سکندر نے اسے لکھ بھیجا کہ وہ مرنے جو پہلے سونے کے انڈے دیا کرتی تھی، وہ مرنے لگی ہے۔

جب دارا کو یہ جواب ملا تو اس نے مقدونیہ پر فوج کشی کی دھمکی دی مگر سکندر نے 324 قبل مسیح میں ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ فارس پر حملہ کر دیا اور خراسان سمیت سارے فارس کو روند ڈالا۔ اس وقت سکندر کی فوج میں بحری بیڑے کے علاوہ چالیس ہزار جوان تھے۔ اس نے فارس کو فتح کرنے کے بعد دارالابن دارا کو قتل کر دیا اور اس کی بیٹی روخسہ سے شادی کر لی۔ اس شادی کے پیچھے بھی سکندر کا برسوں کا ایک خواب تھا۔ جہاں اس نے یونانیوں کو اہل فارس کے مستقل خطرے سے نجات دلائی، وہاں اس نے اپنی یونانی ثقافت کو فارس میں لانے کا بھی فیصلہ کیا اور دوسرے ہزاروں مقدونی شہریوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اہل فارس کے ساتھ رشتے دار یاں کر سب جس سے دونوں سلطنتوں کی ثقافتیں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ سکندر فارس کے بعد ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوا۔ دارالابن دارا فارس کے ہنانشیوں کے خاندان کا آخری فرماں روا تھا۔ اس کے بعد آشکانی برسر اقتدار آئے۔ سکندر نے افغانستان کو پامال کیا اور ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا۔ اہل علم کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ جب سکندر مقدونی اپنے دارالحکومت مقدونیہ اور اس کے گرد و نواح کے بحری و بری انتظام و استحکام سے مطمئن ہو کر اسکندر یہ پہنچا۔ اس نے وہاں عظیم عمارتوں اور سنگ رخام سے تعمیر کردہ چھوٹے بڑے میناروں کے آثار دیکھے۔ اس نے ان کے درمیان ایک ایسا سرخشاں مینار بھی دیکھا جو زمانے کی سختیاں جھیلتا ابھی تک سر اٹھائے اسکندر یہ کی عظمت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس مینار کی فرش منزل پر مسندی تحریر میں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی جو میریوں اور اہل مسیح سے بھی پہلے کے زمانے اور اسی زبان کے رسم الخط میں تحریر تھی۔

”میں شداو بن عاد..... ہوں۔ میرے ہاتھوں

ممالک کو قوت و پختگی حاصل ہوئی۔ میرے حکم سے بڑی بڑی چٹانیں اور پہاڑیاں کافی ٹکڑیوں میں بٹ کر باغ و بستان بن گئیں۔ اس باغ کی مثال ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس باغ میں دنیا کے نادر ترین درخت، پھول اور پھل داروں نے بیج کر دوں اور اس میں دنیا کے معزز ترین شریف لوگوں کو بسا کر انہیں ہر قسم کی آسائشیں مہیا کر دوں۔ میں نے اب تک جو چاہا اسے جلد از جلد حاصل کر لیا لیکن پھر مجھے اب رات کو نیند آتی ہے، ندوں کو سکون ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میری موت کا وقت اب قریب آچکا ہے۔ ویسے مجھے نہ کسی ظالم و مغرور بادشاہ کا خوف ہے، نہ مجھے کسی بڑے اور بہادر فوجی لشکر کا ڈر ہے لیکن پھر مجھی میں سمجھتا ہوں کہ میرے بڑھاپے کی وجہ سے میری بہت سی مہمات اور مقصد پورے نہیں ہو سکے لیکن مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ میں بہت سے قائل قدر آثار چھوڑے جا رہا ہوں۔ جو شخص میرے ان آثار کو دیکھے اور اسے میرے بھی طویل عمر اور گہری نظر حاصل ہونے کا اندازہ کرے کہ دنیا سرائے خالی ہے۔ اس میں کسی کو سکون و قرار حاصل ہو سکتا ہے نہ کسی اور بیشہ کی زندگی مل سکتی ہے لہذا اس دنیا سے جی لگنا نیکار ہے۔“

اس کے آگے شداو نے دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی مال و زر اور شاہی جاہ و جلال کی تابعداری کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا اور اپنی تحریر کے آخر میں بڑے والے کو دنیا کے مال و دولت کو پیشہ اور اس پر نظر رکھنے سے منع کیا اور لکھا کہ اسے اپنے آخر سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سکندر شداو کی تحریر کردہ اس عبارت کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کہاں تک اعتبار کرے۔ البتہ اس نے اسکندر یہ کے طول و عرض کی پیمائش کا حکم دے کر اس کے بعد وہاں کی نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ جس کے لیے اس نے مسد، سنگ رخام اور سنگ مرمر کے علاوہ دوسرے پتھر جزیہ سقہ، افریقہ کے گرد و نواح، اطریطش اور بحر روم کے ارد گرد جو علاقے بحر اوقیانوس کے قریب و جوار سے متصل ہیں منگوائے اور انہیں وہاں سے لانے کے لیے بڑی بڑی کشتیوں کا انتظام کیا۔ اس نے کچھ پتھر اور دوسرا سامان روڈس کے جزیرے سے بھی منگوا یا تھا۔ یہ جزیرہ اسکندر یہ کے بالکل سامنے ہے۔ سکندر کے ذریعے سے اسکندر یہ تک کا فاصلہ ایک رات کا ہے اور یہ یورپ کا پہلا آباد جزیرہ ہے جہاں بہت سے صنعتی ادارے قائم ہیں۔ یہیں اس زمانے میں جنگی جہاز بننے لگی اور رومیوں کی

کثرت ہے جو اس سمندری راستے سے اکثر اسکندر یہ اور مصر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ سکندر نے شداو بن..... عادی مندرجہ بالا تحریر کا اعتبار اور اس کی نصیحتوں و ہدایات پر عمل کیا یا نہیں کیا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اسکندر جو اس زمانے تک کسی خرابے کی شکل اختیار کر چکا تھا، اس کو نئے سرے سے بسانے کا ارادہ کیا۔ اور ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ جب اس نئے شہر کے چاروں طرف کھدائی کا کام شروع کیا تو اس نے اس کے گرد و نواح کی اونچی نیچی شاخوں کی باز گلوئی پھر اس باڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ٹکڑی کے موٹے موٹے ڈنڈے گڑوائے گئے اور ان کے سروں پر لوہے کی پتلی چکی سلاخیں کوا کر کٹھن لگوائے۔

سکندر نے مجوزہ نئے شہر کے درمیان اپنے قیام کے لیے پہلے ایک عمارت تعمیر کروائی مگر اس کے گرد اپنی فوج کے سرداروں اور سپاہیوں کے لیے چھوٹے بڑے عارضی مکان بھی تعمیر..... کروا دیے تھے۔ اس نے شہر کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ معماروں اور مزدوروں کے رہنے کے لیے کمرے بھی تعمیر کرا دیے تھے تاکہ انہیں شہر کے تعمیراتی کام پر پہنچنے کے لیے دیر نہ ہو سکے اور وہ جلد از جلد اپنے کام پر پہنچ سکیں۔ اپنی قیام گاہ کی محبت پر اس نے ٹکڑی کا ایک بیج بٹایا اور اس کے بیج کا حصہ ہر دی کی طرح ایک بڑی سی کھیتی لگا دی۔ اس کھیتی میں سوت کی موٹی سی دی بندھوائی جس کا ایک سرا اس نے اپنی خواب گاہ تک پہنچایا تھا اور اس دی کا بڑا حصہ اوپر سے باڑ کے ڈنڈوں میں لگائے ہوئے سب کٹھنوں سے گزرا اور جن میں چھوٹی چھوٹی کھیتیاں لگائی تھیں جو کہ اس عمارت کے چاروں طرف موجود تھیں۔ سکندر کا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی دن بیج سویرے مبارک گھڑی دیکھ کر اپنی خواب گاہ کی دی کا سرا سمجھنے گا۔ اس سے برج کی بڑی کھیتی بننے لگے گی اور اس کے ساتھ ہی دوسری کھیتیاں جو اسی کے طویل حصے میں لگائی باڑ سے بندھی ہیں وہ بھی بننے لگیں گی۔ اس طرح نئے شہر کی چار دیواری کی بنیادوں کے چاروں طرف ایک ہی وقت میں کام شروع ہو گئے گا۔ یہ بات معماروں اور مزدوروں کو پہلے ہی بتادی گئی تھی کہ جس مبارک گھڑی کھیتیاں بنیں، وہ کام شروع کر دیں تاکہ ایک ہی وقت میں کام شروع ہو سکے لیکن قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ ایک دن بیج ہی بیج سکندر کے بیدار ہونے سے پہلے ایک کو اس دی پر آ بیٹھا جو اس کی خواب گاہ لگ جاتی تھی۔ کوہے کے ادھر ادھر پھد کٹنے سے نہ صرف

برج کی بڑی کھیتی بلکہ اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چھوٹی کھیتیاں بھی بننے لگیں۔ سکندر بڑا کر اٹھا۔ عمار اور مزدور بھی بولگھا کر اٹھے اور اپنے کام میں جت لگے۔ سکندر نے یہ ماجرا دیکھتے ہوئے فوراً دوسرا حکم دیا کہ ابھی بنیادوں کا کام شروع نہ کیا جائے۔ اس دوسرے حکم پر شہر کے عام لوگوں کے علاوہ معمار اور مزدور بھی حیران ہوئے لیکن بادشاہ کا حکم سر آٹھوں پر سمجھ کر کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ان احکامات کے بارے میں پوچھ سکے۔ سکندر بھی پہلے تو خاموش رہا لیکن اگلے ہی دن نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ ایک جگہ نئے شہر کی بنیاد کا پتھر لگایا اور عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا مگر جلد ہی اسے اپنی فکری معیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ عمارتیں بننا شروع ہوئیں مگر عمارت دن بھر میں جتنی جتنی رات کو وہ گرا دی جاتی۔

سکندر جو اپنے استاد اسطرگ کی طرح ذہانت و تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس بات پر غور کرتا رہا کہ آخر ان عمارتوں کو گرا کر کون ہے۔ کون ہے جو رات کو یہ کارروائی انجام دیتا ہے کہ وہ دن بھر کی بنائی ہوئی عمارتوں کو رات میں گرا جاتا ہے۔ کئی کئی سو اتر اسی طرح ہوتا رہا تو سکندر نے ایک رات جاگ کر اس کا کھوج لگانے کا سوچا۔ پھر ایک رات وہ جاگتا رہا تو اس نے دیکھا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد عجیب و غریب شکلوں کے قد کاٹھ میں اٹھنے اور مضبوط جسموں کے مالک چوبائے سمندر سے نکلے اور دن بھر میں جو عمارتیں تیار ہوتی تھیں، انہیں توڑ پھوڑ کر وہیں سمندر میں حل کر دیتے۔

سکندر بھی اپنی ذہن اور ضد کا پکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ہر حال میں اس نئے شہر کو بسانا ہے۔ اس لیے اب اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس نئی معیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک نئے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے شیشے کا ایک مضبوط تابوت بنوایا۔ اس کے پینڈے پر تانبے یا کسی ایسی دھات کی موٹی چادر چڑھوائی جو تابوت کو سمندری ٹھیکات اور لہروں کی شکست وریخت سے محفوظ رکھ سکے اور اوپر بڑی دو آتی بھی اور ایسی مضبوط نالیاں لگوائیں جن کے ذریعے تابوت میں ہوا تو جاکے مگر پانی نہ آسکے اور اگر یہ تابوت سمندر کی گہرائی میں تنگ بھی چلا جائے تو نالیاں سطح آب سے اوپر رہیں۔ یہ سارے ضروری اور حفاظتی انتظامات کر کے وہ اس تابوت کو دو کشتیوں پر ادھر ادھر رکھ کر سمندر میں دو رنگ لے گیا پھر خود تابوت میں لیٹ











اور ساری جاکہ ادھی اپنے گھنے میں کر لی۔ اردوان کی اس حرکت سے اردشیر پر اس کے گھنے کی قلمی بھی کھل گئی۔ اس نے اردشیر کے بھانے فارس کا گورنر اپنے بیٹے کو بنا دیا۔ جب پہلی بار اردشیر کو احساس ہوا کہ اب اس کا اردوان کے پاس رہنا فضول ہے۔ اسے جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اردشیر کتنے ہی دن اس بات پر غور کرتا رہا کہ وہ کس طرح اور کس وقت یہاں سے بھاگے۔ داروغہ اصطبل کی ڈیوٹی دیتے ہوئے اسے کتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا کہ اس کے بھانے کا ہندوستان نہ ہو سکا تھا۔ اپنے طور پر اس نے بہت کوشش کی لیکن اردوان کے وفادار دیگر لوگوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ خوش نواز اردوان کی ایک خاص کنیز بھی تھی اس نے شخص اردشیر کی نگرانی کے لیے اصطبل میں ڈیوٹی دے رکھی تھی۔ وہ دن میں ایک دوسری اصطبل میں چکر لگاتی اور پھر واپس چلی جاتی۔ یقیناً وہ واپس جا کر اردوان کو سب اچھا کی رپورٹ دیتی ہوگی۔ ایک رات اردشیر جب سوئے کی تیاریوں میں تھا اور تینہ ابھی اس سے کوسوں دور تھی، تب اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ اگر اسے اردوان کے اس قید خانے سے نکلنا ہے تو اسے اردوان کی کنیز خاص سے مدد لینا ہوگی۔

اگلے ہی روز اردشیر نے خوش نواز کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ پہلے تو وہ اس سے گفتگو ہی نہیں کرتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی چنگی چڑی باتوں میں آ گئی۔ ”تمہاری بھی میری طرح اس اصطبل میں ڈیوٹی ملتی ہے؟“ ایک روز اردشیر نے اس سے پوچھا۔ ”بس یہی جان لو.....“ خوش نواز نے جلدی سے جواب دیا اور دوسری طرف نکل گئی۔

”مجھے تو میرے نانے اپنے ہاتھوں اس دربار میں بھجوا دیا تھا لیکن تم.....“ اردشیر نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اور مجھے میرے گھروالوں کی مجبوریوں نے یہاں لا ڈالا ہے۔ دیے مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ میں جس طرح اصطبل میں آتی ہوں، اسی طرح میں دربار اور محلات میں بھی آ جا سکتی ہوں۔“

”سمجھ نہیں آتا۔ بادشاہ ساری دنیا کی خوبصورتیاں اپنے ہی پاس کیوں اکٹھی کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اب دیکھو تم جو تیلوں کی طرح خوب صورت اور نازک ہو، تمہیں نہ جانے کیوں اپنے ارد گرد رکھا ہوا ہے۔ تمہیں تو کسی بادشاہ کی بیوی ہونا چاہیے۔“ اردشیر نے اس کی

تعریف کر کے اپنے جال میں لانے کی کوشش کی کیونکہ اردشیر کو علم تھا کہ چالپوسی اور تحریف ہر انسان کی کمزوری ہے۔ اردشیر بھی یہی حربہ خوش نواز پر بڑی ہنرمندی سے آزما رہا تھا۔

پھر اسے جلد ہی کامیابی بھی مل گئی۔ اب خوش نواز اصطبل میں آتی تو درتیک اردشیر کے ساتھ کپ شپ میں مصروف رہتی۔ آخر ایک روز خوش نواز نے خود ہی اس سے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم فوجوان ہو، خوب صورت بھی ہو، طاقت ور اور دلیری کتنے ہو پھر بادشاہ کی قید میں کس طرح دن گزارتے ہو۔“

”میرے پاؤں کی اصل زنجیر میرے نانا حضور پاک تھے۔ میں یہاں ساری عمر اپنا جوں کی طرح گزارنے کوئیں آیا۔ نانا جان کچھ روز پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ اردشیر نے اسے بتایا۔

”بہت مشکل ہے پر دیکھ..... اردوان بہت ہوشیار آدمی ہے۔ تم خود کو اس کی نظروں سے دور رکھتے ہو مگر جان لو کہ اس کی نظر میں ہر وقت تم پر ہوتی ہیں۔ مجھے تم جیسے خوب صورت اور دلیر فوجوان سے ہمدردی ہے۔ اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کا کیا ارادہ کر لیا ہے تو اس کی ایک صورت ہے۔“ خوش نواز نے مسکراتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔ ”کون سی صورت ہے..... میں اپنی آزادی کے لیے ہر کام کر سکتا ہوں۔“ اردشیر نے جلدی سے جواب دیا۔ ”میں تمہیں یہاں سے نکال دیتی ہوں مگر اس کے لیے میری بھی ایک شرط ہے۔“ خوش نواز نے اسی دلفریب انداز سے کہا۔

”مجھے بتاؤ تمہاری کون سی شرط ہے۔ میں تمہاری ہر شرط اپنی آزادی کے لیے ماننے کو تیار ہوں۔“

”میرے ساتھ شادی کرو گے.....؟“ خوش نواز نے فوراً جواب دیا۔ ”تمہیں ایک اور بات بتاؤں، ابھی کل ہی شاہی نجومی باتوں میں بادشاہ حضور کو بتا رہا تھا کہ اگر اسی ہفتے اردوان کا کوئی خاص ملازم فرار ہو جائے تو وہ ملک فارس کے تخت و تاج کا مالک بن جائے گا۔ میں اسی وقت سے یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں وہ ملازم تم ہی تو نہیں ہو.....“ خوش نواز نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

تب پہلی بار اردشیر کو محسوس ہوا جیسے اب اس کی آزادی کے دن آ پہنچے ہیں۔ ”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے.....“ اردشیر نے

جواب دیا تو خوش نواز جھوم جھوم مئی۔ ”ٹھیک ہے ہر آج رات کو تیار رہنا۔ میں کسی بھی وقت تمہارے پاس آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے کر نکل جاؤں گی۔“ خوش نواز نے اردشیر کے گال چمکتاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

اس رات وہ اسی شخص دشت میں جا ملتا رہا کہ ہو سکتا ہے خوش نواز اپنا وعدہ بھول جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو مکمل نہ کر پائے۔ اس کی آنکھیں نیند سے بھول ہو رہی تھیں مگر وہ جاگ رہا تھا۔ بالآخر جب صبح کی سپیدی اپنی آنکھیں کھولنے لگی تو خوش نواز بڑی آہستگی سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اس تک پہنچی۔

”جاگ رہے ہو..... تو جلدی سے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ.....“ خوش نواز نے اس کے نزدیک آ کر آہستگی سے کہا تو اردشیر فوراً اٹھا اور اس کے ساتھ ہو گیا۔

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اردوان کے محل سرائے سے تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ لگتا تھا جیسے کوئی ان کی طرف آ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد ایک گھڑ سوار ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ”کہاں سرگئے تھے..... اتنی دیر لگا دی۔“ خوش نواز نے تنہی سے پوچھا۔

”بادشاہ سلامت کو آپ کے بھانے کی خبر مل گئی ہے۔ انہوں نے چار ہزار سپاہیوں کا لشکر آپ کو ڈھونڈنے پر لگا دیا ہے اس لیے مجھے نکلنے میں دیر ہو گئی۔“ گھڑ سوار نے جواب دیا۔

خوش نواز نے اسی لمحے بڑی پھرتی کے ساتھ اردشیر کی کر میں لگی تو ارکائی۔ اس سے پہلے کہ اسے اپنے بچاؤ کا خیال آتا، اس نے تیزی کے ساتھ اس کا سرا ڈال دیا۔

”حرا حرا..... مجھ سے محبت کے بھی گن گاتا تھا اور شاہ کی وفاداری کا بھی پاس رکھتا تھا۔ ہمارے بھانے کا صرف اس کو علم تھا، اسی نے بادشاہ کے آگے خبری کی ہوگی۔“ خوش نواز نے سنجیدگی سے کہا تو اعدا اردشیر کے منہ سے نکلا۔

”اف پار تھا کی دلیر اور بہادر عورتیں!“

وہ دونوں بھاگ کر اصطبل میں آ گئے۔ اردوان انہیں پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ پاک کے سرداروں نے جب ناکہ اردشیر واپس آ گیا ہے تو وہ تمام اموال اور املاک اس کی تحویل میں دینے کو آگئے اور سب نے اس کے سامنے حاکم و قادیاری اٹھایا اور اردوان کے بیٹے کو شہر اصطبل سے نکال دیا۔

اصطبل پر قبضہ کرنے کے بعد اردشیر نے ارد گرد کی ریاستوں کے سرداروں کو خطوط لکھے کہ اس کی اطاعت قبول کر لی جائے اور اسے تادان کی باقاعدہ ادائیگی کی جائے ورنہ وہ اپنے لیے برے وقت کا انتظار کریں۔ کچھ سرداروں نے اطاعت قبول کر لی۔ بعض نے انکار کر دیا اور بعض غیر جانبدار رہے۔ اردشیر نے بہت جلد ان ریاستوں کو زیر کر لیا جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ابھی وہ ان کاموں سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دارالبحر و میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ اردشیر نے اس بغاوت کے ساتھ بڑی سختی سے نپٹا اور بعد میں فارس کے صوبے پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب اس ہم سے فارغ ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے کے لیے شہر کرمان پر فوج کشی کی اور شاہ کرمان و لکش کو گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ ساحل خلیج فارس کو بھی فتح کر لیا۔ صوبہ فارس اور کرمان کو مکمل طور پر فتح کرنے کے بعد اس نے فیروز آباد میں ایک محل اور آتش کدہ تعمیر کرایا۔

اردشیر نے دوسرے سرداروں کے ساتھ ساتھ اردوان کو بھی اپنی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی تھی لیکن اردوان نے اس کا بڑی حقارت سے جواب دیا اور ساتھ ہی خوزستان کے شاہ کو حکم بھیجا کہ وہ اردشیر سے لڑنے کے لیے جائے اور اسے زنجیروں میں بکڑ کر سونوں لائے۔ اس بات کا اردشیر کو بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے خوزستان کا شاہ اس پر چڑھائی کرتا اس نے خوزستان پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دینے کے بعد شاہ ہوات پور پر حملہ کر کے اسے بھی شکست دے کر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے دریا کے دجلہ کے دہانے پر قائم ایک چھوٹی سی ریاست مصمین کو فتح کر لیا۔ اس وقت اس ریاست پر عمان کے عربوں کا قبضہ تھا جو ان عربی قبائل کے بیٹرو تھے جنہوں نے اسی زمانے میں حیرہ میں اپنی حکومت قائم کی ہوئی تھی۔

ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اردشیر نے اردوان پر حملہ کر دیا۔ اردوان اس وقت ”وئیل“ میں مقیم تھا۔ بڑے سخت مقابلے کے بعد اردوان محصور ہو گیا۔ محاصرہ اتنا بڑھا کہ اہل شہر کا کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور وہ بھوک سے مرنے لگے۔ جب اردوان نے یہ صورت حال دیکھی تو شہر سے باہر نکلا اور ہر مزدگان کے میدان میں بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اردوان اس لڑائی میں مارا گیا۔ بعض تاریخ داں کہتے ہیں اس نے محاصرے سے نکل آ کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کے بعد اردشیر 28 اپریل 224



دیا۔ مشہور تاریخ دان طبری کے مطابق شاہ پور نے اصل میں ساسانی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ تخت نشین ہوتے ہی شاہ پور اول کو اس کے والد اردشیر کی وصیتیں اور کتابیں ملیں۔ جو اردشیر کے ساتھیوں اور رفقاء کے کارے یا اس اہم تک محفوظ پڑی تھیں۔ اردشیر نے اپنے بیٹے کو جو خصوصی وصیتیں کی تھیں، ان میں تھا۔

”اے بیٹے..... یاد رکھ کہ دین اور ملک دو بھائی ہیں۔ کسی بادشاہ کے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بے نازی کا برتاؤ کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ کسی ملک کی اساس ہوتا ہے اور ملک دین کا محافظ..... جس ملک کی بنیاد نہ ہو، وہ برباد ہو جاتا ہے اور جس چیز کا کوئی محافظ نہ ہو، وہ ضائع ہو جاتی ہے..... اس لیے تمہارے لیے میری وصیت ہے کہ دونوں کی ہر حال میں حفاظت کرو۔“

اپنے بیٹے کو وصیت کرنے کے ساتھ ساتھ اردشیر نے اپنے ملک کے بڑے اور مشہور لوگوں کو جو خطوط لکھے، وہ بھی پند نصائح سے بھر پور تھے۔ اس نے اپنی رعایا کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

”ملک الملوک (شہنشاہ) کی طرف سے ان لوگوں کی جانب جن کے سپرد ملکی انتظامات ہیں۔ ان دانشوروں اور علماء کرام کی جانب جو مذہب کے ستون ہیں اور ان لوگوں کی جانب جو ملکی تعمیر کے ذمے دار ہیں۔ ان جنگی سرداروں کی طرف جو جنگی اصولوں اور موقع محل کو سمجھتے اور ان پر عبور رکھتے ہیں۔ تم سب پر سلامتی ہو۔ واضح رہے کہ ہمارا شمار اب نیک بندوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی رعایا کے بہت سے امور کو اپنی ملکی اور اپنے (خدا داد) عروج ہی کی بنا پر ترقی دی ہے۔ اب ہم تمہیں بطور نصیحت (وصیت) جو کچھ بتا رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں، اسے گہرے میں باندھ لو۔ آپس میں کبھی تفرق بازی نہ کرو کیونکہ اس سے دشمن تم پر غالب آ جائیں گے۔ اخراجات میں حد سے نہ کرو، ورنہ تنگ دست ہو جاؤ گے۔ مسافروں کو پناہ دو اور ان کی مدد کرو جس کا اجر تمہیں آخرت میں ملے گا۔ ازدواجی سلسلہ اپنے عزیز واقارب ہی میں رکھو کیونکہ وہ کسی لحاظ سے تم سے قریب تر اور اس کے حق میں ہیں۔ دنیا ہی کے نہ رہو کیونکہ دنیا کی کا ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ نہ اسے ترک کرو کیونکہ زندگی کے لیے ہی ناگزیر نہیں بلکہ دنیاوی اعمال ہی آخرت میں وسیلہ نجات بنتیں گے۔“

مؤرخین کے مطابق اردشیر بہت ذریعہ عادل اور اپنی رعایا کے آرام کا طلب گار تھا۔ اس کا ایک قول ہے جو

اردشیر کا قول تھا کہ شرافت و نجابت سے معاشرہ سنورتا اور گھرتا ہے جبکہ بد اعمالیوں اور شریکداری سے اس کی بڑائی کو نقصان پہنچتا ہے۔ گندے اذہان کے مالک لوگوں سے معاشرہ بھی بربادیوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

اردشیر ہی کا کہنا تھا کہ بادشاہ کے لیے لازم ہے کہ عدل و انصاف کے ذریعے لوگوں کو فیض پہنچائے کیونکہ عدل و انصاف ہی ایک ایسا قلعہ ہے جو مملکت کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھتا ہے۔ بزرگوں کو احترام دینی مذاہن سے پناہ چاہیے۔ بادشاہوں کے درباری اور سامعی صورت و شکل سے مہذب و منسوب ہوں۔ صاف ستھرا لباس رکھتے ہوں جس سے دوسروں کی نگاہیں خوشی اور فخر محسوس کریں۔ آداب گفتگو اور موقع محل سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اشاروں اور کتابوں کو سمجھیں اور اخلاقی جمیل سے دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔ اردشیر نے بارہ سال مسلسل اردگرد کی ریاستوں سے جنگ کر کے انہیں زیر کر لیا تھا جس سے دوسرے سرکش و باغی حکمران بھی اس کے اطاعت گزار بن گئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے اردوان کو قتل کیا تھا اور سب سے آخر میں ایک خود ساختہ ملکی بادشاہ کو فتح کیا تھا جو عراق میں تھیں بن نبیرہ کے مقام پر تخت نشین ہو کر خود کو شہنشاہ کہلانے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ پور ساسانی حکمران اردشیر کا بیٹا تھا جو اردشیر کے بعد اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اردشیر نے آٹھ کئی خاندان کی ایک شہزادی سے شادی کی جس کا نام ارسامید تھا، جسے لیڈی امیراڈ بھی کہتے تھے۔ جس کا ذکر یہودیوں کی کتاب تالمود میں افراہمز کے نام سے موجود ہے۔ یہ نہایت خوب صورت اور ذہین عورت تھی جو شاہ اردوان کی بیٹی یا اس کے چچا کی لڑکی تھی۔ ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ اردوان کے لڑکے فرخاں کی بیٹی تھی، اردشیر کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے خود کو آٹھ کئیوں کا جائز وارث ثابت کرنے کے لیے آٹھ کئی خاندان میں ضرور شادی کی ہوگی۔ شاہ پور اسی آٹھ کئی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور اسے اردشیر نے اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ شاہ پور اول 241ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے بیستیس سال حکومت کی۔ یہ بد اخواب صورت اور دلیر تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے گرد و پیش کے ممالک کے ساتھ بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ اس کے زمانے تک پارھیا دالوں نے ملک فارس کی بہت سی ریاستوں اور صوبوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ شاہ پور نے اپنے والد کے ساتھ پارھین کے خلاف جنگ لڑی اور انہیں تہ تیغ کر کے رکھ

رکھے تھے جنہیں زرتشت کے تین بیٹوں نے ذالی تھی۔ آذر فرنگ مذہب کے عالم دین کی آگ تھی۔ آذر گھنٹ پانیوں کی آگ یا آتش شامی تھی اور آذر برزین مہر زراعت پسند لوگوں کی آگ تھی۔ ملک فارس میں ایک مخصوص قبیلہ ”ماگی“ کو مذہبی اجارہ داری حاصل تھی۔ تمام اوراد میں مذہبی پیشوا کی کا حق صرف اسی خاندان کے پاس رہا۔ پروفیسر آرتھر لکھتا ہے۔

”جس یا مغاں اصل میں میڈیا کے ایک قبیلے یا اس قبیلے کی ایک شاخ یا خاص جماعت کا نام تھا جو غیر زرتشتی اور مزدائیت کے عالم دین پر مشتمل تھا۔ جب مذہب زرتشت نے ملک فارس کے مغربی علاقوں کو تسلیم کیا تو مغاں، اصلاح شدہ مذہب کے بڑے بن بیٹھے۔ اوستا میں یہ عالم مذہب آذر وان کے قدیم نام کے علاوہ شمار ہوتے تھے لیکن آٹھ کئیوں اور ساسانیوں کے زمانے میں وہ معمولی بخ کہلاتے تھے۔“

ملک میں جاگیر دارانہ نظام ہونے کے سبب یہ مذہبی قیادت بھی ایک خاص قبیلے کے افراد سے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے خدمات کے صلے میں امراء کو بڑی بڑی جائیدادیں بخشی جاتی تھیں اس لیے یہ دونوں گروہ ملک میں با اثر اور مقتدر شمار کیے جاتے تھے۔ آٹھ کئیوں کے پاس صرف مذہبی قیادت ہی نہیں بلکہ بڑی بڑی جائیدادیں کے مالک بھی تھے۔ مذہبی قائد کا انتخاب ہمیشہ قبیلہ مغاں سے ہوتا۔ آذر یا مغاں مغلوں کا ملک سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ان لوگوں کی زرخیز زمینیں اور پرفضا مکانات تھے۔

پارتھیا کے آخری ایام میں مغلوں کی اجارہ داری جب ختم ہوئی تو ان کی انیمیت بھی ٹھٹھ گئی۔ یہاں تک کہ ان سے بڑی بڑی جائیدادیں چھین لی گئیں۔ ان کے آتش کدے ویران ہو گئے اور کربان گاہیں منساں لیکن ساسانی خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد اردشیر نے ان کو وہ پہلا مقام دے دیا اور ان کی مذہبی بالادستی اور اجارہ داری کے ساتھ ساتھ ان کی امارت اور خوشحالی کا دور بھی واپس آ گیا۔

اردشیر نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے ملک میں قدیم طبقاتی تقسیم کو از سر نو مرتب کیا۔ پہلا طبقہ اس کے درباری عالموں، دانشوروں اور مملکت کے مشیروں کا تھا۔ دوسرا طبقہ ملک کے مختلف صدر مقامات پر گورنروں اور سرحدی شہروں کے حاکموں اور نگران افراد پر مشتمل تھا۔ تیسرے طبقے میں وہ لوگ شامل تھے جو اس کے دربار میں شریطانہ انداز میں تقریبات اور رواج کی تسکین کا سامان فراہم کرتے تھے۔

کو اردشیر فاتحانہ طور شہر میں داخل ہوا۔ طیسفون کی فتح کے بعد اردشیر نے اپنے لیے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور دم تاج پوشی ادا کی گئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ سارے فارس پر قابض ہو گیا۔

اردشیر نے اپنے دور حکومت میں اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے بہت سے کام کیے۔ عبادت گاہوں کی تعمیر، نہریں نکالنے اور نئے شہروں کی آباد کاری اس کے خاص مشغلے تھے۔ وہ جو بھی ناخبر لبسا، یادگار کے طور پر اس کے ساتھ اردشیر کا اضافہ ضرور کرتا۔ اس نے پرانے سلیو کی جس کو 165ء میں رومن سپہ سالار اورینٹس کیسوس نے تباہ و برباد کر دیا تھا، اسے اپنے نام اردشیر سے دوبارہ آباد کیا۔ اس کے علاوہ خوزستان میں شہر ہزار اردشیر کے نام سے آباد کیا۔ آٹھ کئیوں کی شکست کے بعد اہل روم یا یہ بات واضح ہوئی کہ مشرق میں ایک نئی سلطنت کا ستارہ طلوع ہو رہا ہے جس کی جنگی طاقت ناقابلِ تنصیر ہے۔ اردشیر نے ایگزینڈر سلیو دس کو اپنی شکست فاش دی کہ تمام پارٹینی سلطنت میں صاف ماتم بھیج گئی۔ رومیوں کو جتنی ذلت آمیز شکست اس جنگ میں ہوئی، آج تک نہ ہوئی تھی۔ اس سے پارٹینی سلطنت کے وقار اور جاہ و جلال کو سخت صدمہ ہوا۔ اردشیر نے سترہ سال حکومت کی اور وہ 241ء میں فوت ہوا۔ یہ اعلیٰ درجے کا جرنیل اور منتظم بادشاہ تھا۔ اس نے رومیوں کو شکست دے کر ملک فارس کا لوہا منوایا اور عسکری قوت کا وہ دہ پر اور عرب قائم کیا۔

اس نے ساسانی خاندان کی حکومت کی بنیاد 226ء یا 227ء میں اپنی شہنشاہیت کے ساتھ رکھی۔ اس نے ایک بار پھر سے زرتشتی مذہب کی ترقی و ترویج کے لیے کام کیا جس کی وجہ سے ساری قوم ایک بار پھر سے زرتشت مذہب کی پیروکار بن گئی مگر خود اس نے زرتشتی مذہب کو قبول نہ کیا بلکہ اس نے زرتشت کے صرف ان نظریات کو قبول کیا جس کی نمائندگی عبادت گاہوں کے کاہن کرتے تھے۔ جس میں آگ کی عبادت سرفہرست تھی۔ اس بدلے ہوئے مذہب کی حمایت اور تحفظ کا بیڑا اردشیر اول نے اٹھایا۔

سلطنت ساسانی میں ہر جگہ اور ہر شہر میں آتش کدے موجود تھے لیکن ان میں سے تین ایسے تھے جن کی خاص حرمت اور تعظیم ہوتی تھی۔ یہ وہ آتش کدے تھے جن میں قدیم زمانے کی آگ موجود تھی۔ ان میں آذر فرنگ، آذر گھنٹ اور آذر برزین مہر تھا۔ زرتشتیوں کے نظریے کے مطابق یہ تین آگیں ان تین معاشری طبقوں سے تعلق





ماہ آزادی کی جوشیلی تیاریاں  
جاسوسی کی سنسنی خیز کہانیاں

### اولین صفحات

حسین چروں کا ساتھ ہو تو زندگی کی رنگینی بڑھ جاتی ہے اور رنگینی منظر رہتی ہے۔

ہمایوں بلگرامی کے قلم سے پر فریب داستان

### انگاریے

دشمنوں کے قتلے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصن میں آگے بڑھتا

ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

### آوارہ گرد

چلیپلائی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پکارو جوان کی سرگزشت

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

### سورق کے رنگ

آزادی کی تڑپ اور چاہ میں جاں نثار گردیے والوں کا فسانہ

پہاڑوں میں گھری ایک دادی کے دلکش مناظر میں خون میں ڈوبی سنسنی خیز داستان

### جینی نکتہ جینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...  
کھاتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

اکساتا اور ملک میں تختہ و فساد کی آگ بھڑکانے کی جرأت کرتا لیکن اس سے ایسی خرابیاں بھی نمودار ہوئیں جو ملک فارس کی ترقی کی راہ میں بھاری پتھر ثابت ہوئیں۔ بادشاہ اپنے آپ کو آمر سمجھنے لگے۔ ان کی کسی بات پر اعتراض کرنا ایسا جرم تھا جس کی سزا قتل تھی۔ تاریخ پٹری میں درج ہے۔

”جدید ہندو مت اور اصلاح مالیات پر غور کرنے کے لیے خسرو نے ایک کونسل منعقد کی اور دیر خوراک کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں بہ آواز بلند پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے دودھ حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ سب چپ رہے۔ بادشاہ نے تیسری بار پوچھا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ چلے گا کہ آیا بادشاہ کا یہ منشا ہے کہ نا پائیدار چیزوں پر ٹیکس لگائے۔ تیرا یہ حکم کچھ مدت گزرنے کے بعد حکم دے انسانی کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس پر بادشاہ لاکڑ کر بولا کہ اسے مرد ملھوں و گستاخ... تو کون لوگوں میں سے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں دیہیوں (کا جوں) میں سے ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قلعہ انوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو۔ اس پر ہر ایک دیہی نے اپنے اپنے قلعہ ان سے اسے مارنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ بھاگ کر مر گیا۔ پھر بعد سب نے کہا، اسے بادشاہ جتنے قلعہ انوں کو قتل کرنے کے لیے بھیجے گا، وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں۔“

شاہ پور اول کی تربیت اس کے والد ارشیر نے بڑی خوب صورت کی تھی۔ اس لیے اس میں اکثر عادات ارشیر دلی ہی تھیں۔ یہ اسی کی طرح اپنی رعایا کے لیے رحم دل تھا۔ شاہ پور نے تخت نشین ہوتے ہی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کا قطعی طور پر قلع قمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے نصیبن پر چڑھائی کا پروگرام بنایا۔ نصیبن کا شہر یونان کے اسکندریہ کے قریب رودی سرحد کا آخری شہر تھا۔ نصیبن ہی وہ شہر تھا جس میں سب سے پہلے قلعہ کا منصوبہ بڑھایا جاتا تھا۔ اس میں موسیقی اور سائنسی علوم کی ابتدا کی گئی تھی۔ رومیوں نے نصیبن پر حملہ کیا اور اسے راج کرنے کے بعد شام کی طرف بڑھے۔ اس وقت گورڈین سوم روم کا بادشاہ تھا۔ اس نے ساسانیوں کے خلاف سونا اور فوج اکٹھی کی۔ اس وقت شاہ پور خوارزم کی جنگ میں مصروف تھا اور وہ گیان کی رنج کے لیے برسرِ پکار تھا۔ جب رودی بادشاہ گورڈین کو اس کی اطلاع ملی تو اچانک رودی

یہ مانی کی مصوری ہی کی دین تھی کہ اس کے بعد ملک فارس میں تصاویر بنانے اور نقش و نگار بنانے کا فن رواج پا گیا۔ خود خاندان ساسان کے کئی بادشاہوں نے بڑی بڑی چٹانوں پر اپنی ایسی تصاویر بنائی ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ امورا مزدا (خدا) اسے منصب شاہی عطا کر رہا ہے۔ اسی دور میں دیواری تصاویر میں کئی جگہ دیوتا بادشاہ کو انگوٹھی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تصویر میں امبرن مزدا کے ہاتھ میں انگوٹھی دکھائی گئی ہے جو وہ بادشاہ کو دیتے والا ہے۔ انگوٹھی بادشاہ کی قوت اور اعتبار کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ یہ دستخط کے بجائے استعمال کی جاتی تھی۔

اس طرح کی بے شمار تصاویر ملک کے مختلف علاقوں میں کثرت میں اور ان کے پیش نظر دیگر مقاصد کے علاوہ اہل فارس کے ذہنوں میں یہ نقش ثبت کرنا ہے کہ ان کے بادشاہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ حکمرانی و سلطانی کے یہ اختیارات انہیں امورا مزدا نے اپنے ہاتھوں سے دیے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان سے چھین نہیں سکتی۔ بادشاہ کی غیر مشروط فرمانبرداری اور اطاعت و تحقیقت امورا مزدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اس طرح ساسانی بادشاہوں نے رعایا کی طرف سے طاعت و بغاوت کا پیمانہ کرنے کے تمام امکانات کو ختم کر دیا۔ کیونکہ بادشاہ کے خلاف تو کوئی بھی بغاوت کا پرچم بلند کر سکتا ہے لیکن امورا مزدا کے خلاف بغاوت کرنے کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس طرح ساسانیوں نے اپنی سلطانی کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ نیز یہ تصور بھی اپنی رعایا کے دلوں میں پختہ کر دیا کہ بادشاہی ساسانی خاندان کے افراد ہی کے لیے ہے۔ جب بھی ایسا ہوا کہ ساسانی خاندان کے علاوہ کسی نے خاندان حکومت کا تاج پہننے کی جسارت کی تو اس کی تمام صلاحیتوں کے باوجود قوم نے اسے ٹھکرایا اور تاج آرام کا سانس لیا جب اس کو تہ تیغ کر دیا۔

تخت شاہی حاصل کرنے کے لیے جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں، ان میں دونوں طرف ساسانی خاندان کے ہی افراد تھے۔ اس سیاسی نظریے کے چند فوائد بھی تھے کہ سلطنت کو استحکام میسر آیا اور ہر ایریا بغیر سے کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ حکومت کے حصول کے لیے عوام کو

زبان زد عام ہے۔  
”فوج کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہو سکتی۔ مچے کے بغیر فوج نہیں رکھی جاسکتی۔ زراعت کے بغیر پیسا نہیں مل سکتا۔ انصاف کے بغیر زراعت کا مایاب نہیں ہو سکتی۔“  
شاہ پور نے اپنے دور حکومت میں بہت سے قلعے تعمیر کیے۔ بستیوں اور شہر تعمیر کیے۔ بجائے کتنے ہی ترقی کے نام پر کام کیے۔ مانی نے اسی کے زمانے میں شہرت پائی۔

فارسی کی روایات کے مطابق یہ ایک قدیم اٹھارہ مسموری حیثیت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ روایات کے مطابق مانی کا تعلق چین سے تھا۔ اس نے زرتشت کے مسلک سے فائدہ اٹھا کر اور دوسرے مذاہب اور دین سے فائدہ اٹھا کر ان کے افکار اور تصورات میں ترکیب کر کے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ بات واضح ہو گئی کہ اولیٰ روایات عیسوی جوت نہیں ہوتیں۔ مانی اور اس کے مذاہب کا تعلق مصوری سے بھی تھا۔

مانی کے مطابق جب دنیا وجود میں آئی تو اس کے دو جوہر اصلی تھے جن کی بنیاد پر دنیا بنائی گئی۔ ایک نیک اور ایک بد۔ نیک جوہر کو زردان کہتے ہیں اور دوسرے کو جوہر ظلمت کہا جاتا ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے یہ دونوں جوہر آپس میں برسرِ پکار ہیں۔ جب تک کائنات باطل فتنہ ہوگی نور امیرش ظلمت سے رہا نہ ہوگا۔ مانی اپنے دین کی تبلیغ تھاہر اور دھڑکے ذریعے کرتا۔

مانی کے مسلک کو بڑی کامیابی ہوئی۔ چنانچہ شاہ پور اول اس کا پیروکار ہو گیا اور مانی نے اپنی تصنیف ”شاہ پورگان“ اس سے منسوب کی مگر کچھ ہی عرصے کے بعد مانی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس عرصے میں... اس نے ہندوستان اور چین کی سیاحت کی۔ مانی نے اپنے نئے مسلک کی ترقی کے لیے ہر نئے ماحول میں نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا مذہب پوری دنیا میں پھیل جائے۔ اس لیے اس نے اپنی تعلیم کو مختلف مذاہب کے ساتھ موافق اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

مانی ازم سے متعلق جو تحریریں اور تصویریں ملتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلک رکھنے والے صورت سنہرا کام بڑی مہارت سے کرتے تھے چنانچہ کم و بیش تمام تصویروں میں سونے کا پانی یا برادہ استعمال کیا گیا ہے۔ سنہری کام کی یہ روایت مانوی و ہستان فن سے مخصوص ہے۔



شہنشاہ نے شاہ پور پر حملہ کر کے نصیبین اور کارنجیں شہروں پر قبضہ کر لیا اور انہیں بری طرح تباہ و برباد کر ڈالا اور نصیبین شہر...  
 ویلیرین کے حوالے کر کے خود دوسری مہمات میں مصروف ہو گیا۔ شاہ پور کو موقع ملا تو اس نے دوبارہ سے اپنی فوج کو اکٹھا کیا اور ویلیرین کو لکھا کہ وہ طے شدہ تارواں ادا کرے مگر ویلیرین نے جواب دیا چونکہ نصیبین پر اب ملک فارس کا قبضہ نہیں رہا اس لیے وہ اسے تارواں ادا نہیں کر سکتا۔ شاہ پور نے جب اس کا یہ جواب سنا تو اس نے فوراً اپنی فوج کے کمرہجین پر حملہ کر دیا ویلیرین اپنے شہر میں محصور ہو گیا۔ اس نے شہر کے تمام دروازے بند کر دیے۔ نصیبین شہر کے چاروں طرف حصار دی دیا اور انتہائی مضبوط قلعہ بنایا۔ شاہ پور نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کتنے ہی دن اسی محاصرے میں گزر گئے۔ شاہ پور نے جب دیکھا کہ کسی طور محاصرے سے روٹی شہنشاہ اکبر کا باہر نہیں نکلتا اور نہ ہی نصیبین فتح کرنے کا کوئی سبب چلتا ہے تو اس نے شہر زور کے صحرا سے بہت سارے کالے بچھو منگوائے۔ پہلے اس نے گوبھیوں سے شہر کی دیواروں اور برجوں کو گرا دیا۔ پھر شہر کے اندر منگوائے ہوئے کالے بچھو بھگوا دیے اور سرد درساں کے تمام راستے بند کر دیے۔ محصورین شہر کی خوراک کا ذخیرہ جب ختم ہو گیا اور کالے بچھوؤں نے شہر یوں کو ڈنک مارنے شروع کر دیے تو ناچار اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔ بادشاہ ویلیرین نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی فوج کو شاہ پور کو فتح کا پیغام بھیجا یا اور ساتھ ہی مقررہ تارواں دینے کی ہامی بھری۔ شاہ پور نے اس کی درخواست مانتے ہوئے نصیبین پر اپنا ایک نائب مرزا بن مقرر کیا اور خود سطروں کی طرف بڑھ گیا۔ سطروں کو فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ جہاں اس وقت قسطنطنیہ بن بلاق کی حکومت تھی۔ اس نے چوبیس سال حکومت کرنے کے بعد اپنے بھائی لیاؤس کو دے دی تھی۔ اپنے دور حکومت میں اس نے بہت سے گرجا گھر تعمیر کرائے اور دین مسیحی کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیاؤس روم کا تیسرا اصرانی بادشاہ تھا لیکن اس نے بہت جلد نصراہیت سے روگردانی کر کے اصرام پرستی شروع کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے روم کے لوگ اس سے سخت نفرت کرنے لگے تھے اور اسے لیاؤس بڑھا طاعت کہنے لگے تھے۔ شاہ پور ابھی راستے میں ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی، لیاؤس نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر شاہ پور کے عراقی علاقوں پر چڑھائی کر دی ہے مگر اس کی فوج میں موجود غریبی سناہیوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اسے قتل کر ڈالا ہے۔ لیاؤس کے قتل پر اس کے ہمرو حکمرانوں کو بہت افسوس ہوا لیکن چونکہ روم کے

عوام مقتول بادشاہ کے سخت مخالف تھے اس لیے اس کے زبردست حکمرانوں نے نصراہیت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے باہم مشورے سے یونیاں کو اپنا حکمران مان لیا۔ لیاؤس کا لشکر ابھی عراق ہی میں تھا جب شاہ پور ان کے سر پر پہنچ گیا۔ شاہ پور نے روٹی فوج کا محاصرہ کر لیا اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ جس پر یونیاں نے شاہ پور کو بڑے قیمتی تحائف اور زر نقد بھیج کر اس سے اپنا چھپا چھڑایا۔ شاہ پور کے ساتھ اس نے خط کتابت بھی کی اور وہ بدھ مت کو بھی کی جس کی وجہ سے متعدد باہمی اختلافات کا بحسن و خوبی تصفیہ ہو گیا اور شاہ پور ملک فارس آ گیا۔

روم کی فتوحات کے بعد شاہ پور ملک فارس میں پلانا تو اس نے سرزمین فارس کے شہر شاہ پور میں ایک عظیم الشان آتش کدہ تعمیر کرایا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسے دارالابن دارا نے تعمیر کرایا تھا۔ روم میں بھی اس نے ایک آتش کدہ کی بنیاد رکھی۔ جب شاہ پور جزیرہ کے شہر کی طرف روانہ ہوا تھا تو سیدھا راستہ چھوڑ کر ایک قلعے میں جا اتر اس وقت ایک تورانی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ شاہ پور نے اس پر چڑھائی کر کے اسے شکست دی اور اسے قتل کر دیا اور شاہ پور نے اس جگہ ایک منظم شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اس نے نیوشاہ پور رکھا۔ جو آج بھی تیشاپور کہلاتا ہے۔

☆☆☆

انصر ایک سریانی بادشاہ ساطرون جس کا لقب خزان تھا، کی بیٹی تھی۔ ساطرون دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے ہیراکا حکمران تھا جس نے شہر میں حسن جعفر کے نام سے پختہ قلعہ بنا رکھا تھا۔ نصر انتہائی خوب صورت تھی جس کے انتہائی لمبے گھنے بال اس کے گھٹنوں تک آتے تھے اور اس کے حسن کو چار چاند لگتے تھے۔ نصر اکو دیکھنے والے دیکھتے تیارہ جاتے تھے۔ گمانی اور سفید رنگت، اونچا لمبا قد، گتھا جیسے یونانی اور پارسی (فارسی) حسن نے ل کر اسے بے مثال بنا ڈالا تھا۔ خزن اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس کے سرخ بوٹوں سے جو بھی بات لکھتی، اسے فوراً پورا کرنے میں خزن کوئی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا تھا۔ ساطرون ہندی شہنشاہ کے نام سے مشہور تھا۔ وہ جس بات کو سن میں بٹھالیتا، جب تک اسے پورا نہ کر لیتا اس سے پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ وہ ملک فارس کا دوسری یونانی ریاستوں کی طرح باج گزار تھا اور ایک مخصوص رقم بیع تحائف کے ساسانی حکمرانوں کو سالانہ ادا کرتا تھا۔ جب ارشیر و فات پا گیا تو ملک فارس کی ریاستوں میں کچھ عرصے کے لیے انتشار اور افراتفری پیدا ہوئی جس کو فارس کے نئے حکمران شاہ پور

نے نہ صرف سختی سے دبا دیا بلکہ کئی نئی ریاستوں کو دوبارہ سے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا۔ فارس کا ایک شہر "ہیورا" تھا جہاں سے عرق درد ملا کر پانی باہر بھیجا جاتا تھا۔

نصیبین کی جنگ کے تین سال بعد 240ء میں اہل فارس اور رومیوں کے درمیان ایڈریا کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ قیصر روم، ویلیرین نے صلح نامہ نصیبین کی رو سے خراج کے علاوہ ارمینیا بھی ملک فارس کے حوالے کر دیا تھا جس سے ویلیرین کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے قیصر روم تین سال تک تیاریوں میں لگا رہا۔ جب جنگی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو بذات خود حملہ آور ہوا لیکن شاہ پور نے آگے بڑھ کر اسے نہ صرف شکست فاش دی بلکہ اسے گرفتار بھی کر لیا۔ قیصر روم قیدی کی حالت میں شہر چندی شاہ پور میں کر گیا۔ رومی مورخوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ پور نے قیدی رومی شہنشاہ سے بہت برا سلوک کیا تاہم یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بازنطینی وقار کو جو صدمہ پہنچا۔ اس کی وجہ شاہ پور کے سلوک پر نہ تھی۔ ویلیرین سے جو سلوک ہوا وہ اس کا مستحق تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ جولین نے اہل فارس سے بدلہ لینے کے لیے طیفونوں پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس جنگ میں جولین اس قدر زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ اب رومی سلطنت کو چاروں جانب پر بات تسلیم کرنا پڑی کہ اہل فارس قیامت کے دن اور بہتر ہیں شہسوار ہیں۔

انصر آئے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اسے معلوم ہوا کہ ملک فارس کا معاشرہ دو دستوں پر قائم ہے۔ ایک خاندان اور دوسرا جاگیردار۔ اور وہ چونکہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس لیے عوام اور ان کے درمیان ایک حد فاصل اور محکم حدود قائم ہیں۔ شہنشاہیت اور عوام دونوں کی ہر چیز میں امتیاز تھا۔ سوادری میں اور لباس میں۔ مکان اور نکاحات میں۔ عورتوں اور خدمت گاروں میں۔ شاہی خاندان ہیڈ منسٹری اور چمک وک والا ساز و سامان استعمال کرتے اور ان کے لباس سے بھی احساس تفاخر ظاہر ہوتا تھا۔ شاہی خاندان کی عورتوں کے رسمی لباس، انتہائی قیمتی جوتے غرض ان کی ہر چیز اور امیرانہ شوق ان کے اہل خاندان کا پتہ دیتی تھی۔ ان کے معاشرے میں ہر شخص کے لیے ایک مخصوص مقام تھا۔ ان کا ایک اہل اصول تھا کہ کوئی شخص اپنے اس رتبے سے بلند تر رہے گی خواہ اس نے نہ گئے جو اس کو پیدا آئی طور پر اور خاندانی طور پر حاصل ہو چکا ہے پھر شاہی خاندان کو تو انہی مراعات حاصل تھیں۔ ان کی عالی نشی اور ان کی جائیدادوں کو نقصان پہنچانے یا ان کو اپنے نام منسل کرانے کی

کسی کو اجازت نہ تھی۔ بلکہ ان چیزوں کی حفاظت ان سے زیادہ حکومت کی ذمہ داری تھی۔ لیکن وجہی کہ شہنشاہ فارس سے لے کر شاہان ریاست کے ساتھ امراء و عالی نسب افراد کو اپنی بلند اور پائی کی نسب کا اس قدر احساس تھا کہ وہ نہ صرف اپنی رعایا سے خود کو بلند جانتے تھے بلکہ دوسری ریاستوں کے حاکموں کو بھی اپنا ہم پلہ خیال نہ کرتے تھے اور انہیں خود سے کم تر خیال کرتے تھے۔ اس لیے وہ دوسرے ممالک کے بادشاہوں کی بنیوں کے ساتھ کٹھن کرتے اور انہیں اپنے حرم کی ذریت بناتے لیکن کسی دوسرے بادشاہ کو اپنی بنیوں کا رشتہ دینے سے احتراز کرتے۔ نصر انجلیں سے ہی یہ احساس دلا گیا تھا کہ عام طور پر غلط طبقے کا کوئی شخص اس کی ہمسری نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ کسی طرح شاہی خاندان کے اہل طبقے میں منسلک ہو سکتا ہے اگر کسی شخص میں کوئی غیر معمولی جوہر ہوگا تو پہلے اسے مختلف امتحانوں سے گزرنا ہوگا اور اگر وہ ان آزمائشوں میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو اہل خاندانوں کے طبقے میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں پارسی (فارسی) کے رہنے والے اصلی باشندے (اور غیر فارسی باشندوں کے درمیان امتیازات کی ہمیشہ ایک دیوار کھڑی تھی۔

چونکہ ملک فارس کا زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ عورتوں کی حفاظت کے لیے مرد ملازم رکھے جاتے تھے اور اولاد کے بارے میں ان کا دستور تھا کہ لڑکا جب تک بالغ نہیں ہو جاتا اور لڑکی جب تک بیانی نہ جاتی، ان کی پرورش اور نگہداشت باپ کی ذمہ داری تھی۔ لڑکی کی مذہبی تعلیم ماں کا فرض تھا لیکن اس کی شادی کرنا باپ کے فرائض میں تھا۔ اگر باپ زندہ نہ ہو تو پھر لڑکی کی شادی کسی اور شخص کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ فارس کا سرکاری مذہب زرتشت تھا اور شیطان کو دور رکھنے کے لیے آگ اور دھن کی استعمال کیا جاتا تھا۔

بلاش خوب صورت اور بہادر نوجوان تھا جس کو انوشیر نے اپنی بیٹی اردزی کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا اور انوشیر قصہ کواد کے بادشاہ کا نائب تھا۔ اردزی نصر کی کھلی اور غامض تھی۔ نصر اس کی ہم راہی بھی تھی۔ دونوں لڑکیاں جب بھی اکیلے میں بیٹھتیں تو اردزی ہر بات کی تان بلاش پر لا توڑتی تھی۔ کئی بار تو ایسے بھی ہوتا تھا کہ نصر ان دونوں کو چار محبت کی باتیں کرنے کے لیے خود موقع فراہم کر دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ بلاش اور اردزی اس کے سامنے ہی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر چٹکیں بڑھانے لگے۔ نصر انے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ



مجھے بلاش پر شک گزر رہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ پیار کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ کسی لالچ کے تحت تمہارے ساتھ پیار کی کیفیتیں بڑھا رہا ہے مگر اس وقت تک ارزی اس کے پیار میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ نصرا کی باتوں کا یقین نہیں کر رہی تھی۔ ایک روز جب ارزی بلاش کا انتظار کر رہی تھی تو نصرا نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھو ارزی! مجھے شک گزر رہا ہے کہ بلاش تمہارے پیار میں سنجیدہ نہیں۔ وہ کسی لالچ میں تمہیں ورغلا رہا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ سنجیدہ ہے تو اس سے کہو کہ وہ تم سے شادی کر لے۔“ نصرا نے اسے سمجھایا۔

”میں نے کئی بار اس سے کہا ہے مگر وہ آگے سے جواب دیتا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ جب تک اسے وہ حاصل نہیں ہو جاتا وہ شادی کے بندھن میں خود کو نہیں باندھ سکتا۔“ ارزی نے بتایا۔

”میں جانتی ہوں اس کا کون سا مقصد ہے۔ میں نے ایک روز کو تو اس سے اسے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ میں نے وہ باتیں نہیں سنی تھیں کہ کہیں تمہارا من اس سے نفرت نہ کرنے لگے۔“ نصرا نے اسے بتایا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو بلاش کو مجھ پر اعتماد ہے اور نہ ہی اپنی سبیلی پر بھروسہ کرتی ہو۔“

”نہیں ارزی یہ بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے بتانے سے ایک تو اس کی حقیقت تم پر کھل جائے گی۔ دوسرے محبت کے معاملے میں، میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اتنا آگے نکل چکی ہو کہ کہیں سن کر دکھ ہوگا اور کسی کو دکھ پہنچا تا میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ البتہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ اپنے بابا سے کہہ کر تمہارے والد کو اس بات پر آمادہ کر دوں کہ وہ تمہاری دیوروں کے اس لڑکے سے شادی کر دے۔ وہ بھی اگر تم چاہو تو۔“ نصرا نے اسے بتایا تو ارزی فوراً بولی۔

”نصرا میں جانتی ہوں کہ تم جو کام بھی کرو گی میرے مفاد کے لیے کرو گی لیکن میں اس کی وہ باتیں سنتا چاہوں گی جس سے تمہیں اس کی دفا پر شک ہو جائے۔“ ارزی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تو سنو۔۔۔۔۔ اس کا ارادہ تمہیں میسر ہی بنا کر مجھ تک پہنچنا ہے۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد پتا چل جائے گا اور پھر وہ ہمارے خاندان کا حصہ بنتا چلتا ہے جو کسی طور پر بھی ہمیں منظور نہیں لیکن مجھ نے وعدہ کر دیا کہ تم اس وقت تک اس سے کچھ نہ پوچھو گی جب تک وہ خود تم سے بات نہیں کرتا۔“

نصرا نے اسے فصاحت کی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔“ ارزی نے مایوسی سے جواب دیا۔

پھر بہت جلد ایک روز جب ارزی اور بلاش آپس میں راز و نیاز کر رہے تھے تو بلاش نے اپنے دل کی بات ارزی کو کہہ ڈالی۔

”دیکھو ارزی! میں بڑے دنوں سے تمہارے ساتھ ایک بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر پھر بھی جان سے ڈر جاتا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ میں تم سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں اور اسی بھروسے پر میں بڑی سوچ پیار کے بعد آج تم سے ایک بات کر رہا ہوں مگر تم وعدہ کر دو کہ اس معاملے میں تم میری مدد ضرور کرو گی۔“ بلاش نے رکتے رکتے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”کہو۔۔۔۔۔ یہ میرے لیے نہایت عزت افزائی کی بات ہوگی جو میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“ ارزی نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

”جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، ہمارے درمیان رہتی چاہیے۔ اگر تمہارے بس میں ہوئی تو میری مدد ضرور کرنا وگرنہ مجھے لینا کہ میں تم سے کوئی بات کی ہی نہیں۔“ بلاش نے سادگی سے کہا۔

”بات تو بتاؤ۔۔۔۔۔ میں بات سن کر ہی فیصلہ کر پاؤں گی کہ یہ میرے بس میں بھی ہے کہ نہیں۔“ ارزی نے اسی انداز سے پوچھا۔

”تم کسی طرح میری بات نصرا سے نہیں کروا سکتیں؟ اسے اعتماد میں لے کر یہ یقین دلادو کہ میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ گو یہ بات مجھے تم سے کہتے زیب نہیں دے رہی مگر اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ اگر نصرا میری محبت کے جھانسنے میں آجائے تو میں اس سے شادی کا فرضی دعویٰ کر کے اس کے والد کے تاج و تخت کا مالک بن جاؤں گا اور پھر تم سے شادی کر لوں گا۔ یوں تم ملک بہتر اکی بلا شرکت غیرے ملک بن جاؤ گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری خوب صورتی کے آنے نصرا کا حسن ماند ہے۔ تمہاری خوب صورت باتیں کرنے کے انداز سے تمہاری ذات بہت قیمتی ہے۔ جو نصرا کی گفتگو کے انداز سے کہیں اونچی ہے جہیں میرے لیے ایسا کرنا ہوگا۔ مجھ سے وعدہ کر دو کہ اپنے اور میرے مستقبل کے لیے تم یہ کھیل کھیلنے میں میری مدد کرو گی۔“ بلاش نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ دی ڈالی۔

”بلاش! تم نے میرے دل کی خواہش بیان کر دی۔ میں بڑی دیر سے یہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ کسی طرح نصرا کے دل میں تمہاری محبت کی جوت جگا دوں۔۔۔۔۔“ ارزی نے دھکی دھکی سے اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔۔۔۔۔“ بلاش خوش سے بولا۔

انگلے ہی دن ارزی نے یہ تمام باتیں نصرا کو بتا دیں تو نصرا نے کہا۔

”دیکھا میری بات سچ نکلی تا۔۔۔۔۔ اب تم کسی روز ایسا کرو، بلاش کو ملاقات کے بہانے سے بلاؤ۔ جب وہ آجائے گا تو میں اپنے پروگرام کا انکا حصہ تمہیں اس وقت بتاؤں گی۔“ پھر ایسا ہی کیا گیا۔

ایک دن ارزی نے بلاش کو بہانے سے بلایا اور نصرا کو بھی بتا دیا۔ اس روز ارزی بڑی بے چینی سے بلاش کا انتظار کر رہی تھی اور نصرا قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی جہاں سے ارزی اور بلاش دونوں اسے نظر آ رہے تھے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ہی بلاش خوش ہوتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم میری محبت میں یقیناً وہ گم گمزدگی نہیں کہوں گا۔ کیا بات ہوئی تانا پسند کرو گی؟“

”میں نے نصرا سے بات کی تھی۔“ ارزی نے بتایا۔

”پھر اس نے کیا کہا۔۔۔۔۔؟“ بلاش نے اگلا سوال کیا۔

”میری بات سن کر وہ بھی اور پھر پشیمان ہوئے کہنے لگی۔“

”کیا واقعی بلاش مجھے چاہتا ہے؟ ارزی تم خوش قسمت ہو کہ اتنا ذہین اور خوب صورت مرد تمہیں پسند کرتا ہے میں واقعی اس سے ملنا چاہوں گی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ تو اس نے یہ کہا۔ پھر کب اس سے ملوؤ گی؟“ بلاش بے چینی سے بولا۔

”اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ یہ تو اس کی مرضی ہے، وہ نصرا کی شہزادی ہے جب اس کا من چاہے گا وہ تم سے مل لے گی۔“ ارزی نے سادگی سے جواب دیا۔

”اوہ ارزی! تم سنی اچھی ہو، ملکہ بننے کا اعزاز یقیناً تمہاری خوب صورتی اور ذہانت کو چار چاند لگا دے گا۔ تم اسے جتنی جلدی ہو سکتے میرے ساتھ ملوانے کی کوشش کرنا۔“ بلاش نے خوشی سے کہا۔

ابھی وہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ نصرا جلدی سے نکلی اور ان کے سامنے آگئی۔

”نصرا یہ تم ہو۔۔۔۔۔“ ارزی نے حیرانی سے پوچھا۔

”اسی اثنا میں بلاش نے بھی اپنا رخ موڑا۔ اب نصرا اس کے سامنے تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا، نصرا نے چھپایا ہوا شیئر دھار۔۔۔۔۔ فخر نکالا اور بلاش کے پیٹ میں اتار دیا۔ اس نے جوش جذبات میں ایک دوبار اس شیئر کو اس کے پیٹ سے نکالا اور دوبارہ اس کے پیٹ میں مارا۔ بلاش انتہائی ذہنی حالت میں زمین پر گر ا اور ترپے لگا تو نصرا نے ارزی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

”آؤ ارزی۔۔۔۔۔ چلتے ہیں۔“

ارزی اس کے ساتھ حلقی چلی گئی۔۔۔۔۔

دونوں نصرا کے باپ خزن کے پاس پہنچ گئیں اور نصرا نے تمام بات باپ کے گوش گزار کر دی۔ اس نے اطمینان سے نصرا کی بات سنی اور انہیں گل میں جانے کو کہا۔

جب وہ چلی گئیں تو اس نے بلاش کے والد کو اپنے پاس بلایا۔ کچھ دیر کے بعد بلاش کا والد خزن کے سامنے کھڑا تھا۔

”تمہیں پتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص کے لیے ایک معین مقام ہے۔ تمہارے بیٹے نے اپنے رتبے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر رتبے کی خواہش کی تھی۔ ادھر اس کی لاش پڑی ہے، اٹھو!۔۔۔۔۔“ بلاش کے والد نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”یقیناً ہمارے بادشاہ انصاف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اب بھی انہوں نے بہتر انصاف کیا ہے۔“

یہ کہہ کر بلاش کا والد اپنے بیٹے کی لاش لے کر چلا گیا۔

☆☆☆☆

قیصر روم بھی اب شاہ پور کی بے درپے فوج کشی سے اکتا گیا تھا۔ اب اس نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ ملک فارس کے ساتھ صلح کر لی جائے۔ یونانی پہلے ہی کئی بار ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ جب رومیوں نے صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شاہ پور بھی صلح پر آمادہ ہو گیا۔ اسی دوران ایک بار قیصر روم نے شاہ پور کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی سیاست کا دار و مدار آپ کی افواج ہیں۔ آپ کے ماتحتوں نے نظام حکومت کو ظلم و ضیق کے ساتھ درست کر رکھا ہے۔ اہل مملکت کی سلامتی کے لیے آپ نے کچھ خاص تدابیر کی ہیں لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ان سب باتوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بتائیں تاکہ میں بھی اپنی مملکت کی فلاح و بہبود کے لیے آپ کے وضع کردہ اصولوں پر کار بند رہ سکوں۔ شاہ پور نے قیصر کو جواب لکھا۔

”میں نے اس سلسلے میں اپنی مملکت میں آٹھ باتوں



کی پابندی لازمی قرار دے رکھی ہے جو یہ ہیں۔ میں نے بھی اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی اپنے احکامات میں کبھی ذلیل اور مستحکم بخیر کو داخل ہونے دیا ہے۔ ہمیشہ وعدے کی خلاف ورزی سے خود کو دور رکھا۔ میرے ذہن میں ہوتا ہے کہ جب بھی کسی ملک کے خلاف جنگ کروں تو یہ جنگ امن و امان کی بحالی کے لیے ہو۔ کسی لالچ کے تحت نہ ہو اور ملک کی رعایا کے دل بغیر کسی خوف کے آپ کی تسلی میں آنے چاہئیں۔ کوئی شخص آپ کے لشکر اور ظلم کی وجہ سے خوف میں مبتلا نہ ہو۔ سزا جرم پر لٹنی چاہیے۔ اس کی بنیاد صرف آپ کا غصہ یا حقارت نہ ہو۔ طاقت کا استعمال ہمیشہ وقت پر اچھا لگتا ہے۔ بے وقت طاقت دکھانا بیکار ہے۔”

کہتے ہیں کہ شاہ پور نے ٹیکس وصول کرنے والے بعض عہدیداروں کو بھی بے لگھا تھا۔

”میں جب بھی کسی شخص کو کسی عہدے کا داری دیتا ہوں تو اس کی زندگی کی ضروریات اور ملازمت کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرتا ہوں۔ اس کے عہدے کا استعمال صرف اور صرف عوام کی بھلائی قرار دیا اور اسے ہر موقع پر حسن تدبیر سے کام لینے کی ہدایت کی۔ اسے یہ بھی ہدایت کی کہ وہ عوام پر ٹیکسوں کو حد سے نہ بڑھائے دے اور اپنے ذاتی اخراجات میں بھی اسی ہدایت پر عمل کرے۔ رعایا کو جو رو ظلم کے بجائے حسن تدبیر سے اپنی اطلاع کا پابند رکھے۔ کسی کو صرف سزا کی وجہ سے خوف میں مبتلا نہ رکھے۔ امیروں اور سرسایہ داروں کو بھی اس طرف متوجہ کرے کہ وہ اپنی دولت کو اپنے ذاتی مفادات و خواہشات تک ہی نہ رکھے بلکہ عوامی بہتری کے لیے اس کو اولیت دے۔ اپنے مفاد کے لیے عوام کے انکار پر غصے میں نہ آئے اور اپنے مفاد کے لیے رعایا کو اپنے احکامات ماننے پر مجبور نہ کرے اور کوشش کرے کہ عوام کی فلاح کے لیے کئے گئے کاموں میں اس کی ذاتی غرض شامل نہ ہو۔ پھر بھی اگر کوئی شخص اس کے جائز احکام کو کرنے یا ماننے سے انکار کرے تو پہلے زبانی اس کو سمجھایا جائے۔ اگر پھر بھی ماننے سے انکار کرے تو اس کو قانون کے مطابق سزا دینے کا اختیار اسے حاصل ہے۔ لہذا تمہارے لیے بھی ان جملہ مشوروں اور ہدایت پر پابندی لازم ہے۔“

شاہ پور اول ہمیشہ اس بات پر پابند رہا کہ اس نے بے جا کسی شخص یا ریاست پر حملہ نہیں کیا۔ جب وہ بڑی مہمات کو مکمل کر چکا تو اس کی عدم توجہ سے پتھر کے ٹکڑے ان ساطرون جسے خزانہ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا، اس نے

کافی لاؤ لٹکر جمع کر لیا تھا اور اپنی طاقت کے دھم میں اس نے شاہ پور کو تادان کی ادا کی تھی۔ شاہ پور نے چونکہ اپنی ساری توجہ بڑے معاملات پر لگا رکھی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے شاہ پور کا کچھ علاقہ زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ شاہ پور نے اس کو پیغام بھیجا کہ تادان کی ادا کی بھال کرنے کے ساتھ ساتھ قبضے میں کی گئی اراضی کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ مگر اس نے شاہ پور کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ جب شاہ پور نے حصن حضرت نامی قلعے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ تاجرانوں کے مطابق یہ قلعہ اپنی ساخت کے اعتبار سے انتہائی پختہ اور خوب صورت تھا۔ اس کی تعمیر میں خزانہ نے خاص دلچسپی لی تھی تاکہ بیرونی حملہ آوروں سے یہ محفوظ رہ سکے۔

شاہ پور نے جب اس قلعے کا محاصرہ کر لیا تو ساطرون عرف خزانہ شہر میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا۔ اس کی بیٹی جو ہمیشہ ہم جوئی میں اس کے ساتھ رہتی تھی، وہ بھی اس قلعے میں موجود تھی۔ شاہ پور نے اس کی بیٹی نظر اس کی خوب صورتی اور معاملہ فہمی و ذہانت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہی حال نظر آگیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ شاہ پور نے ان پر حملہ کر دیا ہے اور انہوں نے نہ صرف شہر قلعہ کو بھی محاصرے میں لے لیا ہے تو اس کے والد ساطرون نے تاریخ کے مطابق قلعے کے بالا خانے میں بیٹھ دیا تاکہ وہ اطمینان سے دشمن کو کسی تدبیر یا جنگ کے کرکٹ دے کر قلعہ و گزرا کر لائے۔ شاہ پور ایک ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ وہ ہر صبح قلعے کے ارد گرد چکر لگاتا رہا تاکہ کسی بھی جگہ سے ساطرون کی کمزوری دیکھے اور قلعے کو فتح کر لے مگر اسے ہر بار نا کامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ خبروں نے شاہ پور کو بتایا کہ ساطرون عرف خزانہ کی فوج کے ایک حصے کی کمان نظر آکر رہی ہے۔ نظر اقلے کے بالا خانے میں بیٹھ کر شاہ پور کی افواج کی نقل و حرکت پر پوری طرح توجہ رکھے ہوئے تھی۔ جیسے جیسے وہ گزرتے تھے، شہر میں محصور عوام کی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ شہر میں کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے والد کو مشورہ دیا کہ شاہ پور جیسے دانا اور بہادر آدمی کا مقابلہ کرنا ان کی ہمت سے باہر ہوتا جا رہا ہے لہذا بہتر یہی ہے کہ وہ چھٹیاد ڈال کر قلعے کے دروازے اس پر کھول دے مگر ساطرون کو اپنی بے پناہ افواج اور اس کی وقار داری کا بڑا مان تھا۔ اس لیے اس نے ہر بار نظر آ کے مشورے کو

دھوکے باز

لکھناویا۔

نظر ابھر روز بھی صبح حالات کا جائزہ لینے کے لیے قلعے کے بالا خانے میں آکر بیٹھ رہتی۔ اس نے شاہ پور کی جو اس مردی اور بہادری کی کئی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اب کتنے دنوں سے وہ اسے خود اپنی آنکھوں سے اپنی فوج کو احکامات دیتے اور ان کی حفاظت کے لیے پھرے داری کرتے دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں چاہت کی پندگاریاں اس کے سن میں سننے لگی تھیں۔

شاہ پور اپنے ارادے کا دعویٰ تھا۔ وہ جس بات کا ایک بار ارادہ کر لیتا تھا، جب تک وہ اسے پورا نہ کر لیتا اسے اور نہ چھوڑتا تھا مگر یہاں اس کے ارادوں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں اور شہر بند بادشاہ اور اس کی رعایا تک پہنچنے کا کوئی راستہ یا کسی طرح شہر میں داخلے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

اس روز بھی سورج کی سنہری کرنوں نے شہر اور قلعے کو ابھی پوری طرح سجایا نہ تھا۔ نظر اقلے کی بالائی منزل میں اس طرف بیٹھی تھی جہاں سے سورج کی روشنی آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول رہی تھیں۔ معاً اس نے دیکھا کہ ایک شخص نے قلعہ کا مالک جس سے مضبوط جسم پر اس کا شاہ پند اور ہر ایک اور ذائقہ برق لباس دیکھنے والوں کی نظروں کو کھینچا پھرتا رہا تھا۔ اوپر سے اس کے چہرے کی سرخ و سفید رنگت نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر رکھا تھا، اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ اس کے چلنے میں بھی عجیب و بد بہ تھا۔ اس کے سن نے فوراً گواہی دی کہ وہ ہو سکی شاہ پور ہے جس کی بہادری اور دلیری کی داستانیں وہ بڑے گرمی سے سن رہی تھی۔ یہی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے نزدیک پہنچا دیتے ہوئے ایک ملازم کو بلا کر اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ یہی شاہ پور ہے۔ اس تصدیق کے بعد اس کے سن میں ہزاروں منہ بند خواہشوں نے سر اٹھالیا۔ یقیناً ایک ایسے ہی شخص کو وہ اپنے دل میں ایک عرصے سے بسا چکی تھی۔

”تم میرے لیے ایک کام کر سکتے ہو۔“ اس نے ملازم سے پوچھا۔

”آپ حکم تو دیں، میرے لیے آپ کا حکم ایک اڑا کا باعث ہوگا اگر میں اس کو پورا کر سکوں۔“

”تو ایسا کرو اس شخص کو جسے تم شاہ پور کہتے ہو، میرا ایک پیغام کسی طرح پہنچا دو۔ قلعہ بند شہر سے تم میرے بتائے اسے قلعے راستے سے نکل کر اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔“

”جیسا آپ کہیں گی اس پر حرف بہ حرف عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ ملازم نے جواب دیا۔

کئی دنوں اس نے ملازم سے اپنی بات کہہ دی مگر پھر سارا دن وہ اسی آنکھ میں رہی کہ کہیں اس نے یہ غلط تو نہیں کہہ دیا۔ ایک طرف اس کے باپ کی سلطنت ہے اور دوسری طرف شاہ پور جو کتنے دنوں سے نہ صرف شہر بلکہ ان کی سلطنت کے سب سے مضبوط قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ دو تین روز وہ اس معاملے پر سوچتی رہی۔ اس کا دل حقیقت اور جذبات کی آغوشوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک

## قارئین متوجہ ہوں

سچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایت مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہتے ہیں۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا نمبر ہاٹل نمبر۔

☆ رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا شمس عباس 0301-2454188

جاسوس ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپینس ڈائجسٹ پاکستان پبلیکیشنز

C-63 ایف ڈی اینٹرنیشنل پبلیکیشنز، ایف ڈی اینٹرنیشنل پبلیکیشنز

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



طرف اس کے باپ کا پیار اور اس سے محبت کا جذبہ اسے اس حرکت سے روک رہا تھا جبکہ ایک اُن دیکھا اور منہ زور جذبہ شاہ پور کو اپنانے پر اکسارہا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھی۔ بالآخر شاہ پور سے لگاؤ کا جذبہ اس کی شخصیت اور سوچوں کو چھٹ کر گیا اور اس نے شاہ پور کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی روز شام کے وقت اس نے اپنے ملازم کے ہاتھ شاہ پور تک پہنچا مہجوا یا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

شاہ پور تو پہلے ہی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح شہر کے دروازے اس پر کھل جائیں اور وہ اپنی ہم کو باہر میں طریق فتح کر سکے۔ جب ساطرون عرف خزن کا ایک فوجی اس سے ملنے کے لیے آیا اور اس کے ایک ساتھی نے شاہ پور کے ساتھ اس کی ملاقات کی اجازت طلب کی تو شاہ پور نے فوراً پوچھا۔

”یہ نضر اکون ہے۔“  
”وہ شہر ہجرا کے بادشاہ ساطرون عرف خزن کی اکلوتی بیٹی ہے۔“

شاہ پور یہ سن کر ایک لمحے کو سکتے میں آگیا کہ ایک ایسا بادشاہ.... جو خود تنہائی چالاک مگر دلیر آدمی ہے اس کی بیٹی اس کے ساتھ کیوں ملنا چاہتی ہے۔ بہر حال بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے پیغام کو جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، ہم اس سے ملنے کو تیار ہیں مگر اسے بتا دینا اگر اس نے کوئی چالاک یا ہوشیاری دکھائی تو پھر ہم اس شہر کی تباہی و بربادی کے ذمے دار نہ ہوں گے۔ انہیں جا کر ہمارا پیغام پہنچا دو۔ ملاقات کی جگہ کا تعین اور وقت کا انتخاب وہ خود کرے ہمیں بتا دیں۔ ہم مقررہ وقت پر اس جگہ پہنچ جائیں گے۔“ شاہ پور نے جواب دیا تو پیغام رساں نے فن و گن میں بھی جواب نضر اکو پہنچا دیا۔ شاہ پور کا جواب سن کر نضر اکے سن میں تلکے والی آج ایک جولا بھی بن گئی۔ اس نے اپنے والد سے کہے سے بغیر شاہ پور کو اپنا اگلا پیغام بھجوایا۔

”کل شام شہر سے کچھ دور ایک ویران جگہ پر وہ اس کا انتظار کرے گی۔“

چنانچہ طے شدہ مقام پر نضر اکہ پہنچے اور جیسے چھپاتے چھپتی۔ شاہ پور بھی اسی وقت اس جگہ پہنچ گیا۔ ملاقات پر سب سے پہلا سوال جو شاہ پور نے نضر اکے پوچھا وہ یہ تھا۔

”کیا وجہ ہے کہ وہ اس قدر بہادر اور دلیر بادشاہ کی

بیٹی ہونے کے سبب اس سے ملنے کی خواہش مند تھی؟“  
”تم شاہ پور..... اپنی جوں مردی اور بہادری میں بلاشبہ اپنی مثال آپ ہو مگر اس بات کو دھیان میں رکھو کہ تم چاہے کتنی ہی دلیر شہر کا محاصرہ جاری رکھو، تم اسے کی صورت تک نہ کر پاؤ گے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ تم مجھ سے شادی کا وعدہ کر دو تو میں تمہاری اس مشکل کو حل کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔“ نضر اکے نے اپنے جذبے کا اظہار بر ملا کر دیا تو شاہ پور نہ صرف خوش ہوا بلکہ دل ہی دل میں اس بات پر آمادہ بھی ہو گیا۔

”مگر اس بات کا کیا اعتبار کرے گا جو... کچھ کہہ رہی ہو سچ ہے۔“ شاہ پور نے پوچھا۔

”تم جو کہو اور جیسے کہو میں اس کا اعتبار دلانے کو تیار ہوں۔“ نضر اکہ نے جواب دیا۔

”مجھے عورتوں کی باتوں کا یقین نہیں آتا۔ یہ کسی لمحے بھی اپنے وعدے سے کمر سکتی ہیں۔“ شاہ پور تنبیہ کی سے کہنے لگا۔

”میں اس کے لیے معاہدہ لکھنے کو بھی تیار ہوں کہ میں جو کہہ رہی ہوں، وہ سچ ہے۔“ نضر اکے نے جواب دیا۔

”تو پھر تم اپنی آباؤ اجداد کے لیے کچھ کرنا چاہو۔ میں پھر نہ صرف تم پر یقین کر لوں گا بلکہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کو بھی تیار ہوں۔“ شاہ پور نے اپنی شرط بتادی۔

”ٹھیک ہے، تم کل اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔ تمہیں میری باتوں کی سچائی کا اعتبار آ جائے گا۔“

اگلی رات شاہ پور اپنی فوج سے نکل کر اسی جگہ پر آگیا جہاں نضر اکے اس کے ساتھ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کتنی دیر تک نضر اکہ ہنسنے لگی تو اس کے دل میں شک پیدا ہونے لگا۔

آخر عورت ہی نکلی نا بے اعتباری..... دفاع جس کی سرشت میں لکھا ہوتا ہے۔ کتنی دیر تک وہ گولہ کی حالت میں ادھر ادھر بھرتا رہا۔ آخر اسے ایک جانب سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا تو وہ نضر اکہ تھی۔ وہ خوف کے مارے بار بار ادھر ادھر اور اپنے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ خرب پھٹی تو شاہ پور بے تابی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے اپنی ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بولا۔

”آئی دیر لگی۔ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کل کی تمہاری ساری باتیں اور وعدے محض جذباتی تھے اور تمہاری یہ ایک لڑکی چال تھی۔“

”نضر اکہ عورت نہیں ہے جو بات کر کے کر

جائے۔ دراصل میں اپنے دل کو اس بات پر مائل کر رہی تھی کہ میرا اقدام کم قدم در دست ہے بالآخر میرا دل جیت گیا۔ یہ رہی ہماری خاندانی سونے کی نگوار جس پر میں نے تمہارے یقین کے لیے معاہدہ پاسداری لکھ دیا ہے اور یہ وہ چابیاں ہیں جن سے شہر کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں اور میں خود تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ اگر چاہو تو مجھے جان سے مار دو، چاہا ہے اپنے وعدے کے مطابق اپنی دلہن بنا کر ساتھ لے جاؤ۔“ نضر اکے نے معاہدے کی نگوار اور شہر کی چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

شاہ پور نے اسی لمحے نضر اکہ کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور اپنے ملک کی طرف لے اڑا۔ جاتے جاتے اس نے شہر اتیرا کی چابیاں اپنی فوج کے سپہ سالار کو دے دیں کہ اگلی صبح وہ شہر کے دروازے کھول کر شہر میں داخل ہو جائے اور ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ شہر میں داخل ہو کر وہ قتل و غارت نہ کرے اور خاموشی سے قلعے پر قبضہ کر کے ساطرون کو زندہ گرفتار کر لے۔ اس کی اطلاع مجھے دی جائے تاکہ میں اگلا حکم دے سکوں۔

اگلی صبح خاندان ہجرا اور اس کے بانیوں کے لیے ساطرون کی شکست اور اس کی ہجرا کے لیے ایک نئے شاہ کی تخت نشینی کے اعلان کے ساتھ ہوا۔ شاہ پور نضر اکہ کو لے کر اپنے شاہی محل میں آگیا اور اس کے بعد اندرون سلطنت کی دوسری سرکش قومن اور شمال مشرق کی سرحدی مملکتوں کے ساتھ جنگ کرنے نکل گیا۔ ”استاق“ کا قلعہ جہاں ہو چکا تھا۔ اس کی فوجیں خاموشی سے قلعے میں داخل ہو گئیں اور انہوں نے ساطرون کو بغیر... کسی مزاحمت کے گرفتار کر لیا اور اسے پکڑ کر شاہ پور کی قید میں لا کر ڈال دیا جہاں اسے بے ادبی سے قتل کر دیا گیا۔ شاہ پور اپنی مہمات سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس نے وعدے کے مطابق نضر اکے کو شادی کر لی۔

نضر اکے حد خوش تھی کہ اس نے جو چاہا وہ اسے مل گیا۔ اب نضر اکے کے لیے ہر دن خوشی کا اور ہر رات چاہتوں کی پوری باتوں سے بھر پوری۔ ساطرون کو جب اپنی بیٹی کی بے وفائی کا پتا چلا تو وہ انتہائی مایوس ہوا تھا۔ گرفتار کر کے اس کو قتل بھی کر دیا گیا۔ شاہ پور اور نضر اکے آرام سے زندگی کے دن کاٹنے لگے تھے کہ ایک رات شاہ پور کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا، اس نے نضر اکے سے باتوں باتوں میں پوچھا۔

”نضر اکہ ایک بات پوچھوں..... مجھے اس کا جواب بچ

بچہ۔“ ”آئی! ای نے ایک کپ چینی منگوائی ہے۔“  
”آئی۔“ ”اچھا تو اور کیا کہہ رہی تھیں تمہاری ای؟“ ”آئی نے کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔  
”بچہ۔“ ”جی وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر وہ کنجوس ندوے تو سامنے والی بائی سے لے آتا۔“  
مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

”سچ چاہیے۔“  
”اگر تمہیں پہلے میری سچائی کا اعتبار نہیں آیا تو اب کیا آئے گا۔“ نضر اکے نے جواب دیا۔

”اصل میں جب سے میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ ایک خوا خواہ کا خوف میرے دل میں گھر کر چکا ہے۔ میں اسے رفع کرنا چاہتا ہوں۔“ شاہ پور بولا۔

”چلو یہ بھی سہی اگر اس طرح تمہارے من میں میری سچائی کا سورج طلوع ہو جائے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔“ نضر اکے تنبیہ کی سے کہا۔

”ہوں..... میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی محبت کا ثبوت طلاق کی نگوار پر معاہدہ لکھ کر تو دے دیا اور قلعے کا خفیہ راستہ بھی بتا دیا جس سے میری فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں لیکن اب تک یہ نہیں بتایا کہ تم نے اپنے باپ کو قلعے اور شہر میں داخلے کے کس طرح بے خبر رکھا تھا۔“

”میں نے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی تھی۔“ نضر اکے نے جواب دیا۔

”اچھا۔ لیکن انہی دیر بے ہوش رکھنے کی کوئی دوا تو ہمیں آج تک معلوم نہیں ہوئی۔“

”دو کا یہ مرکب مجھے شاہی حکیم سے معلوم ہوا تھا۔ جس سے انسان رات بھر کے لیے غافل اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔“ نضر اکے نے وہ مرکب شاہ پور کے پوچھنے پر بتا دیا۔

شاہ پور نے نضر اکہ کو خوش ہوتے ہوئے شہر پر ادا کیا اور اسے پھر سے اپنی محبت کا یقین دلایا اور یہ بھی کہا کہ اب اسے مکمل طور پر یقین ہو گیا ہے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس بات کو سن کر ہی دن ہو گئے۔ نضر اکہ مطمئن تھی کہ بالآخر وہ اپنے محبوب کے دل میں گھر کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

ایک روز پھر اسی طرح شاہ پور نے بڑے ہمارے

ایک روز پھر اسی طرح شاہ پور نے بڑے ہمارے



تھی۔ جب ہم اسٹوڈنٹ سینٹر میں داخل ہوئے تو وہاں لگے ہوئے پورے پورے کا نام و کچھ کر میرے حلق سے ایک غراہٹ برآمد ہوئی۔ عجیب ہے لگانا تھا۔ ”موت کا سامان۔“

”بہن دیکھانے کے لیے تم مجھے یہاں لائے ہو؟“

میں نے مڈر مسٹری ڈز میں جانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن تم کے بے حد اصرار پر میں جانے پر آمادہ ہوئی۔ دراصل ایک مختصر گروپ مقامی یونیورسٹی کیمپس میں اپنا ڈراما پیش کر رہا تھا اور یہ ڈراما سلسلے کی کڑی

## غیر اہم

تنویر ریاض

اپنے گورد خوبصورت چہروں کا ہجوم اور ان کے دلوں میں اپنے لیے گنجائش کا احساس یقیناً ہر ایک کے لیے فرحت بخش ہوتا ہے مگر کبھی کبھی یہ سب اپنا چھوٹا بہرہ بنانے اور کسی کو حسد میں مبتلا کرنے کے لیے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔۔۔ بس ایک یہی مذاق اسے بھی بہت مہنگا پڑا، جس کی قیمت اسے ہر حال میں ادا کرنا تھی۔ اگرچہ یہ بات اس کے لیے انتہائی غیر اہم تھی لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اسے اتنی مشکلات اٹھانے کے بعد ہو ہی گیا۔

سراغ رسانی میں معاہدہ کر جانے

والی ایک معمولی سی بات



”تم نے..... اکلوتی اولاد ہو کر اپنے والد کی محبتوں کا یہ صلہ دیا۔ اس سے دغا کی اور صرف اپنے عشق کو پانے کے لیے اس کی محبتوں اور جاتوں سے دھوکا کیا۔ قریب دہائی رہیں اسے..... ایک محبت کرنے والے باپ سے تنگ حرامی کی۔ تمہارا کیا اعتبار..... اور تم پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم جیسی لڑکی اپنے چاہنے والے باپ سے دھوکا کر سکتی ہے تو میرا اور میری سلطنت کا بھی ایسے ہی کام تمام کر سکتی ہے۔ یہ ساطرون عرف خون کا محل نہیں ہے۔ شاہ پور کا محل ہے، تم نا قابل اعتبار ہو..... اپنے مفاد کے لیے تم کسی سے بھی دھوکا کر سکتی ہو۔ اس سے قبل کہ تم ایسا کرو کیوں نہ تمہارا کام ہی تمام کر دیا جائے۔“

”میرے والد کو کئی یا بھائی یا بہن نہیں؟“

”نہیں میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔“

”تمہارا بچہ؟“

”نہیں میں اپنے والدین کی بڑی لاڈلی ہوگی۔“

”ہاں.....“

”نہیں! ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔“ میرے والد مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔“

”نہیں! اپنی یادوں میں گم ہو چکی تھی۔ وہ خاموش ہو رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ سے خاموشی توڑی اور کسمپرسی سے بولی۔

”میرے والد کو کئی کسی سے سب سے زیادہ پیار تھا تو مجھ سے ہی تھا۔ وہ مجھے آئے روز پیار سے شہدہ بالائی، بھگن، میوہ جات اور اپنے ہاتھوں سے پھلوں کے جوس کا جام پلاتے تھے اور اگر میں انہیں لینے سے انکار کر دیتی۔ تو وہ میرے سر کو اپنی گود میں لے کر زبردستی مجھے یہ کھلاتے پلاتے تھے۔ میری ایک لمبی کی ناراضگی سے وہ بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک میں مان نہ جاتی انہیں چین نہیں آتا تھا۔“

نہیں! اکلوتی اولاد میں اسے سب بتا دیا۔

”پتا ہے، ایک روز میں کسی بات پر والد سے ناراض ہو گئی تو انہوں نے اتنی دیر تک کھانا نہیں کھایا۔ جب تک میں راضی نہ ہو گئی تھی لیکن..... میں.....“

”وہ ایک دم سے رونے لگی۔ تب شاہ پور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اسے چھتیا یا پھر چاک اس نے نظر اسکے بالوں کو پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھما لگا۔ محبت کی جگہ اب ایک دم اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اگلنے لگی تھیں۔ نہ اس کی آنکھوں میں دیکھا..... جہاں پیار کے بجائے نفرت اور نرمی کے بجائے سختی نے لے لی تھی۔

نہیں! اکلوتی اولاد میں اسے سب بتا دیا۔

”پتا ہے، ایک روز میں کسی بات پر والد سے ناراض ہو گئی تو انہوں نے اتنی دیر تک کھانا نہیں کھایا۔ جب تک میں راضی نہ ہو گئی تھی لیکن..... میں.....“

”وہ ایک دم سے رونے لگی۔ تب شاہ پور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اسے چھتیا یا پھر چاک اس نے نظر اسکے بالوں کو پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھما لگا۔ محبت کی جگہ اب ایک دم اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اگلنے لگی تھیں۔ نہ اس کی آنکھوں میں دیکھا..... جہاں پیار کے بجائے نفرت اور نرمی کے بجائے سختی نے لے لی تھی۔

نہیں! اکلوتی اولاد میں اسے سب بتا دیا۔

”پتا ہے، ایک روز میں کسی بات پر والد سے ناراض ہو گئی تو انہوں نے اتنی دیر تک کھانا نہیں کھایا۔ جب تک میں راضی نہ ہو گئی تھی لیکن..... میں.....“

”وہ ایک دم سے رونے لگی۔ تب شاہ پور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اسے چھتیا یا پھر چاک اس نے نظر اسکے بالوں کو پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھما لگا۔ محبت کی جگہ اب ایک دم اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اگلنے لگی تھیں۔ نہ اس کی آنکھوں میں دیکھا..... جہاں پیار کے بجائے نفرت اور نرمی کے بجائے سختی نے لے لی تھی۔

تاریخ السعدی، حسین بن علی السعدی جلد اول دوم	تاریخ ہیرو ڈولس، ہیرو ڈولس ترجمہ
تاریخ طبری، علامہ ابو جعفر جریو طبری جلد پنجم	سمو مشہور کتابیں، مثلاً اشفاق ترجمہ
تہذیبوں کی کاپیا کتب کو، آرسلراک، ترجمہ حنیف کیو کٹر	طبیب النبی، پیر محمد کورہ شاہ الازہری جلد اول
تاریخ جنگ پیلو پونیشن، دیوئی ڈاڈلز ترجمہ	المختصر فی تفسیر ابنی بکر زکریا رازی ترجمہ
دی ایچ ایف، ول فیورانت ترجمہ	ایو این بعد ساسانیان، ڈاکٹر محمد اقبال ترجمہ



میں نے غم کو گھورتے ہوئے کہا۔  
”اوہ نہیں۔ تم یقیناً اسے پسند کرو گی۔“ غم نے پورے اعجاز سے کہا۔

بس عورت نے بال روم کے باہر ہمارا استقبال کیا، وہ ہر پہلے پر دانستہ نکال گئی تھی۔ اس نے ہمیں خالی کارڈ دیے جن پر ہم ڈراما دیکھنے کے دوران لکھ سکیں کہ قاتل کون ہے اور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔  
”تمہاری میز پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔“ ایک بار پھر وہ بڑے جھگڑے سے کہی۔ ”تمہارا کئی نمبر سات ہے۔“

میں بھی جواب میں مسکرا دی لیکن میں اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں سمجھ رہی تھی بلکہ میرے اندر ایک خوف بندوق جڑا ہوا تھا۔ میں نے غم کا بازو پکڑا اور دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اسے روکتے ہوئے بولی۔ ”تم نے میرے نام کی تختی پر کیا لکھوایا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے اپنی بیوی اوپر اٹھائیں اور بولی۔ ”کیا تم نے..... غم! میں قسم کھاتی ہوں اگر تم نے یہ حرکت کی ہے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔“

وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ”تھوڑا صبر کرو۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟“  
”نہیں۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”اب جانے بھی دو۔“ وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”اندر چلتے ہیں۔ ڈراما شروع ہونے والا ہے۔“ وہ ہماری چوٹی ملاقات تھی جب ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آپس میں جسدانی تعلق قائم کرنا ہے یا یونانی خوش گویاں کر کے وقت گزرتے رہیں گے، جب چند بات عروج پر تھے لیکن اس کے ساتھ ہی میں تھوڑی سی گھبرائی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ معاملات صحیح سمت میں چلتے رہیں گے۔ غم دیکھنے میں بہت اچھا اور شریف انسان تھا اور ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا جو مجھ میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس نے وسط شہر میں مووی تھیٹر کھول رکھا تھا جہاں کلاسک فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ وہاں کا پوپ کارن بہت مشہور تھا۔ وہ اپنے والدین سے راپیلے میں تھا اور ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ انہیں خط بھیجا کرتا۔ اسے گہرے رنگ کی جینز پسند تھی۔ اس کے ساتھ وہ جیتی جوتے پہنتا۔ البتہ اسے فٹ بال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تم نے اس کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، اس سے تو لگتا ہے کہ وہ خاصا دلکش ہے۔“ جیسو مری

بہترین سہیلی نے اس وقت کیا جب میں نے اسے بتایا کہ غم مجھے اپنے ساتھ کسی ”سرپرست“ پر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو خوابوں کے سہارے زندگی گزارتی ہیں اور کینڈل لائٹ ڈنسر سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اسی لیے وہ کرید کرید کر مجھ سے غم کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں خود بھی یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

دراصل یہ میری بھی غلطی تھی کہ اسے میرا اصل نام معلوم ہو گیا۔ میں نے ایک اچھی ماڈرن لڑکی بننے کی کوشش میں کچلی ڈیٹ پر اپنے جیسے کے مل کی اداسی کرنے کے لیے کرینٹ کارڈ نکالا تو اس نے مجھے منع کیا اور کارڈ مجھے واپس کر دیا۔ اس طرح اس نے میرا پورا نام پڑھ لیا۔ جب حقیقت مجھ پر واضح ہوئی تو بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ ”نہیں.....“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ مسکرا دیا۔ ”جسبیں بہت مزہ آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ نام تو طالب علمی میں ان کے ساتھ ایک ڈراما کر چکا ہوں اور وہ بہت کامیاب ہوا تھا۔“

ہماری میز کمرے کے دوسری جانب دروازے کے ساتھ تھی۔ ہمارے والدین کی عمر کا ایک مرد اور ایک عورت عمدہ لباس زیب تن کئے اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نام کی تختی پکڑی ہوئی تھی اور وہ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے پہلے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔

”یقیناً یہ ڈرامے میں حصہ لے رہے ہیں۔“ بیوی نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی یہ ایکٹرز ہمارے ساتھ بیٹھیں گے؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔“ مرد نے جواب دیا۔

”میرے نمبر سات؟“ غم نے پوچھا پھر دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے مخصوص ہے۔“

”میرا نام سبکی تھامس ہے اور یہ میرے شوہر ونسٹن تھامس ہیں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں معلوم ہوا ہے کہ مشہور سرائے نیٹھی ڈرامے ہمارے ساتھ بیٹھے گی۔“ وہ کارڈ پر انگلی مارتے ہوئے بولی۔

میں نے غم کو گھورا، پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مار، مار..... بالکل، لیکن میں اپنا

کام استعمال کرتی ہوں، ایملن۔“

☆☆☆

”کیا واقعی تم نے میرا یہی نام لکھوایا تھا؟“ میں نے لم سے پوچھا۔

”کیا میں نے کوئی غلطی کر دی؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور اس دن کو یاد کرنے لگی جب ہم پہلی بار ڈیٹ پر گئے تھے میں نے واپس آکر سیٹل کوٹون کر کے اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ شاید ہم ایک دوسرے سے سیٹل نہیں کھاتے۔ غم ایک خوش فطرت اور زندگی کے بارے میں پرامید رہنے والا شخص تھا جبکہ میں ایک دینی پٹی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی حساب کی بیچر تھی۔ ابھی تک مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جس پر میں قہقہہ لگا سکوں۔

غم کی ایک اور بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ کہ وہ دوسروں کی عزت کرتا تھا۔ یہ بات میں مسٹر تھامس کے بارے میں نہیں کہہ سکتی تھی جو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس شخص کی نظریں میرے جسم پر گڑی ہوئی تھیں اور اب مجھے سمجھتا ہوں کہ ہاتھ کے میں نے گھر سے نکلے وقت اپنا اس کاؤنٹ لمباری میں کیوں چھوڑ دیا۔

”نیٹھی ڈرامے کا نام آتا ہے۔ اب ہم یقیناً اس قتل کا معاملہ کر لیں گے۔“

میں نے ایسی بات پہلے کبھی نہیں سنی تھی اس لیے میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے والدین نے یہ مذاق میرے ساتھ کیا تھا۔“

دراصل وہ دونوں یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے تھے اور انہیں ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے سیزیموں کے بیچے اپنی لائبریری بنا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ میرے والد کی شادی میں صرف اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ وہ کسی کتاب کا آخری باب پڑھ رہے تھے۔ جب آپ گفتگوں اور آرٹ کے بارے میں اتنے پاگل ہو جائیں تو آپ سے کوئی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے میرا نام رکھتے وقت یہ نہیں سوچا کہ آگے چل کر یہ میرے لیے کتنے مسائل پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ سے مجھے طنز، جملوں اور اوقات سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ دراصل ایک سرائے رسالہ لڑکی کا کردار تھا جو اپنی غیر معمولی ذہانت سے کئی بار وہ کس عمل کر لیتی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے میں ایک طویل عرصے تک اپنے آپ کو کالج میں ایملن ارج کے نام سے تعارف کرواتی رہی لیکن جب اپنے آبائی

شہر واپس آئی تو ہر طرف سے نیٹھی..... نیٹھی کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں اور اب یہ دونوں میاں بیوی بھی جی بکھر رہے تھے کہ میں اس ڈرامے میں نیٹھی ڈرامہ کر دار اور کر رہی ہوں۔

کچھ لوگ اور ہماری میز پر آئے اور انہوں نے اپنا تعارف کر دیا لیکن وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لیے اپنی باتوں میں لگ گئے۔ غم اور میں نے نیٹھی اور ونسٹن سے تھوڑی بہت بات کرنے کی کوشش کی لیکن مزہ نہیں آیا۔ ونسٹن اپنی بات کی وضاحت کے لیے کسی نہ کسی بہانے میرے کندھے یا بازو کو ہاتھ لگاتا اور بھول جاتا کہ میں اس کی بیٹی کے برابر ہوں۔ ہم نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں جراثیم کی دنیا کے بہت شوقین ہیں اور مسٹری سوڈز کے علاوہ باقاعدگی سے اس طرح کے ڈرامے دیکھنے جاتے ہیں۔

”یہ مجھے زبردستی لے جاتا ہے۔“ مسٹر تھامس نے کہا۔ ”حالانکہ وہاں ہمیشہ بہت ہی گھٹیا کھانا ملتا ہے۔“ پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”نہ صرف یہ شوز آؤٹ دینے والے ہوتے ہیں بلکہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی بور ہوتے ہیں۔“ اس نے ایک وقت لیا اور ہمیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”موجودہ کمیٹی ان سے مختلف ہے۔“

میرے برابر میں بیٹھے ہوئے غم نے قہقہہ لگایا لیکن اس میں بے ساختگی نہیں تھی۔ میں نے موضوع بدلنے کی خاطر مسٹر تھامس سے پوچھا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟“

اس نے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”تم تو سرائے رسالے ہوتی..... تم مجھے بتاؤ۔“ میں نے زبردستی ایک قہقہہ لگایا اور اپنی کرسی ٹم سے قریب کر لی۔

مسٹر تھامس نے مجھ پر ایک بیڑمی نگاہ ڈالی اور اپنی جینٹ کا گریبان کھینچتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں کالج کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔“

غم آگے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”ایملن کے والدین بھی یہاں انکس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔“

”اوہ اچھا۔“ مسٹر تھامس نے بدحواس ہوتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی ہمارے اور قریب کر لی۔

”اور ایملن بھی نیچر ہے۔“ غم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی آفٹر اسکول پروگرام میں طالب علموں کو بلا معاوضہ پڑھاتا ہوں۔“



آگنی ہے۔

”میں کوشش کروں گی کہ ایسا نہ ہو۔“

اس طرح ہوتے ہوئے بولی۔

میں ان کے پاس سے گزر کر اس راہداری میں چلی



مکئی جہاں مردوں اور عورتوں کے ریست روم تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مردوں کے روم میں داخل ہوتی۔ میں دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوئی لیکن مجھے کچھ سنا نہ دیا پھر میں نے نیچے دیکھا تو مجھے نائل کے فرش پر سرخ قطرے نظر آئے۔ میں نے جبکہ کر قریب سے دیکھا تو وہ مجھے کیلے لگے۔ میں نے لیڈ بزدل سے بچہ ناول لیا اور ان قطروں پر رکھا۔ سرخ خون پچھرا ناول پر پھیل گیا۔

اس خون کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کیا واقعی وینٹن تھامس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا جو میرے والدین نے سنایا تھا کہ کس طرح یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو نشے میں دھت دو بھائیوں نے گھیر کر تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ کہیں پروفیسر کے ساتھ بھی کچھ ایسا تو نہیں ہوا؟

مردوں کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں پیچھے ہٹی اور وہ ناول اپنے پیچھے کر لیا۔ وہاں ایک نوجوان شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی ناک پر بڑی سی تولیا کی پٹی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹا اور ہنسنے ہوئے بولا۔ ”معاذ کرنا، میری نکسیر پھوٹ گئی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ احمقانہ انداز میں ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

واپس جاتے ہوئے میں ایک سگریٹ پینے کے لیے رک گئی۔ گوکہ میں ایک عرصے سے اسے چھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید تھامس پارکنگ لاٹ میں کسی اور عورت کو رشتہ بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ وہ اسی ٹائپ کا آدمی تھا جو اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں سگریٹ کا پیکٹ نکالتی، سیسل کا ایک اور پیغام آ گیا۔

”کیا تم نے ابھی تک اسے دھکا نہیں دیا؟ میں تو بار کے باہر خوب صورت لوگوں میں گھری ہوئی ہوں۔“ میں نے قہقہہ لگایا اور کسی سے گمراہے نکراتے ہوئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

وہ واقعی ایک خوب صورت عورت تھی۔ میں حیران تھی کہ سیسل کا تصور اتنی جلدی حقیقت بن کر میرے سامنے آ گیا۔ وہ کتنا فراہم کرنے والی لگتی تھی کہ تمنا مند تھا اور اپنی دین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

”کچھ کھو گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

دراصل میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“

سینٹی کے دو بڑی عمر کے آدمیوں نے ہم پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور ایک چھلڑے کو عمارت میں دھکیلے گئے۔ ”تم نے کسی موٹے شخص کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”موٹا شخص؟“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، اگر دیکھا ہوتا تو مجھے ضرور یاد آ جاتا۔“

وہ ایسا بندہ تھا کہ سیسل اسے دیکھ کر فوراً ہی پھسل جاتی۔ اس نے بڑے دلکش انداز میں پوچھا۔ ”کیا تم کسی کا انتظار کر رہی ہو؟“

میں نے شرما تے ہوئے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ کیا تم بھی مرد و سٹری ڈر میں آئے ہو؟“

”اوہ ہاں۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مرڈر..... میرا راج کا نام ہے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“ میں نے چڑکھا۔

”کیونکہ میں ایک پراسرار شخص ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجہ میں بولا۔

دروازے کے اندر سے اس کے ایک ساتھی نے سینٹی بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ گھبرا کر بولا۔ ”معاذ کرنا..... مجھے کام پر جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”عجیب اتفاق ہے کہ اے پوے متوجہ پر میں ہمیشہ ڈیوٹی پر ہوتا ہوں۔ بہر حال تم اپنے ڈنک کا مزہ لو۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن رک گئی۔ پھر کچھ سوچ کر تھوڑا سا سافٹ پاتھ کی جانب بڑھی اور یوں ظاہر کیا جیسے میں اپنا سونپا کھینچ کر رہی ہوں لیکن درحقیقت اس کی تصویر لینا چاہ رہی تھی تاکہ سیسل کو بھیج سکوں۔ یہ یقیناً مسٹر تھامس کی ڈراؤنی تصویر کے برعکس ہوگی جو میں اسے پہلے بھیج چکی تھی لیکن جیسے ہی میں نے تصویر لینے کے لیے فلیش دیا یا اس کا ایک سامی دوبارہ وین کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میرے راستے میں آ گیا اور مجھے ٹھوکر مارنے لگا۔ میں نے گھبراہٹ میں کھیرا نیچے کر لیا اور تیزی سے عمارت کی طرف جانے لگی۔ یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں مستقل مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ جب میں اس کی نظروں سے اوچھل ہو گئی تو تصویر کو پھینک گیا۔ یہ میری بد قسمتی کی تصویر میں دین کا پچھلا

نقص اور اس لڑکے کی صرف کہنی آئی۔ میں نے وہ تصویر صاف کر دی اور ایک سرخا ہوا بھر کر آگے بڑھ گئی۔

میں نے اس امید پر اسٹوڈنٹ سینٹر کے گرد چکر لگایا کہ شاید یہاں مسٹر تھامس سے سامنا ہو جائے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ میں واپس اس جگہ پر آئی جہاں کینٹرنگ والے کھڑے ہوتے تھے لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا اور ان کی دین بھی جا چکی تھی۔ مجبوراً میں مایوسی کے عالم میں واپس لوٹ آئی۔

”تم کہاں رہ گئی تھیں؟“ تم نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”تم نے ڈیوٹی مگس کر دیا۔ میں تو پولیس کونون کرنے والا تھا۔“

”کیا وجہ ہے کہ آج سب لوگ یہاں سے غائب ہوئے ہیں؟“ ہمارے برابر والی میز پر بیٹھی ہوئی عورت نے کہا۔ ”کیا یہاں بھی کوئی جرم ہونے جا رہا ہے؟ شاید اسی لیے تم نے پورا ڈراما نہیں دیکھا۔ اب ہم یہ انعام جیت جائیں گے اگر ہم نے نقل کا معاملہ کر لیا۔“

میں اسے نظر انداز کر کے ٹھیک کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”میں تازہ ہوا کے لیے باہر گئی تھی لیکن جب واپس آئی تو وہاں اسے پتہ نہ تھا۔“ اس نے خفگی سے انتقام کی ایک نئی نئی سٹری ڈر کی آواز سن لی اور اس طرح میں اندر آنے میں کامیاب ہو گئی۔

”تم تازہ ہوا کے لیے باہر گئی تھیں یا اس شخص کو اچھڑنے؟“ تم نے کہا۔

”وہ شخص؟“ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں اس کینٹرنگ والے لڑکے کا خیال آیا لیکن فوراً ہی سمجھ گئی کہ تم کا اشارہ کس جانب ہے۔ میں نے مسٹر تھامس کی خالی کرسی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں ایسا کیوں کروں گی؟“

”کیونکہ تمہیں پراسرار واقعات پسند ہیں۔ چاہے تم اس کا اعتراف نہ کرو۔“

”یہ اتنا بات ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

”تم خوش قسمت ہو کہ ابھی سویت ڈش آتا باقی ہے۔“ جب سویت ڈش پیش کی جا رہی تھی تو مسٹر تھامس بھی واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ کہیں نہیں ملا۔“ اس نے اس کا ٹھہرا لیا۔ گھر پر بھی فون کیا لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ٹھہر والوں کا کہنا ہے کہ شاید وہ باہر نکل گیا لیکن میں نے کار میں بھی دیکھ لیا۔ میری کچھ ٹھہر

## وائرس

سائنسدانوں نے کہا ہے کہ کیلے میں اینڈز کے وائرس سے تحفظ فراہم کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس کی مدد سے مستقبل میں اینڈز کے علاج میں پیش رفت ممکن ہے۔ اس سلسلے میں لیبارٹری میں کیے گئے تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ کیلے میں شامل ایک جزو Ban Lec میں وہی خوبیاں موجود ہیں جو اس وقت HIV کے خاتمے کے لیے استعمال کی جانے والی دو دواؤں میں ہوتی ہیں۔ سائنسدانوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ ”بین لیک“ یعنی سستی دواؤں کی تیاری سے لاکھوں جانیں بچائی جائیں گی۔ مختلف پودوں میں پھرتی طور پر پائے جانے والے ایسے کیمیکل یا تو انٹیکٹین کا مقابلہ کر سکتے ہیں، Lectin کہلاتے ہیں اور ”بین لیک“ بھی لیکٹین کی ایک قسم ہے۔ امریکی ریسرچرز نے اپنی تحقیق میں یہ دیکھا ہے کہ کیلے میں پایا جانے والا لیکٹین جسم میں وائرس کے داخلے کو روک دیتا ہے اور اس طرح ایچ آئی وی سے تحفظ فراہم ہو جاتا ہے۔ ”بین لیک“ اس لحاظ سے پروٹین پر اثر انداز ہوتا ہے جس میں ایچ آئی وی کا جینیائی مواد محفوظ ہوتا ہے۔ مثلاً مگن یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اس ریسرچ کے قائد مائیکل سوانسن نے کہا ہے کہ ایچ آئی وی کی بعض دواؤں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اینڈز کا وائرس اپنی مہمیت تبدیل کر کے دواؤں کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تاہم لیکٹین کی موجودگی میں یہ کام وائرس کے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ لیبارٹری میں ”بین لیک“ کو اس طرح موثر پایا گیا جس طرح اس وقت ایچ آئی وی کے خلاف استعمال کی جانے والی دواؤں T-20 اور ”سیرا وروک“ موثر ہیں۔ مائیکل سوانسن ”بین لیک“ کی جیت کو تبدیل کر کے اسے انسانی مریضوں کے لیے قابل استعمال بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ریسرچرز نے توقع ظاہر کی ہے کہ اسے تھوڑے عرصے کے طور پر یا دیگر انتہائی ایچ آئی وی دواؤں میں شامل کر کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو دنیا بھر میں لاکھوں جانیں ضائع ہونے سے بچائی جاسکیں گی۔



آرہا کیا کروں؟

”کیا تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟“ میں نے کہا۔  
”نہیں شکریہ۔“ پھر اس نے میری کرسی کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا فون گر گیا ہے۔“

”میرا فون؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔  
”میں نے جھک کر دیکھا، کرسی کے نیچے میرے آئی پوڈ فون کا کیس پڑا ہوا تھا۔ یہ غالباً اس وقت گر گیا ہوگا جب میں اپنا فون بیگ میں ڈال رہی تھی۔ میں نے جھک کر وہ کیس اٹھایا۔ اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا پھر مسرتاً مسرتاً دیکھا۔ مجھے اپنے گال سرخ ہوتے محسوس ہوئے۔ میں نے دل میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔“

مسرتاً مسرتاً مجھے میں بڑبڑاتی ہوئی ہمارے ساتھ چل دی۔ ہم اس وقت ہال سے گزر رہے تھے۔ ”مجھے امید ہے کہ اس نئے سیکورٹی سسٹم کی وجہ سے وہ اپنے دفتر میں بند ہو گیا ہوگا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے رات بھر وہیں رہنے دیا جائے۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری جگہ میں بھی یہی کرتی۔“ میں نے کہا۔ اس احمق پروفیسر نے کسی طرح چپکے سے وہ کاغذ میرے فون کے کیس میں رکھ دیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں اس سے تصویروں کی نمائش کے قریب نیچے میزیوں پر ملوں پھر وہ مجھے تنہائی میں پوری نمائش دکھائے گا۔ اس نے بھی سوچا ہوگا کہ یہ میرے آئی پوڈ فون کا کیس ہے۔ اسی لیے اس نے جاتے وقت مجھے بڑے بے ڈھنگے پن سے آٹھ ماری اور کہا کہ میں اسے فون کروں۔ اسی لیے میں وہ دفعہ پڑھ کر جان گئی کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح کھیت رہی ہوں۔“ مسرتاً مسرتاً نے کہا۔ اب وہ تھوڑی سی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”کیا تم مذاق کر رہی ہو؟ مجھے تو مزہ آرہا ہے۔“ تم نے کہا پھر اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب ہے، مجھے افسوس ہے کہ تمہارا شو ہر اس وقت مشکل میں ہے۔“

”مشکل میں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم نے ابھی مشکل دیکھی نہیں ہے۔“  
ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں دو عدد ڈبل شیشے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر خوب صورت

الفاظ میں لکھا ہوا تھا..... ”پیچرس آرٹ گیلری۔“

”یہ وہ جگہ جو وہ تمہیں اکیلے میں دکھانا چاہ رہا تھا۔“ مسرتاً مسرتاً نے مجھے اوپر سے پیچنگ دیکھتے ہوئے جی سے کہا جیسے اسے یقین نہ ہو کہ میں نے پروفیسر کی پیشکش کو سنجیدگی سے لیا تھا یا نہیں۔ ”نیشنل گیلری اس طرف ہے۔“  
جب اس نے دروازے کی تاب گھائی تو مجھے اپنا سانس روکنا ہوا محسوس ہوا۔ میں سوچ رہی تھی کہ دروازے کے دوسری جانب مسرتاً مسرتاً نہ جانے کس حال میں ہوں گے لیکن دروازہ منتقل تھا۔ گوکہ ہم نے کئی بار زور سے دینگ دی اور مسرتاً مسرتاً نے حسب عادت دھمکیاں بھی دیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

”ممکن ہے کہ وہ گیلری میں ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا اور ہم دائیں ڈبل دروازوں کی جانب چل دیے۔  
”مجھے یقین ہے کہ گیلری بند ہوگی۔“ مسرتاً مسرتاً نے بڑے وثوق سے کہا لیکن جیسے ہی اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے آواز طرح سے سے کھٹکا چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کسی نے دھات کے تالے پر پیپ کا ٹکڑا چکا دیا تھا تاکہ وہ بند نہ ہونے پائے۔

ہم گیلری کے اندر چلے گئے۔ وہاں کافی گھنٹہ سے لگتا تھا کہ ہوا کے گزرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ ہمارے بالکل سامنے دائرہ بکری بنی ہوئی نیلے پھولوں کی ایک بہت بڑی تصویر تھی۔ مجھے پھولوں کی زیادہ پہچان نہیں اس لیے میں کہہ سکتی کہ وہ کون سے پھول تھے لیکن اس کے نیچے ایک چھوٹے سے پلے کارڈ پر ان کا نام لکھا ہوا تھا..... ”پلیو پیو پیو“ اور یہ دلم رچہ ڈکی اسٹیٹ کی جانب سے عطیہ کی گئی تھی۔

”یہ پرکی پینٹنگ اس طرف ہے۔“ مسرتاً مسرتاً نے ہمیں بتایا۔ ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ہمارے سامنے ایک بڑی خالی سی دیوار تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر ایک چھوٹی سی میز پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔

مسرتاً مسرتاً نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”تصور غائب ہے۔“ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ ”کسی نے اسے چوری کر لیا۔“  
تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آگئی۔ ان کے ساتھ دوسرا خرمساں بھی تھے۔ مرد کا نام اسمیل تھا۔ میں یہ نام سن کر اس سے کوئی اطمینان مذاق کرنے والی تھی لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو روک لیا۔ البتہ اس ہنگامے میں عورت کا نام

مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیں وہاں ٹھہرنے کے لیے کہا اب تک وہ جانے تو کسی تلاش میں نہ لے لیں۔

مسرتاً مسرتاً زار و قطار رو رہی تھی۔ شوہر سے اس کی ناراضی اب خوف میں بدل چکی تھی۔ ”کیوں وہ اسے اپنے ساتھ یہ خیال بنا کر تو نہیں لے گئے؟“ اس نے ہم سے پوچھا۔ اس نے ایک ہلکا سا ٹھہرنا رکھا تھا جس میں وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ میں نے اسے اپنا سویٹر دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بلڈنگ منیجر اسے دلا سا دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اسے اپنا کام بھی دیکھنا تھا۔

تم اور میں فٹ پاتھ پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی ڈزجیکٹ میرے شانوں پر ڈال دی کیونکہ ہم دونوں کے کوٹ عمارت کے اندر ہی رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد پولیس والوں نے ہمیں اندر بلایا اور سوالات شروع کر دیے..... مسرتاً مسرتاً کب غائب ہوئے؟ ہم نے کیا دیکھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنی طرف سے ان کا جواب دینے کی پوری کوشش کی لیکن میرے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے وقت کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔ انہوں نے ہمیں جاننے کی اجازت دے دی لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ مسرتاً مسرتاً کا نام پھر زور سے لہذا ہم اس کے پاس اسی دم گئے۔

ہم ابھی مسرتاً مسرتاً کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ عمارت کی منیجر ہمارے پاس آئی۔ وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا چاہ رہی تھی اور ہمیں قائل کرنا چاہ رہی تھی کہ پروفیسر کے ٹیکے کا کوئی بھی فرد کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا۔ ”یہاں ہر طرف کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی بھی شخص کیمرے کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکتا ہے۔ لوگ یہاں ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں اور ہم نے آج ہی اپنے سیکورٹی سسٹم کو آپ ڈیٹ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دروازے ہر وقت بند نہیں ہوتے۔ جب کیمرنگ والے اپنا سامان اندر رکھ دیتے تو اس وقت دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایسے میں کوئی بھی اندر باہر جاسکتا ہے۔“

”کیمرنگ والے؟“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کون کیمرنگ والے؟“

”ہاں وہی جنہوں نے اس ڈزے کے لیے کھانے کا اہتمام کیا ہے بلکہ میں نے ان سے پوچھا بھی تھا کہ کیا انہوں نے مسرتاً مسرتاً کو دیکھا ہے۔“  
”ہم نے اس ڈزے کے لیے کسی کیمرنگ والے کو نہیں

بلایا۔ ہماری اپنی کمیٹی ہے۔ البتہ ان کا سارا سامان اسی عمارت میں رکھا جاتا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گئی کہ پھر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو کیمرنگ کمیٹی کا نمائندہ ظاہر کیا؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، بیٹروں میں عمارت سے باہر بھاگتے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک خاتون سراخ رساں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”سنگی! بہتر ہے کہ تم اندر آ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے تم شہدہ فرد کو تلاش کر لیا ہے۔“  
جب سراخ رساں میں نے میرا بیان لیا تو وہ اس بات پر خوش نہیں گئی کہ مجھے وہیں پر لکھا ہوا نام کیوں یاد نہیں رہا۔ ”وہ کوئی عام سامان تو اس تمام دروازے پر ایک نیلے رنگ کا لوگو ہوا تھا۔“ میں صرف یہی بتا سکتی تھی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سراخ رساں اسمیل بولا۔ ”وہ لوگو کئی بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس شہر میں سفید رنگ کی کتنی دین موٹر ہیں؟“

میں نہیں جانتی تھی لیکن اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ وہ اسپتال والوں سے اجازت لینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ مسرتاً مسرتاً کا بیان لیا جاسکے۔ میرے فون کے کیس میں دفعہ ڈالنے کے بعد وہ گیلری میں جا کر میرا انتظار کرنے لگا لیکن وہاں اس کا سامنا چودوں سے ہو گیا جنہوں نے اس کے سر پر ضرب لگائی اور اس کے دفتر کے برابر والے کمرے میں بند کر دیا۔ پولیس کو وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے کراہنے کی آواز آئی۔ جب انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس کے لیے اسی کی بالی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر گہرا اثر آیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

ان کیمرنگ والوں کے بارے میں مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اس ڈزے سے پوچھا کہ کیا تم مرڈر مسز کی لیے آئے ہو تو اس نے جواب دیا کہ مرڈر سیرانچ کا نام ہے جو کہ ایک اطمینان بات تھی۔ اس نے صرف مجھ سے پوچھا چھڑانے کے لیے ایسا کہا تھا جبکہ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ سے فلرٹ کر رہا ہے۔ پھر میں نے مسرتاً مسرتاً کے بیان کے بارے میں سوچا۔ وہ پولیس والوں کو بتا رہی تھی کہ چوری ہونے والی تصویر بہت بڑی تھی اور کوئی اسے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ کر نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس کا سارا ایک میز کے برابر تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ وہ کوئی سامان نہیں اتار رہا



تھاجب میں اس کے پیچھے مٹی تو میں نے دیکھا کہ وہ دین کے اندر کوئی چیز دھکیل رہا تھا۔

”ایک! میرے خدا، تم کہاں رہ گئی تھیں؟ میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے ایک بڑی زبردست کہانی ہے۔“

سپیل کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سننے کی کوشش کی۔ وہ کسی لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی پھر میری توجہ فوراً ہی تم کی جانب چلی گئی جو ہمارے کوٹ لے کر آ رہا تھا۔

میں نے سپیل سے کہا۔ ”ہم کل بات کریں گے۔ رات کافی ہو چکی ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ تم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنا نام پسند نہیں لیکن آج تم بہت اچھی سراغ رساں ثابت ہو گئیں۔“

”بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سراغ رساں مگی کا خیال ہے کہ میرے فضول سے بیان کی بنیاد پر ان لوگوں کو پکڑا ممکن نہیں۔ مجھے صرف وہی یاد رہا جو میں نے وین پر لکھا ہوا دیکھا جو کہ کافی ہے۔“

”تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ ویسے بھی اس وقت تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ چور ہیں۔“

جب مجھے یاد آیا کہ اس وقت میں نے سپیل کو بھیجنے کے لیے اس لڑکے کی تصویر اتاری تھی لیکن بعد میں متاوی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں بھی یہ ہمت نہ کرتی کہ اس کی تصویر لینے کی کوشش کروں۔“

”کیا؟“

میں نے اسے اس تصویر کے بارے میں بتا دیا جو میں نے سپیل کو بھیجنے کے لیے اتاری تھی۔ ”لیکن میں نے اسے ڈیلیٹ کر دیا کیونکہ وہ خراب ہو گئی تھی۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی ٹاک کو دبا دیا اور بولی۔ ”دفع کرو۔“

”نہیں۔ میرے کرو۔“ وہ بولا۔ ”تم مجھے اپنا فون دو۔“

اس نے کچھ ٹوٹا شروع کیا اور میں لائق بنی اپنے کوٹ کی زپ سے چھپتی رہی پھر میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی اور وہ بولا۔ ”مل گئی۔“

”کیا..... کیسے؟“ میں نے پوچھا اور اس سے فون چھیننے کی کوشش کرنے لگی لیکن اب اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”اس میں ان کا پورا فوٹو موجود ہے۔“ اس نے میرا فون اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کوئی غلطی نہ کیا۔“

جس کی وجہ سے وہ تصویریں ضائع ہونے کے بجائے محفوظ ہو گئیں۔ باقی داوے..... تم نے بہت خوف ناک سیلفیاں بنائی ہیں۔“

میں نے شرما کر ایک بار پھر اس سے فون لینا چاہا لیکن تب تک وہ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ چکا تھا جہاں پہلے پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اب وہاں ایک ہی بیٹروں کا روہ گئی تھی اور ایک آفیسر اس میں بیٹھ رہی تھی۔

”میں دیکھ کر دوڑ گئی اور بولی۔“ سب ہنسیک تو ہے؟“

”تم مگی کو فون کرو۔“ تم نے اسے میرا ٹیک فون دیتے ہوئے کہا۔

”اسے بتا دو کہ ہمارے پاس وین کی تصویر ہے اور شاید اس پر لائسنس پلیٹ کا نمبر بھی ہے۔“

اس کے بعد پولیس کے لیے مجرموں تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ وہ تصویر بھی برآمد کر لی لیکن سراغ رساں مگی اب بھی مجھ سے خوش نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے شکایت کیا۔ ”تمہیں چاہیے تھا کہ پہلے ہی اس تصویر کے بارے میں بتا دیتیں۔“

”میرے نزدیک وہ ایک غیر اہم بات تھی اور ویسے بھی میں اپنے طور پر اس تصویر کو ڈیلیٹ کر چکی تھی اور مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب بھی میرے نوٹس میں محفوظ ہے۔“

”دیکھ لو۔“ اسی تصویر کی بدولت ہم مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ ایک اچھے گواہ کی یہی خوبی ہے کہ وہ پولیس کو سب کچھ بتا دیتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم بات کیوں نہ ہو۔“

اب میں مگی کو کوا بتاتی کہ میں نے محض تفریحاً اس لڑکے کی تصویر لینے کی کوشش کی تھی تاکہ سپیل کو بھیج سکوں اور اسے بتا دیتا کہ میرے ارد گرد ہر ذریعہ جیسے بڑے کھوسٹ ہی نہیں بلکہ اس کیئرنگ والے جیسے خوب صورت لڑکے بھی منڈلاتے رہتے ہیں۔

مگی کے جانے کے بعد تم نے کہا۔ ”تمہاری سراغ رساں کی چکر میں ہم سوئٹ ڈش سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک ریسٹوران ہے۔ وہاں بڑی اچھی جاکٹ ملتی ہے۔“

”چلو۔“ میرا بھی کافی پیسے کا موڈ ہو رہا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے مجھے میری منزل مل گئی ہے۔

## رائگاں

مظہر سلیم ہاشمی

ستا ہے درندہ صفت انسانوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں جو زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ کر جب دل چاہے کسی کی جان لے لیتے ہیں مگر یہاں تو اچانک اس درندے کو ایک رشتے کی محض یاد نے ہی خون کے آنسو رو لادھا۔

### بریلی شاموں میں ایک خون آسمان روزاد

”غم و آلام میں بھاگ دوڑ کرتے کرتے چند پھل لے لے ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان سب کچھ چھوڑ کر صرف آرام کرنا چاہتا ہے۔“ میں روزنامے میں اپنی یادداشتیں لکھتی کر رہا تھا۔

یہ سزا آنکھوں والا پاکستانی بڑا باشندہ، ایک محنت کش تھا جس کے ماں باپ ہجرت کر کے کینیڈا آنے لے گئے۔

انہوں نے آئیے میں یہ برف صاف کرنے والے مٹلے کا سربراہ تھا۔ شدید برف باری کے دنوں میں یہ رضا کاروں کو بلا لیا کرتا اور کافی مناسب ادائیگی کر دیتا تھا۔

میں برف صاف کرنے کا اتنا تجربہ رکھتا ہوں جتنی اس کی عمر بھی نہ تھی۔ میری یوڑمی ہڈیاں اب مشقت کی اہلی نہیں رہی تھیں ورنہ یہ بڑے داری کی اور کے ہر درکار ناممکن تھی۔

میں نے اپنی جگہ پر اپنے مکان سے باہر آ گیا۔ یہ ایک قدیمی اور سانحہ زدہ مکان تھا جو مالک مکان خاتون کی وفات کے بعد سے میری ہی ذمہ داری بن گیا۔ میں یہاں رہتا تو ہوں لیکن دیکھ بھال کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ جن دنوں لغاری مجھے کام پر نہیں بلاتا تب میں اپنے جاننے والوں کو خط لکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے بچے کا سراغ مل جائے۔ کچھ لوگوں کا جواب آ بھی جاتا ہے..... لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کوئی بھی یہ بات بتانے سے قاصر

نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنی جگہ پر اپنے مکان سے باہر آ گیا۔ یہ ایک قدیمی اور سانحہ زدہ مکان تھا جو مالک مکان خاتون کی وفات کے بعد سے میری ہی ذمہ داری بن گیا۔ میں یہاں رہتا تو ہوں لیکن دیکھ بھال کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ جن دنوں لغاری مجھے کام پر نہیں بلاتا تب میں اپنے جاننے والوں کو خط لکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے بچے کا سراغ مل جائے۔ کچھ لوگوں کا جواب آ بھی جاتا ہے..... لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کوئی بھی یہ بات بتانے سے قاصر

نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنی جگہ پر اپنے مکان سے باہر آ گیا۔ یہ ایک قدیمی اور سانحہ زدہ مکان تھا جو مالک مکان خاتون کی وفات کے بعد سے میری ہی ذمہ داری بن گیا۔ میں یہاں رہتا تو ہوں لیکن دیکھ بھال کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ جن دنوں لغاری مجھے کام پر نہیں بلاتا تب میں اپنے جاننے والوں کو خط لکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے بچے کا سراغ مل جائے۔ کچھ لوگوں کا جواب آ بھی جاتا ہے..... لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کوئی بھی یہ بات بتانے سے قاصر

نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنی جگہ پر اپنے مکان سے باہر آ گیا۔ یہ ایک قدیمی اور سانحہ زدہ مکان تھا جو مالک مکان خاتون کی وفات کے بعد سے میری ہی ذمہ داری بن گیا۔ میں یہاں رہتا تو ہوں لیکن دیکھ بھال کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ جن دنوں لغاری مجھے کام پر نہیں بلاتا تب میں اپنے جاننے والوں کو خط لکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے بچے کا سراغ مل جائے۔ کچھ لوگوں کا جواب آ بھی جاتا ہے..... لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کوئی بھی یہ بات بتانے سے قاصر







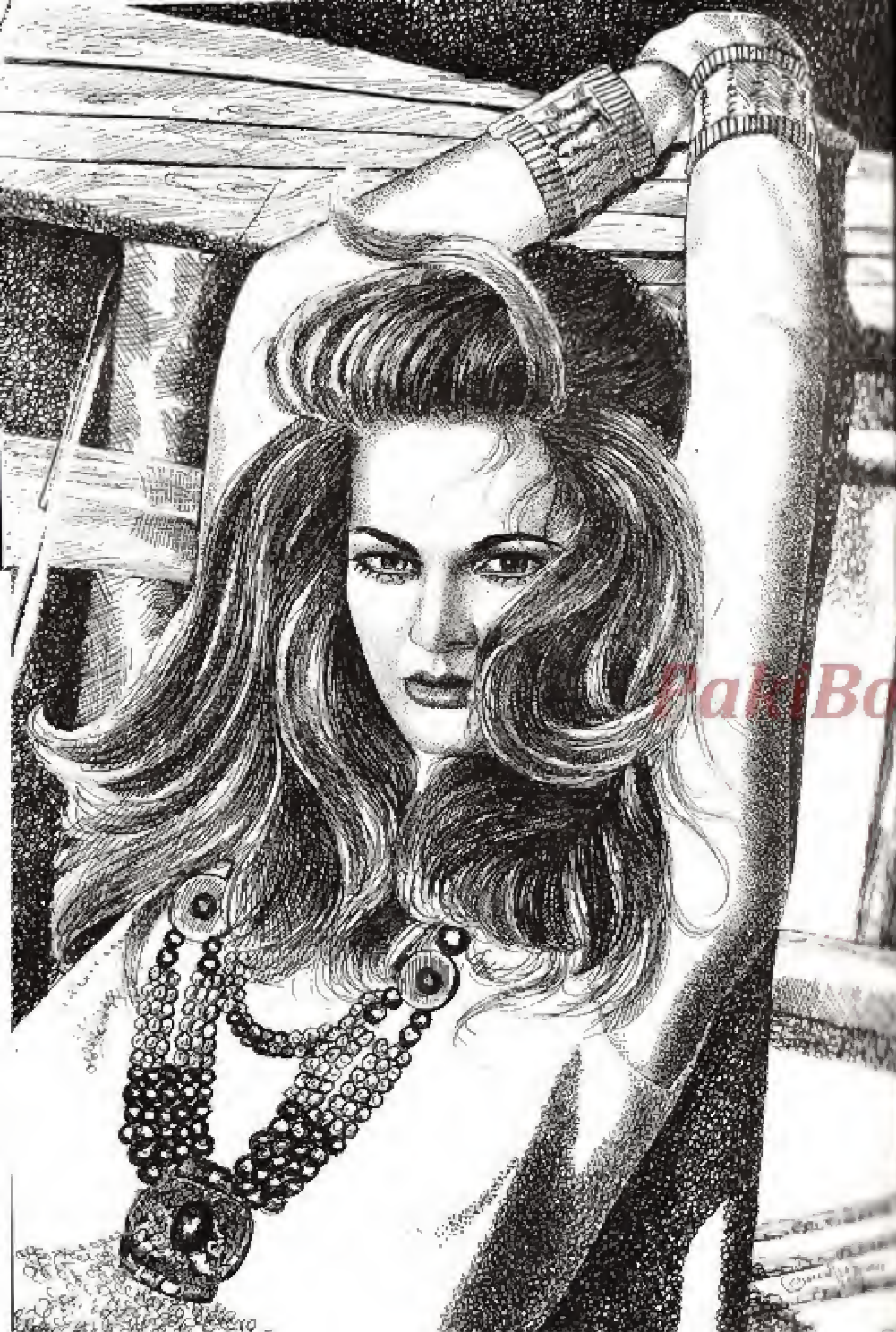
تراش بلینہ کو کام کرنے کے لیے زیادہ وقت دے گا تھا۔ عجبیہ آئینے میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔  
 ”آپ کا بیٹا اب کیا کرتا ہے؟“ لڑکے نے اچانک سے سوال کیا۔ وہ شاید بھول رہا تھا کہ میرا بیٹا واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ پھر وہ شاید صرف غفلت کو آگے بڑھاتا چاہتا تھا اس لیے بات کر رہا تھا۔  
 ”وہ نگڑی کا کام سیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ جب وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔“  
 ”اس میں تو اچھی کمائی ہو جاتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر سر کو ہلاتے ہوئے بات کو بڑھایا۔  
 ”میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اس وقت تو وہ صرف بڑے بڑے تختے ڈھونڈنے کا کام ہی کرتا تھا۔“  
 ”یہ تو بڑا ہی مشکل کام ہے۔“ وہ سٹیٹی بجاتے ہوئے بولا۔  
 ”مجھے صرف دو ہفتے کے لیے کرنا پڑا تھا اور پورا مہینہ میرے کندھے تکلیف سے ڈکتے رہے تھے۔“  
 ”یقیناً یہ سخت جان لوگوں کا کام ہے۔“ میں نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اگر وہ تختے ڈھونڈنے والا مشکل کام کر سکتا تھا تو یقیناً مضبوط جسم کا حامل تھا۔  
 لغاری کی برف صاف کرنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر میں چونک گیا۔ اپنی گاڑی کو میں پہلے گیزر میں لے آیا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔  
 ”تھک جاؤ۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم میرے پاس کو نظر آ گئے تو تمہیں لفٹ دینے کی پاداش میں مجھے کام سے نکال دیا جائے گا۔“  
 لڑکا حکم کی تعمیل کرنا چاہتا تھا۔ فوراً ہی سیٹ کے نیچے کی طرف دیکھ گیا۔ آفتاب لغاری کی گاڑی کی روشنی براہ راست مجھ پر پڑ رہی تھی۔ پہلو میں پڑے ریش پر بھی یہ روشنی منعکس ہونے لگی تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے پھر بھی ہاتھ ایسے ہلایا جیسے وہ مجھے نظر آ رہا ہو۔ پاس سے گزرتے ہوئے ہم دونوں نے ہارن بجایا اور ایک دوسرے کو مخصوص انداز میں سلام کیا۔  
 میں اب قہقہے کے مرکز کی طرف جا رہا تھا، اس کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا۔ میں اپنا کام نہایت صفائی سے کرنا چاہتا تھا لیکن لغاری کا چھچھا کرنا گاڑیوں نے جب میری جانب رخ کیا تو مجھے اپنے اعصاب میں کشیدگی سی محسوس ہوئی۔ میں کسی ایکٹیوٹ کا مو جب نہیں بننا چاہتا تھا۔ لڑکا اب سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا اور جب اس نے یوں شروع کیا تو میری بے چینی سوا ہوئی۔

”اس علاقے سے گزرتے ہوئے میں کافی خوفزدہ تھا۔“ وہ بولا۔  
 ”اچھا۔۔۔۔۔“ میں نے ایک لفظی جواب پر اکتفا کیا کیونکہ کسی گاڑی سے نگر جان لیوا ہو سکتی تھی۔  
 ”یہاں میرے جیسے لفٹ مانگنے والے اکثر ہلاک ہو جاتے ہیں۔“ وہ سسٹی خیر اعزاز میں بولا۔  
 ایک شخص ہارن بجاتا ہوا مجھے کراس کر گیا۔ ٹھکر کا مقام تھا کہ اتنی کم چوڑی سڑک پر کھائی میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے سڑک پر غور کیا تو آفتاب لغاری کافی سارا کام میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے حصے کی صفائی بھی مجھے ہی کرنا تھی۔  
 ”ایک سپاہی کی تو صرف ہڈیاں ہی ملیں۔۔۔۔۔ بہت نازک صورت حال تھی۔“ لڑکے نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔  
 صرف ایک کار وہ تھی اور جب بالکل کنارے سے ہو کر وہ بھی گزر گئی تو میں نے اپنے کندھوں اور سر کو آرام دیا۔  
 ”میرا جسم زبردست ہوتا تھا اور پینا آ رہا تھا۔“  
 ”اس سپاہی کے بارے میں کوئی معلومات ہیں کیا تمہارے پاس؟“ اس نے رساں سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“  
 ”اس کا بیگ“ جس شخص نے اس کی گاڑی سے اٹھا۔  
 تمام سامان کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی اس میں ہی بند تھیں۔  
 وہ ایک جھرمچ کر لیتے ہوئے بولا۔  
 ”ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔ بہت برا ہوا تھا وہ تو۔۔۔۔۔“ میں نے برف زار میں بھری برف پر رنگ دروشتی کا مسکور کن صلیب دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ایک اور بندے کی لاش بھی اسی علاقے میں ملی تھی۔۔۔۔۔ وہ شاید اکلوتا تھا جس کے بدن پر کوئی گوشت باقی تھا۔۔۔۔۔ زرد لکڑی تو ڈھانچے ہی ملتے تھے اور لوگوں کے۔“  
 ”اب تو کئی سال بیت گئے۔“ تعینش کاروں کو ایسا کچھ نہیں ملا۔  
 ”میں نے جہاں روکتے ہوئے کہا۔  
 سردیوں اور برہنہ تھے ویت نام کی سردیوں کی یاد دلا دیتی تھی جب سردی سے بچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہوتا تھا۔  
 ”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ ”شاید وہ جنوبی قافلہ خود بھی مر گیا ہو۔“  
 ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے بات ختم کرنے سے منع کیا۔  
 ”پہاڑیوں کا کتاؤ کم ہو چکا تھا۔ ہم گاؤں کے قریب ہی

چلے تھے۔ لڑکے نے ایک سرگرم سلک لیا تھا اور کھڑکی کا شیشہ اس کا دھوکا دینے سے بیک وقت جڑتے لے رہا تھا۔  
 ”انہیں سو بیکری بات ہے جب میں تمہاری طرح نہیں اٹھتا۔۔۔۔۔ سال کا جوان تھا۔۔۔۔۔ چھتا ہزاروں کے ساتھ میں بھی ویت نام کے اس حصے میں اترا تھا جہاں پر بے شمار دشمن موجود تھے۔“ میں نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔ ”ہماری ٹپوں نے ایک فارم ہاؤس پر ایک بھی گولی چلانے بغیر قابو پا لیا تھا حالانکہ وہاں پر دشمن انتہائی خوبی کا تجربے کر رہا تھا اور حفاظت کا بھی خاطر خواہ بندوبست تھا۔“  
 ”واہ۔۔۔۔۔“ وہ متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا خنجر دن کے وار کے تھے۔“  
 ”گرومیں تو زدی تھیں ان کی۔۔۔۔۔“ میں نے فخریہ لہجے میں بتایا۔  
 لڑکا ایک لمحے کے لیے یہ سن کر گنگ رہ گیا۔ لوگ کتنی آسانی سے مر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کو اندازہ ہی نہیں تھا۔  
 گاؤں کی کچھ کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ وہاں پر برف کی صفائی والا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس علاقے کی تقریباً زیادہ تر زمین کے ساتھ ساتھ کافی مستند بھی تھی۔ میں نے ایک ہال کی گاڑی پر ایک کڑی میرے لیے بھیجے آئے والی گاڑیوں کی

کتنے پاس سے گزر گئی تھی۔  
 ”نام کیا بتایا تم نے اپنا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اما نوئل۔۔۔۔۔ پیارے امی ملاتے ہیں مجھے۔“ وہ بولا۔  
 میری آنکھیں غمی سے دھندلا گئیں۔ وہ میرے بیٹے کا بہنم تھا۔ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہا۔  
 ”لفٹ دینے کا بہت بہت شکر۔۔۔۔۔“ وہ اپنی آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مسکان لیے اتر گیا۔ میں اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کئی کئی بار اسے ایک اور کار والے سے لفٹ مل گئی۔  
 میں اتنی محنت محسوس کر رہا تھا کہ واپس جانے کا سوچ کر ہی جان چارہ ہی تھی۔ زندگی کے بے تحاشوں کا حساب لگاتے میں کب واپسی کے لیے روانہ ہوا اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ جنگ میں مارے جانے والوں کا بھی تو کوئی حساب نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سب کو جان دینا پڑی تھی۔ موت کب دیکھتی ہے کہ کس کی جان لے رہی ہے۔۔۔۔۔ وہ دوست دشمن میں کوئی تفریق توڑی کرتی ہے۔ لغاری کی گاڑی کے پاس سے گزرتے مجھے اس کے ہارن کی آواز سنائی دی لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے خیالات کی روانی میں کچھ خلل نہیں ہو سکتا تھا۔  
 میں تو بس مرنے والوں کو گن رہا تھا جو جنگ میں مارے گئے۔ جو میرے ہاتھوں قتل ہوئے اور میری خونخوار بھیڑوں کی خوراک بن گئے تھے۔  
 میں واپس پہنچا تو بھیڑیں میانے لگیں۔ ان کو جیسے تھیں تھا کہ میں ان کے لیے خوراک کا بندوبست کر کے آیا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنا روز ٹاپا اٹھایا اور اس پر گھٹنے لگا۔  
 ”برف صاف کرنے والی گاڑی سامنے ٹھہری ہے۔ وہ آج بھی اتنی صاف ستھری ہے جتنی پہلی بار لانے پر تھی۔ برف پوش پہاڑوں پر موجود درختوں پر بھی برف جمنے لگی ہے۔ صاف ہو جانے والی سڑک پر کاریں بڑی رفتار سے رواں دواں ہیں۔ کچن کی حق اب بھی روشن ہے لیکن گھر خالی ہو چکا ہے۔ بالکل میرے دل کی طرح جہاں کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ آج اپنے بیٹے سے بھی میں مل گیا۔ چاہے وہ کسی اور کے بیٹے کی صورت میں مجھے ملا تھا۔ میری بھیڑیں بھوکہ ہیں۔ ان کو خوراک کی ضرورت ہے جو صرف میں ہی ان کو مہیا کر سکتا ہوں اور میں اب ان کے باؤں کے جانب جا رہا ہوں۔ زندگی تو برباد ہو چکی۔۔۔۔۔ اب کم از کم موت تو رانگاں نہ جائے۔“





PakiBooks.Site

دسواں حصہ

## رنگ آسمان

اے۔آر۔راجپوت

ماہی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جہنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتر آئے کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر یکسرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب احراج اور تاریخی جہول خیروں کے مہرت  
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان



یہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہ شاہی کے گئے جنگوں اور سنگار پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قافلہ جو سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جتو اسے لندن سے یہاں تک پہنچا لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً جنت پسند اور ہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اڈا بن گیا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن کارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور احمد خان، اویسر عمر خاں ساں میاں بیوی نندو اور شامنا کے علاوہ ایک بانکا جیلا کرلے نو جوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جزل مائیکل شا کے سائیکس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً تھمبھڑی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذالی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روار کے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس ہم جونی کے دوران ایک پراسرار ہستی کا کھوج لگا تا ہے۔ کوہ شاہی کی تین خوبصورت یا ستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور اپنی سازشوں کو سبوتا ڈ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جزی جاننا زور یوں کا گروپ اپنی جانیں جو قسم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی رحمان ہے جو فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل میر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی مہار کا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بڑا ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ کاروانی مجاہد کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرنیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایٹم انڈیا کمیٹی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شہ قہاکہ منتشر مسلم باقی گروہ کوہ شاہی میں اپنی خفیہ کمین کا رہیں بیٹھتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو کھینچ کر نکلیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا "مسئلہ تسلط" کوہ شاہی کی ان تینوں قابل ذکر ریاستوں تک دراز کرنا تھا بھی تھا۔ لہذا کمکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھینچتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے باہر کے ہمارا چاند چھو گیا کی طرف بظاہر ہوتی کا ہاتھ پر جاتی ہے اور پھر مشرق کی طور پر اپنی دور ریاستوں میں اپنی طرف سے خلاف فکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ مسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تربیال میں مسلم نواب شہباز خان اور پانچ پور میں مہاراجا ہندو سنگھ ملکی ٹھہرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی جو باقی اپنے بیٹے ایٹم کار کو وادی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پر تاب کمار اس کی راہ کاسب ہے بڑا پتھر ہے جو مہاراجا چاند گپتا کی پہلی اور مرحوم بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی جو باقی کی ایک جوان سال خوبصورت بیٹی سو جی بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پر تاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایٹم کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گھج جوڑ کے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو کھل کر دیتا ہے۔ مہارانی جو باقی پر تاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ہوا دیتی ہے۔ تاہم گھاس کی تبدیلی کے پیچھے ہر ملاوہ ہمارا چاند گپتا کی لپٹا ہے اور پر تاب کمار کے بوجھ سے موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پر تاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی حقیقتات کرواتا ہے۔ شک شجہ بان پر ہوتا ہے تاہم پر تاب جو باقی کو سر نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور علی تربیال پہنچتا ہے جو اسے پولیس چکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں جانتے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر اس پیغام کے نواب کے بھائی سرانج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سرانج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں جھمبھیرے پولیس کی گاڑی کو ٹھکراتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے بھاگتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اویسر عمر کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے جنہوں میں آگ لگ جاتی ہے اور احمد خان، نندو اپنا اور شامنا مل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار ہستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور انہیں دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بی بی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا بھڑ ایک لڑکی باقی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے بھٹے چڑھا جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ بھجنان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پر تاب کمار اویسر عمر کی گردن پر جس کے باعث وہ انگریزوں سے دھمکی پال لیتا ہے۔ ادھر بھجور رام ماریا کے باپ کرشن اینڈ رسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے

لوہاب میں منہ کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بھجور رام کرشن کو حتیٰ ضرورت ہے کہ ماریا کے خیاب میں مندر وادوں کا ہاتھ ہے۔ اور ماریا پر انگریزوں نے چڑھا دینے کی حتیٰ مندری سے دی تھی۔ اویسر اور شاہ زمان بی بی ہم پر روانہ ہو گئے۔ ادھر کالی مندر کے دوری ناتھ نے اپنے چیلوں کو کھم دیا کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کر لیں۔ دو پجاری رینا کے خیمے میں گھس گئے۔ اسے بے ادبی اور کاندھے پر لا کر جمو پڑے سے باہر نکل گئے۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رینا بچنے فرس پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ قریب وہی وہاں پجاری خاموش کھڑے تھے جرات جمو پڑے سے بے ادبی کر کے اٹھالائے تھے۔ ان کے قریب مہا پجاری بدری ناتھ بھی کھڑا تھا۔ اس کی کالے تیل جھکی اٹلی ہوئی آنکھوں میں وحشت اور گستاخ چمک چمک رہی تھی۔ وہ رینا کو چند تانے دی طرح گھورتا رہا مگر اس کی ہوسناکی سے دھیرے سے بڑبڑایا۔

"کاش اس فرنگی حسینہ کی بی بی کالی دیوی کے چلوں میں نہیں چڑھانا ہوتی تو میں اس کے سرخ و سپید اور سنگ مرمر سے تیار سے بدن کے اوش (خسرو) سزے اڑاتا، بخیر....."

"مگر وہی اتو پھر یہ کنیا حاضر ہے، چننا کیوں کرتے ہیں؟" کالی تو بھلا ہی ہے اس وادی میں ان خوبصورت اور بے اختیار کنیوں کی۔ قریب کھڑے ایک سیوک اور کے سرخوہ سرکراہٹ سے کہا تو بدری ناتھ اس کی طرف سے اپنی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اومر کھ.....! ابھی بھول کر بھی ایسا مت سوچنا۔ ہمارے مطلب کی کنیا ایک ہی ہوتی ہے اور وہ یہی ہے، بڑی قابل سے دھونڈنا پڑتا ہے ان کو..... جو توری بھی ہو اور

ملیہ پڑی والی ہو سکتی تھی۔ جاؤ اسے دھانے میں لے جا کر الال اور خبردار! کوئی اس کنیا سے کھلوڑ کا خیال تک بھی دامن میں نہ لائے۔"

پاس کھڑے دونوں چیلوں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یوں بے ہوش رینا کو اس کے سیوک کار پجاریوں نے دھانے میں لے جا کر ڈال دیا۔

پہرہ رات تھی مہاری سل کی طرح سرک رہی تھی۔ دھانے میں سنی کے تیل کے چلتے چراغ بھی دم دم پڑنے لگے تھے۔ اویسر عمر سے وہاں کا گھٹا گھٹا ماحول مزید وحشت ناک لگاتار رہتا تھا۔

دھانے میں حسب سابق موجود کچھ اور قیدی لڑکیاں،

پھر گری نینڈ میں ادھر ادھر پڑی بے سدھ سو رہی تھیں۔ رات کا آخری پہر تھا۔ رینا بھی بے ہوش کے زیر اثر تھی۔ اسی طرح رینا کی بھی ایک سنگین معلوم تھا کہ وہ

کون سے جنم کدے میں پہنچا دی گئی تھی۔ تھوڑی دیر اور بیت گئی تو شاید قدرتی طور پر عالم خواب میں ہی دل میں اٹھنے والے ہول کے سبب اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بڑا اگر کٹھ پتلی تھی۔ اس کی پچھلی پچھلی آنکھوں میں خوف و وحشت نمود کر آئی تھی۔ وہ بار بار یوں اپنا سر جھٹکتے تھے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔ وہ اٹھ کھڑی تھی مگر کھڑے ہونے کی اس میں سخت تھیں ہو پاری تھی۔ ایک ڈراؤنا کوشش میں اس کا سر اس بری طرح گھوما کہ اس نے پھر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کی۔

اب وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے ارد گردے ترتیب سوئی پڑی لڑکیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی کشادہ، دلکش اور پچھلی ہوئی نیلی آنکھیں عالم خواب میں بھی اس کے حسن کا عجیب احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ رینا فطرتاً باہر اور بہادر لڑکی تھی۔ لیکن اس اچانک صورت حال پر قدرتی طور پر وہ بھی خوف زدہ سی ہوئی تھی مگر فوراً ہی اس نے ڈر اور خوف کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پہلے اس بات پر غور کرنے لگی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

جب ہی اس کے خوابیدہ ذہن سے دھند چھٹنے لگی تو وہ سوچنے لگنے کے قابل ہوئی۔ یوں اسے ارد گرد ہونے لگا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور کن لوگوں کی شرارت ہو سکتی تھی؟ پہلا غصہ جو بالکل غیر مبہم تھا، وہ اٹھا کھٹا۔ اسے سوتے میں کسی بے ہوشی کی دوا سمجھا کر بالکل بے سدھ کر دیا گیا تھا۔ دوسرا خیال اگرچہ بہیم بھی مگر وہ سوچ سکتی تھی کہ اسے یوں اغوا کرنے والے کون ہو سکتے تھے۔

"کالی دیوی کے پجاری، بدری ناتھ، پرس رام....." یہ نام ایک تواتر کے ساتھ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے کیونکہ اس علاقے میں ان کے سوا اور کون اس کا دشمن تھا۔ اس کے دل میں ایک بار پھر جانے انجانے خوف کی لہر ابھری۔

وہ ایک بار پھر اپنے گرد ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ چلند ہی اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ کسی عمارت کے دھانے میں ہے اور جولاڑیاں اسے یہاں ادھر ادھر بے ترتیب انداز



میں ہوئی پڑی نظر آ رہی تھیں، ان کی حیثیت قیدیوں سے بڑھ کر تھی۔

رینا ایک بار پھر متحوش ہی ہونے لگی۔ اس نے دو تین بار اپنے سر کو جھکا، بوجھ کچھ کم محسوس ہونے لگا تو اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑے ہونے کی ہمت کی۔

تھوڑا سا پکھڑا قدم لاکھڑائے، وہ مستقل اور اپنی جگہ قائم رہی۔ پھر اس نے ایک قدم بڑھا دیا۔ اس کا رخ اس سنگی زینے کی طرف تھا جو اوپر ایک چکر گھوم کر تار کی میں غائب ہو رہا تھا۔ وہ وہاں تک پہنچی تھی اور سنگی رینگ نرا دیوار کا سہارا لیے قدم بچے طے کرنے لگی۔

زینہ مختصر ثابت ہوا، ایک ہی چکر گھوم کر اسے دروازے کے آگے نظر آ گئے جو بند تھا۔ وہ واپس لوٹ آئی۔ الم نصیب بالی جی خیندے ہونے کی عادی تھی۔ کسی آہٹ پر وہ ایک دم مٹی کی خیندے سے بیدار ہو گئی اور پھر دینا پر اس کی نگاہ پڑی۔ وہ چونک گئی۔ رینا سا سائز کے رخ پر تھی۔

”مم..... مار.....!“ بے اختیار بالی کے سونے کے لیے سے کپکپاتی آواز آ رہی ہوئی۔ رینا چونکہ ایک انگریز لڑکی تھی اسی لیے بالی اسے مار یا بھیجی۔ پہلے تو وہ خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں یہ مار یا کی ادھر تو نہیں۔

اس کے پکارنے پر رینا نے اس کی جانب گردن موڑ کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہو گئیں۔ بالی نے دیکھا یہ مار یا نہیں تھی اور ہو سکتی تھی کہ وہ تو ظلم کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ تو کیا یہ کسی اور فرمن دہشیہ زدہ کو بھی اپنے بھیا تک مقصد کے لیے اٹھالائے تھے؟

اس کے آواز دینے پر رینا فوراً اس کی جانب ہٹ گئی۔ وہ ”مار یا“ کے نام پر چونکی تھی، کیونکہ یہ نام اسے گرجین لگا تھا۔ ”میں مار یا نہیں رینا ہوں..... تم کون ہو؟“ رینا نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ بالی اب پر سکون سی ہو گئی تھی لیکن جواب دینے کے بجائے غور سے رینا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رینا کو یہ لڑکی بہت ہی نڈھال اور دھکی نظر آئی تھی۔

بالی جو اسے دیکھ کر کھڑکی ہو گئی تھی اب دوبارہ فرش پر بیٹھ گئی۔ یوں رینا نے بھی اس کے پاس ہی جگہ سنبھال لی۔ بالی اب تیرخانے کی چچی چچی بھیت کو دیکھنے لگی۔

”سسٹ..... امیری بات کا جواب نہیں دو گی؟“ رینا نے اس بار لہجے میں نرمی اور اچھا سموتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کن لوگوں نے اغوا کیا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے؟ شش..... شاید تم لوگ بھی قیدی ہو۔“

”آہ..... یہ ظالم اب جہاد اصر بھی اس بے چاری مار یا

جیسا کرنے والے ہیں۔“ بالی کے کپکپاتے سونے کے لیے سے یہ الفاظ برآمد ہوئے تو رینا کے چہرے پر پھر خوف کی لہر ابھری پوچھا۔

”مار یا کون تھی اور ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا تھا؟“

”بہت گھناؤنا ظلم کیا تھا اس بے چاری انگریز لڑکی کے ساتھ.....“ بالی نے جیسے خالی خالی گناہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جھاتے ہوئے کہا پھر ایک دم اپنی یک تنگ نگاہ رینا کے چہرے پر جمادی، بولی۔

”تم..... تم بھی انگریز ہو.....؟“

”ہاں.....“ رینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کنواری ہو.....؟“ بالی نے پوچھا تو رینا کو اس کا یہ سوال عجیب لگا۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی ابھری اور اس نے بہت دیر سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر پوچھا۔

”تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“

جواب میں بالی کے پڑ مردہ چہرے کا پچھلایا

”اس لیے کہ تمہاری یہ خوبی مختصر یہ ہے لیے

عذاب بننے والی ہے۔“

”تم مجھے کیوں خوف زدہ کر رہی ہو آخر.....؟“ رینا

جھلائی گئی۔ ”آخر صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتی ہو کہ.....“

”سنو.....“ بالی نے اس کی بات کاٹ کر جیسے میٹا کی

انداز میں کہا اور پھر ہولے ہولے اسے سب بتا دیا۔

رینا جتنی حوصلہ مند اور بہادر رہی لیکن مار یا کے انجام اور

یہاں کی حقیقت کا سنتے ہی ہول سی گئی۔ خوف جیسے ایک

آہنی سائے کی طرح اس کے خوبصورت چہرے پر چسپاں

ہو کر رہ گیا۔

”کی.....“ بالی نے اسے دیکھ کر ہلکی سی ہلکی گئی۔ تاہم اس

کا ایک اندازہ تو بالکل درست لگا تھا کہ وہ کالی کے مندر کے

مہا پجاری بدری تاجھ کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور اس وقت

مندر ہی کے ایک قید خانے میں موجود ہے۔ بالی کی زبان

رینا پر ساری رام کھانسنے کے بعد پورے جی جان سے

ہول کر رہ گئی۔

”یہ ظلم کی انتہا ہے۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ”ایک

جیتے جاگتے انسان کو اس قدر سفاکی سے ہلاک کر دینا جیسے کوئی

جانور ذبح کیا جاتا ہو۔ کیا تم لوگ اس قدر انجان ہوں

پجاریوں کے گھناؤنے ظلم سے.....؟ مجھے تو حیرت ہوئی ہے۔

رنگ آسمان

انہا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ہاں! ہم انجان ہیں، کیونکہ ان پجاریوں کو ہم

احبار تک سمجھتے ہیں۔“ بالی نے سچے سچ میں کہا۔

”یہ خوب کا لہاؤہ کر اور اس کے پردے میں جو

گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں، اس سے تو انسانیت بھی لرز

ہا ہے۔ یہ جہالت ہے۔ یہ پجاری بدری تاجھ اور اس کا

”بیٹا“ نولا میرا بھی دشمن تھا۔“ بالآخر رینا نے انکشاف کیا تو

بالی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں!“ رینا نے آہستہ سے کہا اور اپنی رام کھانسی

ناڈائی۔ بالی حیران ہو گئی۔ پھر بڑے دکھ سے بولی۔

”مار یا بھی آپ کی طرح بہت بہادر تھی میرا صاحب!

لیکن بے چاری کی ان شیطانی کالوں کے آگے نہیں چل سکی۔ یہ

بہت خطرناک اور شیطانی طاقت رکھنے والے پجاری ہیں۔“

”میں نے ان شیطانیوں کا ہانڈا اچھوڑنے کا کیا عزم

کر رکھا ہے۔“ رینا نے ایک بار پھر عزم سے کہا پھر اسے

نوکا۔ ”میرا نام رینا ہے۔ مجھے ہم صاحب مت کہنا۔ تمہارا کیا

نام ہے؟“

”مالی۔“

”کیسے مالی! اگر میں نے مقصد میں کامیاب ہو گئی

تو تم کو کتنا ہی یہ سچی قیدی لڑکیاں میرا ساتھ دیں گی؟“

اس کی بات سن کر بالی اسے حیرت سے دیکھنے

لگی۔ پھر اس نے قریب اور اصرار سے بولی قیدی لڑکیوں کی

طرف دیکھا اور آخر میں اس کی نگاہ بھی پڑی۔ یہ ایک اس

کی آنکھوں میں شک کے سائے ابھرے۔ وہ کسسا کر جاگ رہی

تھی۔ بالی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رینا سے

بہت آہستہ سے کہا۔

”اسے اپنے منصوبے کے بارے میں کچھ مت بتانا۔“

”کیا یہ قیدی نہیں ہے؟“ رینا نے بھی ایک نگاہ بھیجی کی

طرف دیکھا۔ ”کیا یہ ان پجاریوں کی خبر ہے؟“

”نہایت ہی سمجھ لو۔“ بالی نے نیچی آواز میں کہا۔ ”یہ

پجاریوں کو اپنی مرضی سے خوش کرتی ہے اور بدلے میں خود

بھی خوش رہتی ہے۔“ رینا اس کی بات کا مطلب تو سمجھ گئی تھی

تاہم بولی۔

”اس قید خانے میں اور خوش.....؟“

”ہاں! اس کا خیال ہے کہ بہت جلد پجاری اسے دہی

دار دے کر اوپر مندر کے اس گھر میں جگہ دے دیں

گے جہاں اور بھی دہیاں آرام اور بخش سے رہتی ہیں۔ وہ ان

پجاریوں کی خدمت گزار کر رہی ہیں، ان کا دل بھائی ہیں،

رقص کرتی ہیں۔“

”انگراں پجاریوں کے پاس اتنی خوب صورت دہیاں

اور موجود ہیں تو پھر یہ لوگ یہاں اس تیرخانے سے کیوں ہر

روز غور توں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں؟“ رینا نے پوچھا۔

”یہ شیطانیوں کے پجاری ہیں اور ہوں گے بھی..... انہیں

وہ لڑکیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں جو ان کے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں،

رحم کی ہیک بگتی ہیں اور درود کو اچھا لگتی ہیں۔“ بالی نے

بتایا۔ رینا کچھ سوچتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں جیسے

خود کلامیہ بڑبڑائی۔

”تم شاید ٹھیک کہتی ہو، بالی! شیطانی فطرت آدمی کی

مکروہ شخصیت کا ایک یہ پہلو بھی ہے کہ وہ گھر گھر انگیز ہے کہ وہ

دھکی اور مجبور انسانوں کی بے بسی اور لاچارگی سے حظ اٹھاتا

ہے۔ جانے اس طرح وہ اپنے کون سے ناپاک جذبے کی

تسکین چاہتا ہے۔“

اسی وقت بھیجی کی نگاہ ان دونوں پر پڑی اور وہ تیرخانے

میں ایک خوب صورت سی سنہرے بالوں اور گوری چڑی دالی

انگریز دہشیہ کو دیکھ کر پہلے تو حیرت رہ گئی، پھر اس کے سانولے

چہرے پر مٹی خیر اور دگراندی مسکراہٹ ابھری، وہ اپنی جگہ

سے ہٹ گئی اور ان کے قریب آ گئی۔ بالی اس کی طرف بڑی

شکاکی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جبکہ رینا کی نگاہیں بھی پرچی

ہوئی تھیں۔

”بھی، رینا کے قریب آ گئی اور اس کی طرف عجیب سی

مسکراتی نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے ایک ہاتھ سے رینا کی

سنہری زلفوں سے کھینچ رہی تھی اور جیسے اس کی نرم اور پر لطف

مرمریں گال پر مٹی ہوئی گردن تک لے گئی، پھر اس کے برہنہ

سنگ مرمریے بازو تک پھرتی ہوئی اس کے دلنشین لبوں تک

لے آئی تب ہی اچانک پھیر کر کیا ہوا کہ اس نے آگے بڑھ

کر رینا کے نرم و گداز اور گلابی لبوں پر اپنے سانولے

ہونٹوں سے بوسہ لیتا جا پکا کہ رینا نے اسے ایک ہاتھ سے

پرے دھکیلا۔

”بھی پر عجیب کیفیت طاری تھی، وہ پھر لپکی لیکن اس

بار بالی نے اسے بری طرح سے دبوچ لیا اور دانت چوس کر

غصے سے بولی۔

”یہ کیا ہے ہووہ حرکت کر رہی ہے تو بھئی..... ہوش میں

تو ہے تو.....؟“

”بھی کو بالی پر غصہ آ گیا اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک

کر بولی۔

PukiBooks.Site



دونوں ان سے چھپتے چھپاتے دہالے تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں تک کہ شاہ زمان نے گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ جزیرے کے ساحل سے دور تھے۔ ساحل پر بتیاں چلتی نظر آ رہی تھیں، باقی اطراف کے علاقے میں تاریکی تھی۔

ایک سمت شاہ زمان کو ایک لمبا چوڑا بوجیکر بحری جہاز نظر انداز دکھائی دیا۔ اس میں بھی نہیں روکنی نظر آئی تھی۔ ایک سرچ لائٹ ساحل سے اور دوسری اس جہاز کے مستول پر نصب کی گئی تھی، جس سے دور دور تک سمندر اور جزیرے تک گردش روشنی پھیل چکی تھی۔

اس دیو کا مت جہاز کو دیکھ کر شاہ زمان کے سینے میں جوش کی ایک لہریں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ اس کا "شکار" بھی جہاز تھا۔

یہ وہی "سی ہاک" تھا جسے تباہ کرنے کا مشن اریہ اور شاہ زمان کو سونپا گیا تھا اور جس پر ہندوستان کا قومی اور تاریخی نمونہ کر فریڈک کے راستے انگلستان لے جایا جائے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ دونوں پانی میں اتر چکے تھے۔ اریہ کو تیرا نہیں آتا تھا مگر شاہ زمان پانی کے اندر تھیں تیرتا جانتا تھا۔ اس نے اریہ کو سانس روکنے کی ہدایت کر دی تھی۔

شاہ زمان کے مختلط اندازے کے مطابق یہاں پانی کم گہرا تھا، کیونکہ یہ ساحل کے قریب کا علاقہ تھا۔ پانی سپاہیوں کی "شفٹنگ" مشینوں کے ذریعے لالچ اور ساحل سے جاری تھی۔

شاہ زمان، اریہ کو سنبھالے ہوئے تیزی سے پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا اپنے ایک مختلط اندازے سے ساحل کی دوسری اور نسبتاً محفوظ جگہ پر جا کے ابھرا۔

راستے میں دو ایک بار اریہ کو سانس لینے کی ضرورت پیش آئی تھی اور شاہ زمان نے تھوڑا سا سانس آگے بڑھایا مگر اسے آسپین کا ذخیرہ بھیجے چھوڑوں میں بھرنے کا ساموہ دیا تھا۔ اگر کسی گردش سرچ لائٹ کے دائرے میں ان کی ذرا ایک جھلک بھی دکھائی دے جاتی تو یہ حد خطرناک ہوتا۔

خدا کا شکر کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس میں شاہ زمان کی ہوشیاری اور مختلط روی کا بھی دخل تھا۔

یہ دونوں جس جگہ سے ساحل پر آئے تھے، یہاں مونگے کی چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں۔ سلیٹن اور کائی تو حد سے زیادہ تھیں جس سے رخ کافی پھسلواں ہو چکی تھی یوں یہ علاقہ بھی نیم دلہ لیا تھا۔ بڑی مشکوں سے رات کی تاریکی میں یہ دونوں سنبھلے سنبھلے نہایت بھرتی والی جگہ پر پہنچے تھے۔

لالچ نے گودی سے حرکت کی اور کھلے سمندر میں داخل ہوئے اور رفتار بڑھائی۔

بندرگاہ کی بتیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا اور سمندر کے افق پر لٹکے ہوئے مہاتی چاند کو لہریں چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ سمندر چار بجائے کی کیفیت میں نظر آتا تھا۔

"ہیں دھیان رکھنا پڑے گا ایک بات کا اریہ۔"

شاہ زمان نے سرگوشی کی۔

"کون سی بات کا؟"

"لالچ جزیرے کے ساحل سے نکلے ہی نہیں اترتا پڑے گا کیونکہ اس نے داہیں بندرگاہ کی طرف پھٹا ہے۔ اہماتہ ہوا میں جہاں سے چلے تھے دوبارہ وہیں پہنچ جائیں اور ساری محنت بھی کا رت چلی جائے۔"

"سیر انہیں خیال کہ اتنی جلدی لالچ داہیں کے لیے پلٹ جائے گی۔" اریہ نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "مراد خان نے بتایا تھا کہ یہی لالچ جزیرے پر متعین دوسرے سپاہیوں کو داہیں لے کر رہی پلے کی، لہذا اس میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" شاہ زمان نے ہولے سے کہا۔ "لیکن ہماری ہمارے کوشش میں بھی ہوتی چاہیے۔"

"جلد بازی بھی تو خطرناک ہو سکتی ہے ہمارے لیے۔" اریہ نے حدش ظاہر کیا۔ "مت بھولو کہ ہم ایک خطرناک جزیرے میں قدم رکھنے والے ہیں جہاں خاد حیات اور اس کے ساتھیوں کو ان ظالم فرنگیوں نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ لیکن اس وقت کرن ایڈرن تھا، اب بات اور ہے۔"

"بھری احتیاط لازمی ہے۔ کیا معلوم کیا متعین کردہ اہل اس سے زیادہ خطرناک ہوں۔"

لالچ کا سفر جاری تھا۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد لالچ کی رفتار کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ ٹھہر گئی۔ اب وہ آڑا موجوں کے کنارے بھڑکے لپٹی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ دونوں فوراً اپنی اگلی لیکن گاہ سے نکلے۔ ان کا رخ دہالے کی طرف تھا۔ وہ پہنچے تھے کہ اس وقت دونوں نہایت خطرے میں تھے۔ کسی کی بھی ان پر نگاہ پڑ جاتی تو انہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا۔

لالچ میں انہیں کچھ شوہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اطراف میں کچھ سائے بھی متحرک نظر آئے، وہ

فرش پر اتر تو اس نے دیکھا، بھی نے رینا کو بڑے برے طریقے سے زور دیا کہ گر کر رہے۔

بدی تانچہ نے اپنے دونوں خود مند جیلوں سے نکل کر انداز میں کچھ کہا۔ وہ دونوں بیک وقت حرکت میں آئے اور آگے بڑھ کر رینا کو بھی کی گرفت سے چھڑایا۔ بھی اس وقت بھری ہوئی تھی اور بھجوری سے بال کسی چڑیل کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

وہ دونوں اسے دبوچ کر بدی تانچہ کے پاس لے آئے۔ بدی تانچہ بھی کو بڑی تہہ آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں سیکو کار پیلیوں نے بھی کودا بھی بائیں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ بھی کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ کچھ خوف زدہ کی نگاہوں سے اپنے سانسے کھڑے فیصے میں بھرے ہوئے مہا بپاری بدی تانچہ کو کٹے جاری تھی کہ اچانک بدی تانچہ نے اپنے جھولتے ہوئے چولے کے اندر سے ایک تیز دھار قرد لی لائی۔ اس کی تیل جیسی بڑے بڑے ابروؤں ذیلیں والی آنکھوں میں وحشت اور جلاوت صفت سفاکی اتری ہوئی تھی۔ وہ قرد لی اس نے بھی کے پیٹ میں بھونک دی۔

تھانے کے سلیٹن زور اور کچھ دیر تک وحشت ناک ماحول میں بھی کی جگر پاش پاش بھری۔ تھانہ صفت بدی تانچہ نے قرد لی بھی کے پیٹ میں گھونچتے ہی اسے اوپر سینے تک بڑا چکا لگا دیا۔ بدی تانچہ بھی کا جسم ٹھک گیا۔ گردن ڈھلک گئی۔ سیکو کاروں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ دھب سے فرش پر گر گئی۔ خون کی چھپڑی میں پڑا اس کا جسم بھی جھٹکے کھار ہا تھا پھر ذرا ہی دیر بعد اس کا شہم ادھڑا اور دساکت ہو گیا۔ وہ فتم ہو چکی تھی۔

اس ظلم و بربریت اور ننگ انسانیت منظر کو دیکھ کر کسی تہی لڑکیوں کے منہ سے خوف کے مارے چھین خارج ہو گئیں۔ رینا نے بھی خوف و دہشت کے مارے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد ہی لالچ کے ٹنگے اور سلیٹن زور فرش میں "مگر گھراہٹ" ابھری۔

اریہ اور شاہ زمان مختلط ہو گئے۔ وہ لالچ کے جس محفوظ گوشے میں چھپے ہوئے بیٹھے تھے، وہاں خاصی تاریکی تھی۔ "شاہ لالچ روانہ ہو رہی ہے۔" اریہ نے سرگوشی کی۔ "ہاں! دوسری شفٹ کے سپاہیوں کا جزیرے کی طرف پہنچا جا رہا ہوگا۔" شاہ زمان نے بھی ہولے سے کہا۔

"سیر کیا جاتا ہے؟ برے ہٹ تو۔۔۔" کہتے ہوئے بھی نے خود کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑایا اور پھر رینا کی جانب سر کی تو اس بار رینا نے بھی اس کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے گورنے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کا زور دار پھیز اس کے گال پر رسید کر۔

تھانے میں "چٹخ" کی زوردار آواز ابھری اور بھی کے ہوش خفا کے آگے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کسی خونخوار لی کے مانند غراتے ہوئے چار چاند انداز میں رینا پر چھین، لیکن بالی پھر دس مین میں حائل ہوئی اور بھی کو دبوچ کر فرش پر لٹا دیا۔ وہ اب اس کے سینے پر سوار ہو چکی تھی اور اس کا گلا دبوچنے لگی۔

رینا حیران پریشان یہ منظر دیکھنے لگی۔ بھی نے لینے لینے اپنے ایک ہاتھ کا ٹھوس بنا کر بالی کے چہرے پر رسید کیا، بالی کے حلق سے کراہ خارج ہوئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو بھی کسی پھلی کی طرح تڑپ کر اس کے پیچھے سے بھٹکتی ہوئی نکل گئی۔

ادھر چھڑکھا کر بالی نے بھی غصے سے ہونٹ بھیج کر ایک زوردار چھڑ بھی کے منہ پر مار دیا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ قوی ڈالا۔ بھی کے حلق سے کچھ بلند ہوئی اور پھر وہ دونوں کسی وحشی جنگلی فیوں کی طرح آپس میں قسم مٹھتا ہو گئیں۔

رینا انہیں چھڑانے کو بھیجی۔ دیگر قیدی لڑکیاں بھی اس شور شرابے کی وجہ سے جاگ گئی تھیں۔ کوئی انہیں چھڑانے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ کچھ ڈری سہی نگاہوں سے ان کی لڑائی دیکھ رہی تھیں۔ کسی کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کے آثار تھے تو کوئی دھپسی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

بھی اور بالی کی لڑائی جاری تھی۔ بالی، بھی کے مقابلے میں دلی پٹل اور تازک سی تھی اور یہی کچھ کم وحش رینا کا بھی حال تھا جبکہ ان کے برعکس بھی ایک جنگجو قسم کی بھڑکی عورت تھی۔

اس نے بالی کے پیٹ میں لات رسید کی تو وہ چٹک بار کر اس سے الگ ہو گئی۔ رینا کو غصہ آ گیا اور اس نے ایک چھڑ بھی کے مارنا پنا بوج کر دیا۔ بھی نے رینا کو دبوچ لیا۔ ادھر بالی بے چاری اپنا پیٹ پکڑے مارے اذیت و تکلیف کے دہری ہوئی جاری تھی۔ بھی نے خونخوار لی کی طرح رینا کو دبوچ لیا تھا۔

اسی وقت تھانے کا دروازہ کھلا۔ مہا بپاری بدی تانچہ اپنے دو پیلیوں کے ساتھ تکی زینے طے کرتا ہوا تھانے کے



ان دونوں کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔  
 اربہ کی حالت زیادہ نازک ہو رہی تھی۔ اطراف میں چٹکی  
 عجیب جاتی تھی جو بوسے دماغ بھی اس ہوا جارہا تھا۔  
 وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنی بے ترتیب سانسیں  
 درست کرتے رہے۔ اس کے بعد اطراف میں ایک نظر  
 ڈالتے ہوئے شاہ زمان نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔  
 ”اربیہ! ہمیں اپنے مشن کے آغاز سے پہلے اپنے لیے  
 کوئی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہوگا تب ہی ہم آرام سے  
 کوئی حکمت عملی ترتیب دے سکتے ہیں۔“  
 جواب میں اربہ بولی۔ ”میرا نہیں خیال کہ میں یہاں  
 کوئی مطلوبہ محفوظ ٹھکانا مل سکتا ہے، شاہ زمان!“ وہ اس کی  
 بات پر سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔  
 شاہ زمان کو مستفسرانہ نظروں سے اپنی جانب لکتا پا کر وہ آگے  
 بولی۔ ”یہ مشن جلد انجام تک پہنچانے کا مقناضی بھی ہے۔ مراد  
 خان ہی نہیں مجھے تو اب شہباز خان کی بھی اس مشن سے متعلق  
 باتیں یاد ہیں۔“  
 ”شاہ تہماری بات ٹھیک ہو۔“ شاہ زمان اب اس کی  
 طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”لیکن میں یہ قصہ ہی ہیشہ کے لیے  
 پاک کر دینا چاہتا ہوں۔“  
 ”کیا مطلب؟“  
 ”میں اس جزیرے کو ہاک سمیت تباہ کر دینا  
 چاہتا ہوں تاکہ پھر بھی یہ جزیرہ اس تاریخی چوری کا سبب نہ  
 بن سکے۔“  
 ”لیکن یہ کیسے ممکن ہوگا شاہ زمان؟ ابھی تو ہمیں یہ  
 بھی نہیں پتا کہ یہ جزیرہ کتنا پھیلا ہوا ہے؟“ اربہ نے  
 کہا تو شاہ زمان اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے  
 ہوئے مسکرا کر بولا۔  
 ”تم بہت ڈین ہو لیکن یہاں مار کھا گئیں۔ میرا  
 مطلب ان فرنگیوں کی یہاں تکین گاؤں کو بھی براؤ کرنا تھا۔“  
 ”اوہ..... یہ مطلب تھا تہماری بات کا..... میں واقعی  
 اتنی سی بات نہ سمجھ گئی۔“ وہ جھنجھک کر بولی تو شاہ زمان محبت  
 سے اس کے گھٹیلے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔  
 ”جو انسان بہت ذہین اور بہادر بھی ہو تو اس سے یہ  
 چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز ہو جاتا معمولی بات ہے۔ آؤ کچھ  
 کھالی ہیں۔“  
 اربہ نے بھی پیار بھری مسکراہٹ سے شاہ زمان کے  
 ہاتھ پر اپنا نرم و گونا گونا ہاتھ رکھ دیا۔  
 ساحل کے کسی اونچے چبوترے سے نصب سرچ لائٹ

کی گردش روشنی کا دائرہ ان کے اطراف میں آ کر دور  
 ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے رخ اور ایسی جگہ پر براجمان تھے جو سطح  
 مرتفع بھی تھی اور قدرے ڈھلوانی بھی۔ تاہم پھر بھی وہ دونوں  
 محتاط تھے۔  
 مراد خان نے انہیں روانہ ہوتے وقت ایک تحفہ پکڑ دیا  
 تھا جو شاہ زمان نے اپنی پشت سے باندھ لیا تھا۔ اس تحفے کے  
 اندر بھی ہوئی چھلکی کے کٹھنہ ایلے ہوئے چاول اور پانی  
 کا ایک مشکیزہ تھا۔ وہ کھانی کر انہوں نے پیٹ کی آگ  
 بجھائی، کیونکہ تیرے کے سبب انہیں بھوک لگ رہی تھی۔  
 وہ دونوں تھکات و تھکات اور تیز بھی محسوس کر رہے تھے۔ معا  
 ہی اربہ نے لرزتی ہوئی آواز میں شاہ زمان سے کہا۔  
 ”وز..... زمان! دیکھو ذرا..... ہم..... میری..... پشت پر کوئی  
 شے ریگ رہی ہے۔“  
 ابھی اس نے اتار ہی کہا تھا کہ وہ بے اختیار چیخ پڑی۔  
 زمان بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے بنا دیکھے انداز سے  
 اربہ کی پشت پر ہاتھ مارا تو مدھم مدھم سی روشنی میں ایک پتھو  
 اسے رینگتا ہوا نظر آ گیا جو جلد ہی تاریک جھاڑیوں میں گم  
 ہو گیا۔  
 رات کے سناٹے میں اربہ کی چیخ کی آواز خاصی دور  
 تک گونجی تھی اور اسی وقت ان کے قریب میں لہرائی سرچ  
 لائٹ ایک مقام پر ٹھہر گئی۔  
 اس دہری پریشانی پر شاہ زمان پریشان ہو گیا۔ تاہم  
 اس نے اربہ کو سنبھالا جو مارے درد کے ہلکانے لگی تھی۔ شاہ  
 زمان جانتا تھا کہ اسے جنگی پتھو نے کاٹ لیا ہے.....  
 جس کا درد انسان کو ایک لمحے کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔  
 درد تو پاتا رہتا ہے اور یہی حال اربہ کا تھا۔  
 اس نے ڈنک والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر ذم کو سہلایا تو  
 اربہ اور مزید تکلیف سے کراہیں خارج کرنے لگی۔ اسے شاید  
 احساس ہو گیا تھا کہ اس سے کسی بھیسا تک غلطی ہو چکی تھی جو ان  
 کی اب تک کی ساری محنت پر پانی پھیر گئی تھی۔  
 ٹھیک اسی وقت ایک دھماکا ہوا۔ دونوں چونک  
 پڑے۔ تاریک آسمان پر کوئی شے بلاست ہوئی تھی۔ شاہ  
 زمان سمجھ گیا کہ دشمنی کا مسلسل فائر کیا گیا تھا۔  
 اس نے فوراً اربہ اور خود کو بچے جھکا لیا۔ وہ جگہ یہاں  
 سے زیادہ دور نہ گئی جدھر فرنگی سپاہیوں کا ٹھکانا تھا۔  
 ”چلو اٹھو اربہ! ہمت کرو، اب یہاں ہمارا زیادہ دیر  
 رکتا مناسب نہیں۔“ اس نے اربہ کو سنبھالتے ہوئے ابھی اتنا  
 ہی کہا تھا کہ اچانک روشنی کا ایک سیلاب ان پر پڑا اور ان کی

## رنگ آسمان

پانی پھنی آنکھوں نے اپنے ارد گرد چار پانچ مسلح وردی پوش  
 فرنگی سپاہیوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں نارنجی اور  
 رات گلیس تھیں۔  
 ”ہائٹ.....“ کوئی فرنگی آفیسر گلا پھاڑ کر دشمنی سے چیخا  
 تھا۔ اربہ اور شاہ زمان کے چہروں پر سناٹے ثبت ہو کر رہ  
 گئے تھے۔  
 ”ہاتھ اوپر کرلو..... جلدی! اور نہ گولیوں سے بھون  
 ایلے جاؤ گے۔“  
 ان کے درمیان میں موجود ایک نہٹا قد اور فرنگی  
 گورے سے تھکمانہ دھنسی سے کہا۔ اس کے ہاتھ میں خرچی دار  
 لی نال والا پستول تھا۔ اس نے کٹھنوں تک ٹیکر بکین رکھی تھی،  
 پر ہیٹ تھا۔ اس کے ہمراہ چار رائفل بدست گورے سپاہی  
 بائس کھڑے تھے۔ شاہ زمان کو راز قامت گوران کا کمانڈر  
 ہی دکھائی دیتا تھا۔  
 شاہ زمان نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے۔  
 ”تم بھی، سناٹیں لڑکی.....؟“ گورے کمانڈر نے  
 اربہ کی طرف دیکھ کر برٹش آواز میں کہا اور فائر کر دیا۔  
 رات کی خاموشی میں گولی چلتے کا دھماکا بڑے زور سے  
 آتا تھا اور اربہ کی چیخ نکلی تھی۔ شاہ زمان کا دل ایک لمحے  
 کے لیے کھٹک گیا۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ اس فرنگی نے اربہ  
 کو کوئی تو نہیں ماری ہے، لیکن وہ اپنی جگہ ایسے ہی کھڑی تھی۔  
 فرنگی نے اسے ڈرانے کے لیے اس کے قریب بیروں میں  
 گولی داغی تھی جو زمین میں بیہوش ہو گئی تھی۔  
 ”یہ تکلیف میں ہے، اسے پتھو نے ڈنک مارا ہے۔“  
 شاہ زمان نے اربہ کو..... بیروں کھڑے دیکھ کر اطمینان کی  
 سانس لی اور ان سے بولا۔  
 کمانڈر نے اپنے دوسرا تھیل سے تھکمانہ انداز میں  
 ہاتھ کہا۔ وہ آگے بڑھے اور ان دونوں کی تلاشیاں لے  
 لیں۔ پھر ان کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے  
 گئے اور پشت پر رائفلوں کے بٹ مارے ہوئے انہیں دھکیلے  
 ”اے ایک طرف کو چل پڑے۔“  
 نارنجی روشن تھیں۔ یہ لوگ جنگی جھاڑیوں کے درمیان  
 سب ایک پگھلائی کنارے پر چل پڑے۔ چند قدموں  
 بعد ہی شاہ زمان کو آگے ایک چونکی کے آثار نظر آئے۔ وہ سمجھ  
 گیا کہ یہ لوگ اسی چونکی سے اچانک ان کے سر پر آ کر مسلط  
 ہوئے تھے۔  
 اربہ چلنے چلنے اوندھے منہ گری۔ شاہ زمان گھبرا گیا۔  
 فرنگی نے اربہ کو بازو سے پکڑ کے بڑی بیدردی کے ساتھ

شاہ زمان نے دیکھا، اربہ کی حالت بڑی ناگفتہ بہ  
 ہو رہی تھی۔ اس کا کول چہرہ اس وقت کھلا گیا تھا جسم پیسے سے  
 ہیکا ہوا تھا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اور اس سے چلنا  
 تو درکنار کھڑا بھی نہیں ہو جاتا تھا۔ اربہ کی حالت زار کو کچھ  
 کر شاہ زمان تشویش زدہ ہو گیا اور اسی لہجے میں فرنگی سے بولا۔  
 ”اس کی حالت بے حد نازک ہے، خدا کے لیے کچھ  
 کرو اس کے لیے..... اسے خطرناک پتھو نے کاٹ لیا ہے۔  
 ہم سے بڑی غلطی ہوئی جو ہم نے کٹھنی تباہ ہونے کے  
 بعد تیرے ہوئے یہاں آ کے جان بچائی۔“  
 شاہ زمان نے چالاکی سے کہا لیکن اربہ کی حالت  
 بہر حال نازک تھی۔ اسی وقت کسی گاڑی کی تیز روشنی ان  
 پر پڑی۔ ایک بغیر ہڈ والی جیپ ان کے قریب آن کھڑی  
 ہوئی۔  
 ☆☆☆  
 راج محل میں پچھورام وہ واحد شخص تھا جسے پیش  
 آئند حالات کا اچھی طرح اندازہ ہی نہیں بلکہ پوری جان  
 کاری بھی تھی کہ اب آگے کیا ہونے والا تھا؟ کم و بیش یہی کچھ  
 جوابی بھی جانتی تھی۔ جسے راج محل کے کین ”تخلیہ گاہ“ کی ایک  
 ایسی دھواں آگے ہوئے تھے جس نے اب جو بات کوئی اپنا  
 مقصد بتایا تھا جبکہ کوئی اس کے اصل ”مقصد“ کو نہیں جانتا تھا  
 کہ یہ دونوں ہی کس طرح اندر ہی اندر راج محل کی جڑیں  
 کھوکھلی کرنے میں مصروف تھے۔  
 پچھورام نے بغاوت کا جوج بھر کھا تھا، اس کے نتائج  
 کا اگرچہ ابھی وقت نہیں آیا تھا تاہم اس نے بڑی مکاری کے  
 ساتھ ایک الا ضرور مار لیا تھا۔ اس نے نامرہ فوج کے نائب  
 سالار آتھا شے کو ساتھ لایا تھا۔  
 ”دلی سے ہمیں اور مہاراشٹر پونے کو لکھنؤ کی ریاستوں  
 تک انگریز حاوی ہو چکے ہیں۔ ان سے لڑنا ناہی بربادی کے سوا  
 کچھ نہیں، کیا بہتر نہیں کہ ان سے ساز باز کر کے ہمیشہ آرام سے  
 زندگی گزار دی جائے اور اقتدار کے مزے بھی لوٹے جائیں؟“  
 پچھورام نے نائب سالار کو جب پورے طور پر اپنا نام  
 خیال ہوتے دیکھا تو یہ سب کہہ ڈالا۔  
 ”اقتدار.....؟“ چھپا نہیں سالار آتھا شے حیرانی اور کچھ  
 مسرت سے پچھورام کی طرف دیکھنے لگا۔  
 ”ہاں! اقتدار.....“ جواب یہاں نامرہ میں چند  
 گھنٹوں کا مہمان ہے۔“ پچھورام بھوس اچکا کر اپنی بات  
 پر زور دیتے ہوئے بولا۔



چھپر سکتی تھی، لہذا اس نے بھی فوراً اچھے وقت کے انتظار اور موقع محل کے مطابق کسی زخمی نامکن کی طرح کچلی بدل لی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر مسکراہٹ کی طرح کاریج چلی گئی۔

”مہارانی جی! اپنے سنگھاسن کے لیے تیار ہو جائیں کہ اب تو ناگرہ کی چوٹیاں بھی آپ کی فتح و مند کے سکھ اور ڈمرو بجانے لگی ہیں۔“

پچھورام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوب لہک لہک کر کہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر اپنے لیے استقبالیہ مسکراہٹ پر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے۔ نجوبائی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نشست سے اٹھی اور اپنے صحت مند وجود کی دلکشی کو پچھورام کے کچھی سے بازوؤں کے حوالے کر دیا۔

نجوبائی کے لیے اب اس کا وجود دن بہ دن ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا، مگر وہ مجبور تھی اور موقع کی منتظر بھی۔ سو ایک ملکہ ایک غلام کی یہ ”جھلس“ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ کچھ بھی نہ ملے ہوئے کو اچانک بہت کچھ مل جائے تو وہ سیر ہونے کے بعد اور گرسنہ ہو جاتا ہے، پچھورام کا بھی یہی حال ہونے لگا تو بالآخر نجوبائی نے اسے دھیرے سے اور محبت سے لگ کر دیا اور اٹھلا کر بولی۔

”آخر پتا تو چلے، اب تم کون سا تیر چلا کے آرہے ہو؟“

”کوئی ایسا دوا یا۔۔۔۔۔ میری رانی۔۔۔۔۔ مہارانی!“ پچھو رام بھی جیسے سرور میں آکر بولا۔ ”انگریز (انگریز) سرکار کی فوجیں روانہ ہو چکی ہیں۔ راج محل کے اندر میں نے جزیں کاٹ ڈالی ہیں۔“

”راج محل کی یا اس مورکھ پر ثاب کی۔۔۔۔۔؟“ نجوبائی نے نفرت سے ہونٹ سیٹھ کر کہا۔ ایسے میں اس کا حسین چہرہ نفرت اور غیظ تلے عجیب ہی لگ رہا تھا۔

”ارے میری مہارانی! اسی مورکھ کی تو بات کر رہا ہوں۔ بھلا ہمارے اس سنگھاسن راج محل کو کیا ہو سکتا ہے۔“

پچھورام اسی طرح غنٹ کی طرح لہک لہک کر بولا۔

”تمہارے حامیوں کو میں اکٹھا کر رہا ہوں۔ اب بھی راج محل میں ہمارے وفاداروں کی کوئی کمی تھوڑی ہی ہے مہارانی جی!“

اس کی بات سن کر وہ بولی۔

”پچھورام! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ انگریز سرکار ہمیں کچھ نہیں دے گی، وہ یہاں اپنا قبضہ جمالے گی اور ہم سب قید خانے میں ہوں گے۔“ نجوبائی کے لہجے میں ہراس اور خدشات تھے۔

اگلی چند ساعتوں کے بعد سالار کو، جو پہلے ہی کافی عرصے سے راج محل کی بدلی بدلی فضا کے باعث گلوگو کا شکار تھا، پچھورام نے اسے نئی راہ بھادی تھی۔ وہ رام ہو چکا تھا۔

”ہم اقتدار میں آتے ہی سب سے پہلے تمہیں سینا پتی بنائیں گے، مہارانی نجوبائی کے ساتھ وفاداری کرنے پر قیمتی انعام و اکرام کی بارش الگ ہوگی تم پر۔“

آتما شکلا نے فوراً ساتھ دینے کی ہائی بھری تھی۔ جنگ سے ہر کوئی خوف زدہ تھا۔ راج محل کے مقتدرہ کی رائے یہی تھی کہ انگریزوں سے ٹکر لینے کے بجائے ان سے وہی مذاکرات کامیاب بنائے جائیں جو مہاراجا چندر گپتا کی پالیسی تھی اور نئے راجا کی پالیسی ناگرہ کو جنگ اور تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہی ہے۔

پروپیگنڈے کی یہ لہریں ہواؤں کے دوش پر راجا پر ثاب کمار کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں مگر وہ اسے کسی سازش کا شاخسانہ سمجھنے کے بجائے ایک روایتی اختلاف کا نام دے کر درگزر کرتا رہا۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب چھپے ہوئے سازشیوں کی چال کامیابی سے ہمکنار ہونے لگتی ہے اور۔۔۔۔۔ وہی ہو رہا تھا۔

پچھورام جن جن کرایے آدمیوں کی تلاش اور ان کا ذہن خراب کرنے میں بہت پہلے سے ہی مصروف تھا۔ نائب سالار کو ساتھ ملانے کے بعد پچھورام نے رات کے اسی مخصوص پہر میں تخلیک گاہ کا رخ کیا جہاں کچھ دنوں سے وہ جانہ رکھا تھا۔ وجہ اس کی تازہ ترین مصروفیات تھیں۔

تخلیک گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے مہاراجا کی زرق برق پوشاک پہننا نہیں بھولتا تھا۔ وہ اپنی اوقات بھلا چکا تھا، نہیں جانتا تھا کہ یہ لباس فاخرہ اس پر کس قدر بھاری پڑنے والا تھا۔ پوشاک پہننے کے بعد اس نے سیدھا اندر کا رخ کیا۔ جہاں نجوبائی حسب سابق گرم میٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر چونگی اور ہمیشہ کی طرح پچھورام کو اپنے مرحوم شوہر کا شاہانہ لباس پہنے دیکھ کر اس کے اندر نفرت و غیظ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

عورت کتنی ہی بری ہو، مگر وہ اپنے شوہر اور وہ بھی جو اچانک اور ناگفتہ بہ حالات میں وارغ مفارقت دے چکا ہو، کسی دوسرے آدمی کو اس لباس میں کبھی نہیں برداشت کرتی اور پھر وہ بھی پچھورام جیسے ایک بے حیثیت شخص پر، جو اس کے غلاموں کا بھی غلام تھا، لیکن تقدیر نے بھی شاید نجوبائی کو اس کے کرتوتوں کی سزا ہی دی تھی جو اب پچھورام کی صورت میں اسے ہر وقت ملتی رہتی تھی۔ وہ ابھی اسے اٹکی جتنا بھی نہیں



”ہرگز نہیں..... ملکہ عالیہ تک سب خبریں پہنچتی رہی ہیں۔“ پھجورام نے کہا۔ ”انگریز اپنی عالمی حیثیت منوانا جانتے ہیں، کہاں انہیں جبر سے کام لینا ہے اور کہاں انہیں صبر سے..... وہ یہاں ہمارے معاملے میں صبر سے ہی کام لیں گے۔ حکومت ان کی، کام ہمارا اور ہمیشہ بھی ہمارا..... یہی تو پالیسی ہے ان سالے گوروں کی حکمرانی کرنے کی۔ وہ انگلستان جا کر آپ کی حیثیت ایک مہارانی کی منوا میں گے ملکہ عالیہ سے..... پھر دیکھنا چاروا تک آپ کا طوطی نہ بولے تو پھجورام پھر تیجورام بن جائے گا۔“

سب سے پہلے تو میں تیرا بندو بست کروں گی کہیں..... تمک حرام اتنے میری مجبوری سے کھلا ہے، تیرے گرد چال بنارہی ہوں۔“

اس کی بات پر تجو بانی نے دل ہی دل میں پھجورام کے خلاف یہ زہریلے الفاظ دہرائے جن کا اعادہ وہ اکثر تریدوں میں کرتی رہتی تھی۔

اس کے بعد پھجورام نے تجو بانی کو سب بتا دیا جسے سن کر تجو بانی کو ملانیت تو ہوئی لیکن..... ساتھ ہی اس کے اندر کی کینہ پروردگری بے چین ہو گئی۔ وہ سن میں سوچنے لگی، اس کے دوبارہ مہارانی بننے کے بعد وہ پھجورام کا کاٹنا کیسے نکالے گی؟ کیونکہ اس کی باتوں سے اسے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ اگر برسر کار کا قدر منظور نظر بن چکا ہے کہ بعد میں کوئی اس کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ تو اس نے سوچ ہی رکھا تھا کہ ناگہ کا اقتدار ملے ہی وہ سب سے پہلے پھجورام کا خاتمہ کرے گی اور اس کے بعد پر تاب کا۔ تب ہی اچانک مہارانی کو ایک اور خیال نے فکرمند کر دیا۔ ”تو کیا..... تجھے اس بچے سے ساری عمر نبھانا پڑے گا؟ میں ایک کٹھ پتلی جیسی مہارانی کہلاؤں گی؟“

ہرگز..... نہیں..... پھجورام کی موت کا شبہ اس پر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ پھجورام تو اس کا پتی دیو کھلانے والا تھا۔ ایک پتی بھلا کیسے اپنے ہی پتی کی جان لے سکتی ہے؟

”آہ..... پہلا الزام بھی تو مجھ پر ہی آیا تھا۔“

یہ یاد آتے ہی وہ خود کو پھجورام کے سامنے بالکل لاچار اور بے بس محسوس کرنے لگی۔ پھجورام جیسے ایک غلام زادے نے اسے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اتھاہ ذلت کی گہرائیوں میں اور تجو بانی کو لالچ، غرور اور حرص و طمع نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔

”تجو بانی! حوصلہ بڑا..... وقت کی دھار کو دیکھ..... ابھی چنگی پڑی رہ، جیسے مرنے طوفان کو دیکھ گراور مگزی تیز ہواؤں

کارخ سمجھ کر جال سمیٹ لیتی ہے اور پھر پھیلا لیتی ہے۔“ اس کے اندر جیسے کوئی آواز ابھری۔ یہ اس کی اپنی آواز تھی۔

اسے وقت کا انتظار کرنا تھا سو وہ کر رہی تھی..... کیے جاری تھی۔

☆☆☆

باپ کے مرنے اور ماں کا مستقل تجلیہ گاہ سنبھالنے پر دونوں بہن بھائیوں پر اس کے بڑے منفی اثرات پڑے تھے۔ درحقیقت سوچنا اور ایش کنار دونوں ہی اپنے آنچھائی باپ چندر گپتا کے بے حد قریب تھے۔ ماں تجو بانی نے پہلے ہی بڑے سوتیلے بیٹے کی طرف سے ان بہن بھائیوں کے دل خراب کر رکھے تھے۔ دونوں میں نفرتوں کا زہر بھرنے والے نہیں جانتے کہ نفرت سے نفرت ہی جنم لیتی ہے محبت نہیں، خواہ وہ بچہ کوئی بھی ہو۔ ہواؤں کا رخ بدلنے میں دیر ہی لگتی ہے؟ یہ آشکار ہوتے ہی کہ ان کی ماں ہی درحقیقت ان کے باپ کی قاتل تھی، چاہے نادانگی میں سہی، کیونکہ یہ تو بہر حال ایش کنار اور سوچنا جانتے ہی تھے کہ ان کی ماں راج محل میں کیا کھل کھلائے ہوئے تھی۔ یہ سب اسی کی یادداشت میں ہوا تھا۔ ایش کنار تو اب بالکل ہی ماں سے نہیں ملتا تھا۔ سوچنا پتی تھی اور ایک عورت بھی..... وہ بھی کسی ماں سے جا کر اس آیا کرتی تھی۔ وہ اکثر بھائی سے بھی کہتی تھی۔

”اسنے کھٹور نہ بنو بھلا! آخر کو وہ ہماری ماتائی ہیں۔“ سوچنا نے ایک دن بھائی سے شکوہ کیا تو ایش کنار دکھائی سے بولا۔

”ماتائی ہیں تو ماتائی ہی بن کر رہیں۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی انہیں؟“

نئی ماں کی وکالت کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ یہ سب تمہارے لیے اور ہماری خاطر ہی کر رہی ہیں۔ وہ بڑے بھیا پر تاب کے بھائے نہیں ہیں ریاست کا مہاراجا بنانا چاہتی تھیں۔“

”ہونہہ! کیا قاعدہ ہوا اس کا.....؟ برے کام کا برا ہی نتیجہ نکلتا۔ زہر کس کو دینا تھا، پانی کس نے لیا.....“ ایش نفرت و غصے سے بولا۔

”شئی..... شئی..... آہستہ بولو بھیا! کوئی سن لے گا تو.....“

”سب نے سن ہی لیا ہے۔ پر تاب بھائیے کہاں چھوڑا انہیں بھی..... سب کے سامنے ڈیل تو کر دیا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے لاق نہیں رہے۔ کیا نہیں نہیں پتا کہ راج محل کے ادنیٰ سے ادنیٰ غلام اور نوکر بھی ہمیں کن شاکی نظروں سے گھورتے ہیں۔“

”ہاں، ایش بھیلیا بات تو تمہاری بھی غلط نہیں ہے۔“ سوچنا گہرے فکروں سے بولی۔ ”اب تو یہاں جیسے ہر کسی کو ہم آنکھوں میں ٹھکنے لگے ہیں۔“

”اس سے تو اچھا تھا بڑے بھیلیا ماتی کو بندری خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔“

”بے چاروں.....! انکی باتیں کر رہے ہو یہاں؟ تمہیں شرم نہیں آتی ماتائی کے بارے میں ایسا بولتے ہوئے؟“ سوچنا کو غصہ آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ رو پڑی۔

دو دونوں بہن بھائی اپنی اقامت گاہ میں تھے۔ یہاں تین گوشے تھے، ایک کمرہ سوچنا کا تھا اور ایک ایش کنار کا۔ درمیان میں نشست گاہ تھی۔ دونوں بہن بھائی ادھر ہی بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ جب سے یہ واقعہ ہوا تھا، ایش نے بہن سے بھی ملنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج بہن خود ہی بھائی کے کمرے میں دستک دے کر آئی تھی۔

بہن کو روتا دیکھ کر ایش کنار نے کوئی پردہ نہ کی اور کمرے سے جاتے جاتے بھی دل کے کچھ پھوٹے چھوڑ گیا اور سوچنا کے کان میں انکارے انداز میں بولی۔

”معاملا اس پر ہی بس نہیں ہوا ہے، یہ کتاب آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ ماتائی کا کھلا یا ہوا یہ گل سب کو لے ڈوبے گا۔“

سوچنا نے بھائی کی اس بات پر اچانک روتا بند کر دیا اور خوف زدہ کی نگاہوں سے بھائی کو کمرے سے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

درحقیقت اسے خود بھی ماں پر غصہ تھا۔ دونوں بچوں کے دل میں نفرت کا بیج تو تجو بانی نے بوی دیا تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ نفرت سے نفرت ہی جنم لیتی ہے۔

سوچنا کو کا ایک محسن کا احساس ہونے لگا۔ وہ پہلے ہی راج محل کو ایک سونے کا قید خانہ سمجھنے لگی تھی اور اس کے ان محسوسات کو رابرٹ نے مزید ہوا دی تھی۔ ایسے میں اسے رابرٹ یاد آنے لگا۔ وہ آج اپنے دل میں پہلی بار رابرٹ کے لیے ایک لطیف جذبہ محسوس کرنے لگی۔ کیسا بکا بھلا اور دلیر و رولو جوان تھا۔ شہزادہ ہی تو لگتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کے بکھرے ہوئے خیالات اور دماغی بھجان کو ایک قرار سا محسوس ہونے لگا۔ وہ اس کی باتیں یاد کرنے لگی اور دل ہی دل میں شرمانے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب بڑی شدت سے اس کے دل میں رابرٹ کی یاد نے چنگی مرتبہ بٹکتی سی پھردی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی اور اسی کے بارے میں

سوچنے لگی۔ حالانکہ پہلے اس کا ارادہ ماں سے ملنے کے لیے تجلیہ گاہ جانے کا تھا۔

ادھر جب ایش کنار اپنی اقامت گاہ سے نکلا تو اس نے پوچھی تجلیہ گاہ کی طرف جانے والی راہداری کو دیکھا اور ابھی وہ نفرت سے ہونٹ سیڑھے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرنے ہی والا تھا کہ اچانک اسے وہاں سے کوئی آواز دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹک گیا اور جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

جیسا کہ مذکور ہوا، اس گوشے کی طرف دن میں بھی تاریکی کا ہی سماں رہتا تھا۔ سو وہاں بھی دن میں..... اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اور اسی اندھیراؤں سے وہ ہولنا نمودار ہوا تھا۔ وہ افسانہ جیولا لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا..... قریب..... اور قریب..... پھر دوسرے ہی لمحے ایش کنار کو چوکنٹا پڑا۔ اس نے دیکھا وہ پھجورام تھا، اس کی ماں کا پرانا نمک خوار..... اس سے جب وہ ذرا اچالے میں اور قریب آیا تو ایش کنار نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بہ غور دیکھا، وہ تاثرات ایسے تھے، جو اس وقت پھجورام کے چہرے پر طاری تھے، انکی غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی بھلا کیا تھی.....؟ وہ تو خود ہی بتا رہے تھے کہ تجو بانی تجلیہ گاہ میں بھی کیا کھل کھلائے ہوئے تھی..... پھجورام بڑی ست اور شرابی کی چال چلتا ہوا، اپنے اقامتی گوشے کی جانب بڑھا چلا جا رہا تھا اور ستون کی آڑ میں چھپا ہوا ایش کنار پر سوچ انداز میں اپنے ہونٹ سختی سے سمجھتے ہوئے تھا۔ اسے اپنے اندر استہزائیہ قہقہوں کا گہرے شور سنائی دیتا..... محسوس ہو رہا تھا، اس قدر..... کہ اس سے راج محل کے درود یوار تک لرزے ہوئے لگے۔

☆☆☆

سورج کی نو دمیدہ کرنیں جمبو پڑے پر پرچموں کی طرح پڑیں اور سب سے پہلے گارشیانے کسمسا کر اکھٹیں کھولیں۔

اس نے فرش پر لیٹے لیٹے ایک وقت جہاں اور انگڑائی لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھا جہاں قریب میں رہنا کو سونے پڑے ہونا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ یہ دیکھ کر چونک گئی کہ وہ جگ خالی تھی۔ فقط بستر اور سونا گرم لحاف بکھرا ہوا تھا ایک طرف پہلے تو وہ بھی سمجھی کہ اس سے پہلے وہ جاگ چکی ہوگی اور کہیں باہر دوڑ کر کوئی ہوگی۔ لہذا وہ ابھی، مگر اس پر کسلندی طاری رہی۔

بوڑھے ننڈو بابا اور اس کی بیوی شانہ کے جل مرنے کے بعد کھانا وغیرہ پکانا کس کی اور دنیا کی ذمہ داری تھا۔ آج ناشا بنانے کی.... باری اس کی تھی اور اس کا کام کرنے کو جی



نہیں چاہہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر چائے اور ناشتا کرنا سے ہی بنانے کو کہہ دے گی، اسے یقین تھا رینا انکار نہیں کرے گی۔

لیکن وہ تھی کہاں.....؟ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی سوچتی رہی، جب ہی اسے دوسرے گوشے سے اپنے بھائی رابرٹ کی غصہ منی آواز سنائی دی۔

”چلو بھئی جاگ پڑو دونوں..... ناشتا بنا لو بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ شرابی تھا اور اسے صبح اٹھتے ہی سخت بھوک لگتی تھی۔

”برادر! رینا کہیں گئی ہوئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو تم رینا کو.....!“ رابرٹ کی آواز ابھری۔ ”غمرہ گئی کہاں ہے اتنی صبح صبح.....“

”چائیں، میں خود حیران ہوں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”اجھا.....!“ رابرٹ کی گونگی آواز ابھری۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں پوری طرح جاگ چکے تھے اور رینا کو ادھر ادھر تلاشتے پھر رہے تھے۔ شوکی بھی رینا کے اس اچانک غیاب پر پریشان تھا۔ انہوں نے ہستی والوں سے بھی رینا کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بھی لاشمی کا اظہار کیا تو ان کا ہاتھ ٹکا۔

”رینا کو سوتے میں اغوا کر لیا گیا ہے۔“ اچانک جیسے شوکی نے ان کی ساتھیوں میں ایک دھماکا کر ڈالا۔

”کیا..... تمہیں کیسے پتا چلا؟“ گارشیا نے اس کی طرف پریشان کن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس گوشے کا باریک بینی سے جائزہ لے کر آیا ہوں۔“ شوکی نے بتایا۔ ”جدھر غم اور رینا سوتے ہو وہاں اور باہر اطراف میں مجھے کچھ ایسے نشانات ملے ہیں جن سے مجھے یقین کہ حد تک شبہ ہے کہ.....“

”مگر کون لوگ اسے اغوا کر سکتے ہیں؟“ رابرٹ نے درمیان میں کہا۔

”ان بد معاش پجاریوں کے سوا یہ حرکت اور کسی کی ہو سکتی ہے۔ میں ابھی کالی کے مندر جاتا ہوں۔“ شوکی ایک دم جوش میں آگیا۔ رابرٹ خاموش تھا مگر گارشیا نے اس کا راستہ روک لیا، بولی۔

”نہیں، تم اکیلے وہاں مت جاؤ، وہ بہت خطرناک لوگوں کا ٹولہ ہے۔ میرا خیال ہے ان ہستی والوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔“ اس نے آخر میں اپنا خیال پیش کیا تو رابرٹ استہزاء سے ہنس بولا۔

”یہ بے چارے ہستی والے ہماری کیا مدد کریں گے جو خود ہماری مدد کے محتاج ہیں۔“

شوکی کو اس کا یہ تہمیرہ براگ غمرہ ایسے نازک وقت میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ تاہم بولا۔

”تم دونوں ادھر ہی رہو..... رینا کو میں خود ہی کالی کے مندر میں جا کر تلاش کروں گا، کیونکہ مجھے پکا یقین ہے یہ حرکت مہا پجاری بددیانتی کے ساتھ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔“

”بھد شوق..... ہم ادھر ہی تمہارا انتظار کریں گے۔“ رابرٹ نے فطری انداز میں کہا تو گارشیا نے رہی سے بھائی کی طرف دیکھا اور اس کے کان میں کچھ کھسکھس کر رابرٹ کو جب بات سمجھ میں آئی۔ راج محل جانے اور راجا پر تاب کنار سے ملاقات کا یہ سنہری موقع تھا۔ ورنہ وہ وہ جذبہ رقاہیت تلے شوکی کو خطرے میں ڈالے ہی لگا تھا۔

گارشیا نے ہی اسے احساس دلا یا کہ یہ غلط ہوگا شوکی ان بد معاش پجاریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لاشمی رینا کی جان ہی نہ خطرے میں پڑ جائے، پھر رابرٹ کی آنکھوں میں اپنا وہ دیرینہ منصوبہ بھی نظر آئے گا تھا جو وہ سوچنا کے حوالے سے ترتیب دے رہا تھا۔

سوچنا کا خیال آتے ہی اس نے پہلی بار شوکی سے ذرا سنجیدگی سے وہی کچھ کہا جو گارشیا نے اسے بتایا تھا مگر شوکی نہ مانا، وہ اپنی ہٹ کا پکا ٹکا۔ اس نے ان دونوں میں مہا پجاریوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اسے راجا پر تاب کنار سے مدد کی کوئی توقع نہیں ہے، لہذا رینا کی تلاش میں جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہوگا۔

شوکی اپنے مختصر سے ہتھیاروں کے ساتھ کالی کے مندر کی جانب بڑھ گیا۔

”چلو دفع کر دو اس مندی آدمی کو..... ہم راج محل چل کر راجا صاحب سے ملتے ہیں۔ ہائے کیسے پیش تھے جب ہم وہاں رہتے تھے۔“ رابرٹ شاہی محل (راج محل) میں گزارے ہوئے وہ دن بڑی حسرت سے یاد کر لگا۔

انگلے ایک کھٹے بعد دونوں بہن بھائی ایک گھوڑے پر راج محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے بھر میں چالاک رابرٹ نے اپنے دیرینہ رقیب شوکی کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تیار کر لی تھی، لیکن جب اس نے اس کے بارے میں اپنی بہن گارشیا کو بھی اپنا ہم خیال بنانا چاہا تو اس نے فقط ایک خدشے کا اظہار کیا کہ اس طرح کہیں شوکی کی زندگی کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔

مکار رابرٹ جانتا تھا کہ اس کی بہن شوکی کی محبت میں

گرماد ہے، وہ اسے بھی بیوقوف بنانے کی غرض سے سبز باغ دکھانے لگا۔

”دیکھو سسز! شوکی کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھنا میں کرتا کیا ہوں اور دے بھی جب تک رینا زندہ ہے، شوکی بھی مجی گھبرا نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر میں اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔“ گارشیا نے زہریلی ناگن کی طرح پھر کر کہا۔ وہ اپنے ان مکارانہ کام کا پہلے ہی بھائی کے سامنے اظہار کر چکی تھی۔

”بس، بھڑدی کرتی جاؤ اور دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔“ رابرٹ نے مکاری سے کہا۔ گارشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ رینا جن لوگوں کی لہ میں ہے، وہ ساری غمرہ وہیں رہے۔ تاہم ایک اور خدشے تلے بھائی سے گویا ہوئی۔

”اس بات کا خیال رہے کہ اصل حقیقت راجا صاحب کو پتا نہ لگنے پائے، ورنہ لاشمی دونوں نہ ان کے عتاب کی (وہیں آجائیں۔“

”یہ غمرہ ہوسسز! رابرٹ ایسے کچے کام نہیں کرتا۔“ رابرٹ نے مسکرا کر کہا۔

یہ دونوں بہن بھائی رینا اور شوکی کے خلاف ایک نئی سازش لے کر ناکرہ پہنچ گئے۔ ان کی آمد کتنے ہی راجا پر تاب کنار نے پتا کیا۔ انہیں اپنے ورور مطلب کرنے کا غم صادر ہو گیا تھا۔

”رینا کدھر ہے.....؟“

ان دونوں کو دیکھتے ہی تاگرہ کے راجا پر تاب کنار کے غصے سے اختیار یہ الفاظ پھسلے تھے۔

”دونوں مکار بہن بھائی رونے لگے اور اسی حال میں رینگے بارے میں بتایا کہ اسے وہ مسلم لڑکا شوکت حسین عرف شوکی اغوا کر کے لے گیا ہے۔“

راجا پر تاب یہ سننے ہی ایک دم جیسے چند ثانیوں کے اندر کھٹکے میں آگیا۔ اسے پہلے اپنی ساتھیوں پر یقین ہی نہیں آ سکا، مگر دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو نہ پاسا اور جوش فیلڈ لگا، ایک دم اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہم نہیں تھا، فاس بھی احترا مانا اپنی نشستیں چھوڑ کر منوبانہ کھڑے ہو گئے۔

”اس نوکر کی یہ جرأت..... اتنی ہمت..... کیا وہ نہیں جانتا کہ رینا ہمارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے؟“

”جانتا تھا حضور! بہت اچھی طرح جانتا تھا۔“ شاطر رابرٹ نے مکارانہ فروتنی سے جواب دیا۔ وہ بھی اب

ہندوستانی ادب و آداب کے طور طریقے جان گیا تھا، اسی انداز میں آگے بولا۔

”اسی لیے تو رینا کو راتوں رات نیند کی حالت میں بے ہوش کر کے خاموشی سے اغوا کر بیجا کھڑا ہوا۔“

”لیکن..... شوکی بھلا یہ حرکت کیسے کر سکتا ہے؟“ راجا پر تاب کنار کا دماغ ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو گنگو سے لہجے میں جیسے خود کلامیہ بولا۔ ”وہ تو یہ قول ان دونوں باپ بیٹی (رینا اور پروفیسر ہنری) کے ان کا بہت خیر خواہ اور بے حد قابل اعتبار ملازم تھا۔ میرا خیال ہے تم دونوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”ہرگز نہیں یور ہائینس!“ اس بار گارشیا نے لب کشائی کی۔ ”ہم بھی ابتداء سے ہی ان کے ساتھ رہے ہیں۔ شوکی کی نیت شروع ہی سے رینا پر خراب تھی۔ وہ سوچنے کا منتظر رہتا تھا۔ میں نے اور برادر رابرٹ نے کئی بار گنگے اٹھوں شوکی کو رینا سے زبردستی دست درازی کرتے دیکھا اور چپڑا یا تھا۔“

گارشیا نے یہ سفید جھوٹ اس صفائی سے راجا پر تاب کنار کے گوش گزار کیا کہ وہ اسے سمجھ کچھ بٹھا۔

”مجھے تو لگتا ہے یور ہائینس کہ شوکی کی پشت پر کسی خطرناک گردہ کا ہاتھ ہے۔ وہی گردہ جو انسانوں کو غلام بنا کر افریقہ اور عرب ممالک میں فروخت کیا کرتے ہیں۔“

رابرٹ نے بڑی مکاری سے ایسا نقشہ کھینچا کہ راجا پر تاب کنار بے یقینی میں، سخت تشویش زدہ بھی ہو گیا۔

رینا کے ذکر پر وہاں موجود مصائبین نے ایک دوسرے کی طرف متنی نظر دلوں سے بھی دیکھا تھا مگر کچھ کہنے یا بولنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔

مختصر یہ کہ راجا نے رابرٹ اور گارشیا کو مہمان گاہ میں بھیج دیا اور خود سات سائیں کا ایک دستہ تیار کروا کر رینا اور شوکی کی تلاش میں روانہ کر دیا۔

رابرٹ کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ راج محل میں آتے ہی اس نے بلا دیر سوچنا سے ملاقات کر ڈالی۔ سوچنا بھی ایک عرصہ اس سے دور رہ کر اس کے لیے اپنے دل و دماغ میں.... خدارا لوہے جتنی ہی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسا رابرٹ کے دور ہو جانے کے بعد ہی ہوا تھا۔

وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس کا دلہانہ پن دیکھ کر تو ایک لمحے کے لیے چالاک لومڑی جیسا رابرٹ بھی حیران و پریشان رہ گیا مگر دل ہی دل میں خوش بھی ہوا کہ شکار چھندے سے دور رہتے ہوئے بھی دام میں تھا۔

اسے سوچتا ہے وہ آخری ملاقات اچھی طرح یاد تھی



جب اس نے فوج اور معصوم سوجھنا کے گل رخ بدن اور اس کے جذبات کو چھیڑتے ہوئے اپنی محبت کا رنگ الاہ تھا اور اسے انگلستان کے آزاد اور مکمل ماحول کے بارے میں سبز بارخ دکھائے تھے اور اس کی تعریف میں خوب گن گاتے ہوئے دور کے سہانے دخول بجائے تھے۔ نادان سوچنا ابھی تک اس کی ان باتوں کے سحر سے نہیں نکل سکی تھی۔

وہ اسے خوب گرماتار ہادور پھر وہی پچھنی چیز ہی باتیں کرتا رہا۔

راج محل میں آج انہیں دوسرا دن تھا کہ ہر طرف ایک یہ شور مچ گیا کہ انگریز افواج نے ریاست ناگرہ پر دھاوا بول دیا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن ملک پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پیدہ سحر کی ملکجاہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔

ریاست ناگرہ کی طرف جانے والے مل کھاتے پہاڑی راستے سے پرے اور بہت دور جہاں ہر دو دروازے کا گھنا جنگل، سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں کی صورت میں آگے بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں ایک میدانی اور قدرے سطح مرتفع کے مقام پر برٹش آرمی اور ملٹری فورس کوہ ٹالیہ کی ان پہاڑیوں کے دامن تک پہنچنے کے لیے اپنی مسکری قوت کو جمع کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

اس مقام کو فرنگی عسکری منصوبہ سازوں نے اپنی جنگ اصطلاح میں ”تین حدے“ کا نام دے رکھا تھا۔ یہاں سب سے پہلے فرنگی اپنی پوری عسکری قوت کو جمع کرنے کے بعد فیصلہ کن قدم بڑھانے والے تھے۔ دوسری سے ایک اور..... دشوار گزار راستہ ناگرہ تک جاتا تھا جہاں سے راجا پر تاج کار کے قلعے راج محل میں..... یہ آسانی اور موثر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس راستے سے صرف انگفری فوج ہی داخل ہو سکتی تھی اور اسے بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

جیسا کہ مذکور ہوا یہ راستہ جسے ”روٹ زیر“ کا نام دیا گیا تھا۔ بے حد جنگ، دشوار گزار اور تباہوار تھا، جبکہ وہ راستہ جہاں پر انگفری سمیت آٹھری اور آڈوٹینس (توپیں، گولہ بارود) کی آمد و شد بہ آسانی ممکن تھی..... ”روٹ ون“ تھا۔ بڑے بڑے دوڑوں میں چار توپیں لاوا کر اس مقام پر اتاری گئی تھیں۔

یوں اس تقریباً نصف بریگیڈ کی فوجی قوت کی کمانڈ بریگیڈ میجر ڈان کیورٹم کے سپرد تھی۔ میجر ڈی فارست اس کے

ہمراہ تھا جبکہ کرنل بلٹروڈ اپنی رجمنٹ کے ایک کمانڈنگ آفیسر جرنل کے ہمراہ اپنی ٹائلیں کے ساتھ ”روٹ زیر“ کی جانب علم لٹے ہی کوچ کر جاتا۔

دوسری جانب کرنل اینڈرسن اپنے ایک مددگار کپٹین رچرڈ کے ہمراہ مال گاڑی میں موجود تھا۔ فوری رابطے کے لیے ٹیلی فون کی تاریں زمین میں بچھادی گئی تھیں۔ جس مقام پر ”پکے“ نصب کرنا تھے، وہاں یہ بریگیڈ تین حصوں میں تقسیم ہو کر حملے کا ایک وقت آغاز کر ڈالتے۔

لہذا ”روٹ ون“ پر جہاں سے یہ آسانی انگفری سمیت آٹھری فوج ریاست ناگرہ پر حملہ کر سکتی تھی۔ یہاں سے پیش قدمی کے لیے عارضی طور پر ڈیرا ڈال لیا گیا۔

یوں اب وہ اپنے کمانڈر کی طرف سے اگلے احکامات کے منتظر تھے۔ جبکہ اسی راستے سے تقریباً سولہ سترہ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال جنوب کی طرف ریلوے لائن تھی۔ اور وہاں ایک چار بویوں والی مال گاڑی مناسب رفتار سے چلی آرہی تھی اس میں نوے بارہ اونچ ڈھانوں والی دو توپیں لدی ہوئی تھیں اور مساح افواج تھی۔ یہ سب ماہر توپچی (گنر) تھے۔ اس مال گاڑی نے اپنے ٹھیک مقرر کردہ مقام پر پہنچ کر رک جانا تھا۔

چنانچہ جب ”تین حدے“ پر تینوں ٹائلیں جمع ہو گئیں تو بریگیڈ میجر ڈان کیورٹم نے کرنل بلٹروڈ کا ”روٹ زیر“ کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ فوراً روانہ ہو گیا۔ لہذا انہیں روانہ کرنے کے بعد ڈان کیورٹم نے اپنی بریگیڈ کے ساتھ ”روٹ ون“ کی طرف پیش قدمی کر ڈالی۔

دوسری جانب آرمی مال گاڑی، جس میں کرنل اینڈرسن اپنے ساتھی کپٹین رچرڈ اور پوری آڈوٹینس کمانڈ کے ساتھ موجود تھا، اپنا مقررہ سفر طے کرنے کے بعد ایک مقام پر رک گئی۔ اس کے بعد مال بویوں کے جھنگے کھولے گئے اور ان پر تختے لگا کر دو توپوں کو نیچے اتار دیا۔ دیگر فوجی بھی چاق و چوبند انداز میں نیچے اتار آئے۔

ٹیلی فون کی بچھائی ہوئی تاروں سے ریسیور اور سیٹ منسلک کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تینوں برٹش کاپس میں رابطہ قائم ہوتے ہی، انہیں جنگ شروع کرنے کا آرڈر مل گیا۔

یہ لوگ دو پہیوں والی توپیں دھکیلے ہوئے برابر پیش قدمی کرتے رہے۔ جب یہ ناگرہ کی سرحد کے بالکل قریب پہنچے تو کرنل اینڈرسن نے یہاں سے فوجیوں کو ”ایڈوانس“

کرنے کی کمانڈ جاری کر دی۔

وہ ایسے رخ پر تھے کہ ٹیکس وہ راج محل کو جنوبی سمت سے لٹا نہ بنا سکتے تھے، مگر یہ تب ہی ممکن تھا جب ریاستی فوج کی دیوار گرے۔

جنگ کا ٹکڑا جیتے ہی ایک وقت تین اطراف سے انگریز فوجیوں نے ریاست ناگرہ پر دھاوا بول دیا۔

☆☆☆

”غفرہ عجیبہ..... اللہ اکبر.....“

جنوب مشرقی سرحد پر موجود اتحادی فوج کے سالار مل ریمان نے فرنگیوں کی طرف سے فائرنگ اور گولہ باری ہوتے ہی یہ غفرہ بلند کیا تھا۔ جنگ کی ابتدا ہو گئی تھی اور دونوں جانب سے بارود اور شعلوں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔

ملی ریمان کے ہمراہ اس کے نائب کی حیثیت سے لوپ شہباز خان کافر زندہ ارجمند بھی تھا۔ یہاں ان کے پاس پانچ ہاتھی سوار تھے۔ انہیں ملی نے ابھی پیچھے رکھا تھا۔ ہاتھی پانچ باگی سوار سرحد کی جنوب مغربی سمت میں تھے اور وہاں اقبال خان تھا۔ وہاں ایک توپ اور دراصل برادر سپاہی بھی تھے۔ باگھی سواروں میں بہترین تیر انداز اپنے ہودوں میں تیار بیٹھے تھے۔

ملی ریمان نے اپنے توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دیا تھا۔ ایک ایک گولہ پھاڑ دھا کا ہوا۔ دشمن کی طرف سے جھپکا ہوا ایک گولہ ان کے پکے کے بالکل سامنے صرف چند گز کے فاصلے پر گرنا تھا اور اس بھاری گولے نے دشمن پر بہت گہرا گڑھا پیدا کر دیا تھا، اس کا بارود اطراف میں دو در و در تک چلتی سکتی چٹکار یوں کی صورت پھیلا تھا۔ ملی کاشوش ہوئی، اس نے چلا کر توپچیوں کو حکم دیا۔

”اسی کی ڈگری پر گولہ داغ..... جلدی.....“

حکم سننے ہی توپچی نے پھرتی سے اسپاتی چوٹی گھمائی، ہرل کواہی ڈگری پرایڈ جسٹ کیا اور بیس پر شعلہ دھکا کر گولہ داغ دیا۔ یوں انہوں نے بھی جوابی حملہ تیز کر دیا۔

یہ ناگرہ کی وہ سرحدی حدود تھیں جہرے دشمنوں نے اپنے ”روٹ ون“ سے پیش قدمی کی تھی اور راجا پر تاج کار کے بیٹا پتی کے مطابق جی کہ وہ راستہ تھا جہاں سے فرنگی افواج بھاری فزری اور اسلئے کے ساتھ راج محل پر حملہ کرنے کی کوشش میں تھے۔

ناگرہ افواج ان سے سیدھے ہاتھ پر کوئی پندرہ فرخ کے فاصلے پر تھی۔ اتحادی افواج کی جوابی گولہ باری کے

ساتھ ہی انہوں نے بھی فرنگیوں پر جوابی حملے کی ابتدا کر ڈالی تھی۔

میدان جنگ کے اس حصے میں اگلے کئی گھنٹوں تک محسوس کارن بڑا رہا۔ ناگرہ اور اتحادی افواج ابھی دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھیں جبکہ فرنگی افواج مسلسل جارحانہ انداز اختیار کے ہوئے تھی۔

ملی نے جب دیکھا کہ ان کی افواج مسلسل فرنگیوں کے دباؤ سے نہیں نکل پا رہی ہے تو اسے تشویش ہوئی۔ اس کے مطابق تین گھنٹوں بعد انہیں دھکیل دینا چاہیے تھا۔ اگر جنگ کی مسلسل یہی صورت حال رہتی تو ممکن تھا کہ فرنگی افواج ان پر چڑھ دوڑتی۔

اس نے فوراً تیز رفتار گھوڑے پر سواری کی اور آندھی طوفان کی طرح وہ ناگرہ کی افواج کے بیٹا پتی موج سنگھ سے ملا وہ اس وقت اپنے مورچے کے قریب ایک چھوٹا درباری میں موجود تھا۔ ملی کو نور آس سے ملوایا گیا۔

ملی کو اس بات کا احساس تھا کہ موج سنگھ یا کوئی اور اسے اربہ کے بھائی سوشل کی حیثیت سے پہچان سکتا تھا۔ اس لیے اس نے احتیاط کے طور پر اپنے سر پر بجا ہند انداز میں باندھے ہوئے صافے کو بکھڑا اس طرح چہرے پر بھی جھکا لیا کہ شکل پوری طرح واضح نہ ہو پائے۔ یوں بھی یہ جنگ کا میدان تھا، کسی کو بک اس کی صورت کا دھیان نہ رہتا۔ راج محل میں بھی چند لوگوں نے ہی اسے دیکھا ہوگا، وہ اربہ اور شاہ زمان کی طرح زیادہ عرصہ وہاں کب رہا تھا۔ یوں حاسوسوں والی بات کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے پیش نظر اس نے ایسا کیا تھا۔

بہر کیف..... وہ اندر داخل ہوا تو اسے موج سنگھ کو بڑے آرام سے بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ایک فرشی نشست پر گاؤٹیکے سے پشت ٹکاے بڑے آرام سے بیٹھا تھا اور اس کے قریب..... طعام..... بھی رکھا تھا۔

”آؤ..... علی! اتم شاید ہمیں یہ خوش خبری سنانے آئے ہو گے کہ ہم ان فرنگیوں کو کیسا تھوڑا جواب دیے ہوئے ہیں۔“ فرسٹی میں ڈوبے ہوئے موج سنگھ نے کہا۔

”بہت جلدی یہ خوش خبری بھی ہوگی..... اے حلیف ہر کاہ!“ علی نے مصلحتاً خبر گیری کا عنوان رکھتے ہوئے اپنی گفتگو کی ابتدا کی۔ ”لیکن میں اس کامیابی کو زیادہ دیر مصلحت نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو فرنگیوں کو جنگ کا پانسہ پلٹنے کا بھرپور موقع مل جائے گا..... اور ان کا اگلا وار ہماری شکست ہو سکتا ہے۔“



”کیا مطلب؟“ موج سٹکھ چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی علی کو بھی اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ علی نے فریخت سے سنبھالا اور بولا۔

”جی ہاں! سچ سے جنگ کی ابتدا ہوئی اور اب سبھی کھینے ہو چلے ہیں، مگر ہم مسلسل دفاعی صورت سے باہر نہیں نکل پارہے ہیں۔ ہمیں دو پہر سے پہلے پہلے دفاعی سے جارحانہ پوزیشن میں آ جانا چاہیے۔“

اس کی بات پر موج سٹکھ نے خفیف سی ٹانگ بھول چڑھائی پھر اسے ایک ہنسی میں بدلتے ہوئے کہا۔

”چنانچہ کی ضرورت نہیں، ہم اور ہماری اتحادی فوج ان فرنگیوں کی نفری سے کہیں زیادہ ہیں، یہ اپنا اسلحہ اسی طرح ضائع کرتے کرتے سر پہرنگ خالی ہاتھ لوٹ جائیں گے۔“

علی کو اس کے یہ خیالات جان کر نفوس ہوا بولا۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ہم کسی ایک پڑوسی ریاست سے سرسریہ کارکنیں ہیں، بلکہ برٹش گورنمنٹ کی ملٹری اور آرمی سے تیرا ڈنا باہن، جو نفری سے زیادہ عسکری اہمیت کی حامل ہے، ان کا اسلحہ ہم سے زیادہ ہماری اور جدید ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا، ہم جاؤ اور جنگ کا سبکی انداز اختیار کیے رکھو دیکھنا۔ پہرے پہلے پہلے ہمارے تجربے کا نتیجہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔“ موج سٹکھ نے پر غرور لہجے میں کہا اور علی کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کپے کی راہ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

علی جب سینا پتی موج سٹکھ کی چھو لہاری سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو ایک شخص ڈرافٹ سے کھڑا بڑے غور سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

یہ موج سٹکھ کا نائب سالار تھا، یہ وہی شکلا تھا جو پچھورام کا ہم خیال تھا۔ اسے کھد بد ہوئی کہ آخر اتحادی فوج کا یہ سالار اس کے سینا پتی کے پاس کیا کرنے آیا تھا؟ یہ جانتے کے لیے اس نے فوراً سینا پتی موج سٹکھ کی چھو لہاری کا رخ کیا۔

”آؤ شکلا جی! کیا اس اتحادی فوج کے سالار علی نے تم سے بھی کچھ کہا۔“

”ایسا کچھ خاص تو نہیں، آپ سے کیا کہا اس نے.....؟“ شکلا نے بڑی مکاری سے کہتے ہوئے اپنے لیے کوئی جھوٹ بولنے کی کوشش رکھنا چاہی۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا جب موج سٹکھ نے

اسے علی کی آمد کے بارے میں آگاہ کیا۔

”دیکھا، سینا پتی جی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ اتحادی بڑی چالاک کی کریں گے ہمارے ساتھ، اپنا اسلحہ اور فوج خرچ کرنے کے بجائے ہم پر اس کا دباؤ ڈالیں گے، آپ نے بہت اچھا جواب دے کر اسے ٹوٹا دیا۔“ شکلا ایک دم بولا۔

درحقیقت شکلا نے اپنے منصوبے کے مطابق ہی سینا پتی کو یہ پتی پہلے سے ہی پڑھادی تھی جو اسلحہ میں پچھورام کا ہی منصوبہ تھا کہ اس جنگ میں خود آگے ہونے کے بجائے اتحادی فوج کو ہی آگے بڑھنے دیا جائے اور اپنا اسلحہ بھی کم سے کم خرچ ہو۔

موج سٹکھ اپنی افواج کا ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا، جنگ میں کب مصلحت اور کب دور اندیشی سے کام لینا تھا، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ ظاہر وہ اپنے نائب کی باتوں میں آ کر نکلتا تھا، مگر اس نے بھی حالات پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

لہذا جب سپہ سالار کو اس نے خود میدان جنگ کا جائزہ لیا تو اسے فکر دشواری نہ آئی۔ جنوب مشرقی راستے پر فرنگی افواج کی فرخ اور آگے بڑھ آئی تھی اور اب کسی وقت بھی وہ راج محل پر گولہ باری کرنے کی پوزیشن میں آسکتی تھی۔ موج سٹکھ جانتا تھا کہ اگر اس راہ سے ایک گولہ بھی راج محل کے اندر تو کیا اس کی تفصیل کے سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی شامت آ جائے گی۔

وہ اپنا نقشہ بھلا کر اپنے کپے پر پہنچا اور اس نے حملہ حیز کرنے اور توپوں کے استعمال کی اجازت دے ڈالی۔

شکلا نے یہ دیکھا تو اپنی نگاہیں جھانک رہا گیا۔

اور اتحادی افواج بڑی بے جگری سے فرنگیوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ لیکن انہیں بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جب تک ناگرہ کی فوج دشمن پر بھاری حملہ نہیں کرے گی، جنگ کا پانسان کے حق میں نہیں پلٹ سکتا تھا۔

اجانک ایک ساعت دشمن دھماکا ہوا۔ فضا میں کسی انسانوں کی چیخیں ابھریں۔ خود علی اپنے کپے سے چند فٹ دور جا کر اہر طرف بارود کی دیوار شعلوں کا قرض ملادی ہو گیا۔ دشمن کے گولے نے ان کا ایک پکھا تباہ کر دیا تھا اور دوسری سپاہی بھی مارے گئے تھے۔

علی نے توپ خانے کا رخ کیا تو یہ دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا کہ ایک توپ اپنی پڑی تھی جبکہ دوسری توپ کے گرد دشمن سپاہی زمین پر پڑے توپ رہے تھے۔ اپنے مختصر اور عارضی توپ خانے کی یہ حالت دیکھ کر علی نے

لودی اسے سنبھالنا چاہا تو اسے دیکھ کر چند سپاہی اس کی مدد کو لگے۔

علی نے بہت تازہ کر دشمن کے توہہ فساد پر کاجازہ لیا جس طرف سے وہ اپنی توپیں دھکیلنے ہوئے قریب تر لانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور وہاں ایک گولہ تڑکی ڈگری پر دھنسا دیا۔

علی کی طرف سے یہ جوابی گولہ تھا جو نشانے پر لگا، اسے کئی فرنگیوں کے ٹاپاک وجود فضا میں اڑتے ہوئے نظر آئے۔ سپاہی علی کے اس بہترین نشانے پر اس ان کراٹھے۔ علی نے حملہ تیز کرنے کا حکم دے ڈالا اور سپاہیوں کو یہاں مقرر کرتے ہوئے ڈگری بتا کر وقفہ وقفہ سے گولہ باری کرنے کی ہدایت کردی اور خود نگین دار رائفل اور بارود کا تھیلہ سنبھالے دوسرے کپے کی طرف آیا۔ وہ سپاہی بے جگری سے دشمن سے تیرا ڈنا کرتے۔

علی نے یہاں سے دو تین بارودی بم اچھالے لیکن اس کی تشویش پر فرار رہی۔ وہ بدستور میدان جنگ کے پانے کو فرنگیوں کے حق میں پلٹے دیکھ رہا تھا اور اس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ اسے ناگرہ کے سینا پتی موج سٹکھ پر سخت عیش آ رہا تھا جو اطمینان سے بیٹھا تھا مگر توپوں کی دیر بھری اسے خوش گوار حیرت نے آن لیا جب اس نے جنوب مشرق کی سمت سے آگے بڑھتی فرنگی افواج پر کچے ہاتھ لگے گولہ باری ہوتے دیکھی۔ وہ سمجھ گیا کہ انھوں کی ہمت میں رہنے والے سینا پتی موج سٹکھ کو اب جا کے میدان جنگ کی صورت حال کا اندازہ ہوا تھا۔

”دیر آید درست آید۔“ علی نے زیر لب کہا۔

ناگرہ افواج کے صحیح معنوں میں حرکت میں آتے ہی اتحادی افواج کے بھی حوصلے بلند ہو گئے۔ علی نے بھی اپنی فوج کو بڑھ چڑھ کر دشمنوں پر دھاوا بولنے کا حکم جاری کر دیا۔ توپ خانہ اب اس نے۔ سنبھال لیا تھا، تاہم اس نے پانچ ہاتھوں پر سوار تیرا اندازوں کو آگ کے تیر پھینکنے کا بھی حکم دے دیا۔

لودی دیر بعد آگے بڑھتی ہوئی دشمن افواج کی صفوں میں کھینچ بیٹھ گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ بارود میں جا پھنسی جہاں سے علی تھی۔

یہ دیکھ کر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا، تاہم اس نے اب اپنی فوج کو جیسے تھی تیار کر دے دیا۔

یہی صورت حال جنوب مغربی سمت میں اتحادیوں کے نائب سالار اقبال خان کی تھی۔ اس نے دشمن کو پسپائی

اختیار کرتے دیکھ کر ان پر نہایت بے جگری سے تیرا توڑنے شروع کر دیے۔

اور متوقع فتح کنگست میں بدلتے دیکھ کر بریگیڈیئر ڈان کیورٹم بری طرح پھٹکا گیا۔ اس نے اپنے نائب سبجر ڈی فارست کو اسی طرح حملہ جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود اپنے خیمے کا رخ کیا، جو اس نے اپنی فتح کو قریب محسوس کر کے خالی چھوڑ دیا تھا۔

وہاں آ کر اس نے ٹیلی فون کی چرخی سمجھائی، مگر اندازہ..... ٹیلی فون کا کارہ ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ عارضی طور پر بچھائی ہوئی لائنوں کو بھی نقصان پہنچا تھا، مگر کچھ بیٹھنے والا وہ بھی نہیں تھا۔ اس نے فوراً دو سپاہیوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر ”رہوٹ زبرد“ کی طرف روانہ کر دیا اور چند ہدایات بھی دیں۔

رہوٹ زبرد پر کرنل بلسر ڈاؤ اپنی رجمنٹ کو لے کر پوزیشن سنبھال چکا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ اپنے نائب کپٹن رچرڈ کے ساتھ جتنی حکمت عملی پلان کر رہا تھا۔ ایک مقررہ حدود تک اپنی رجمنٹ سمیت ایڈوانس کرنے کے بعد وہ ٹھہر گیا تھا اور بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کے دو آدمی وہاں پہنچے۔

اپنے چیف کمانڈر کی طرف سے انہیں حملے کی ہدایت مل گئی تھی لیکن کرنل بلسر ڈاؤ کے مطابق ابھی وہ مطلوبہ مقام تک خاطر خواہ پیش قدمی نہیں کر پائے تھے۔ ڈان کیورٹم کے پیچھے ہوئے گھڑ سوار قاصد بھی ساتھ تھے۔ وہ حملے کے منتظر تھے تاکہ بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کی ہدایت کے مطابق وہاں جا کر اس حملے کی تصدیقی خبر اس کے گوش گزار کر سکیں۔

کرنل بلسر ڈاؤ اپنی رجمنٹ کے ساتھ جس راستے سے گزر رہا تھا، وہ مذکورہ طور پر انتہائی دشوار گزار اور تنگ گھاٹیوں اور اندھی کھاٹیوں پر مشتمل تھا لیکن یہاں سے اگر انہیں اپنا مطلوبہ ہدف مل جاتا تو وہ کامیاب ہلا بولنے کی پوزیشن میں آ جاتے، لہذا کرنل بلسر ڈاؤ کو اسی کا انتظار تھا۔ مگر ساتھ ہی اس کے ذہن پر ان دنوں قاصدوں کی گھر بھی سوار ہوئی تھی، جو ساتھ تھے۔

ایک مقام پر کرنل بلسر ڈاؤ نے ایک عدر (سنگل لینس) دوربین آنکھ سے لگا کر دوسرے کا جائزہ لیا تو اس کا دل غرط جوش سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ اپنی مطلوبہ منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے فی الفور اپنے فوجیوں کو حملے کے لیے پوزیشنیں تیار کرنے کا حکم دے دیا، یوں اب وہ اس کے آخری غم کے منتظر تھے۔



## نہلے پہ دھلا

☆ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کب ہوتا ہے؟  
○ جب گوالے کی بھینس غلطی سے زیادہ پانی پی جائے۔  
☆ اگر آپ کو سلیمانی ٹوپی مل جائے تو.....؟  
○ بغیر لکھن لڑے اسمبلی میں پہنچ جاؤں۔  
ہیں اگر راتوں کو نیند نہ آئے اور دن کو چین نصیب نہ ہو تو کبھی بیماری ہو سکتی ہے؟  
○ دماغی غلطی کی۔  
☆ کیا شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں؟  
○ بالکل..... اگر بکری شیر کے پیٹ میں ہو۔  
☆ محبوب اور بیوی میں کیا فرق ہے؟  
○ محبوب کو لاروں سے بہلایا جاسکتا ہے لیکن بیوی کو نہیں۔  
☆ آم کے آم اور گھلیوں کے دام کب وصول ہوتے ہیں؟  
○ اگر خوبصورت بیوی کے ساتھ ڈھیر سارا جیز بھی ہاتھ آئے۔  
☆ بھائی گڑا میں ہاتھ کیسے دھوئے جاسکتے ہیں؟  
○ جب کسی مچھلے کو لب سڑک جوتے پڑ رہے ہوں تو آپ بھی اپنا حصہ ادا لیجیے۔  
مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

## اعب

پٹا۔ ”ابا جان کار کی چابی دے دیں۔  
آج کانچ میں پارٹی ہے۔ 10 لاکھ کی کار میں جاؤں گا تو میرا رعب پڑے گا۔“  
باپ دس کا نوٹ پکڑا دے ہوئے۔ ”یہ لو..... میں لاکھ کی بس میں جاؤں گا تو زیادہ رعب پڑے گا۔“  
مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکستان شریف

بھائیوں میں گر پڑا۔ دو سپاہیوں نے اسے بے دردی سے اٹھایا، بھوک اور گھونٹوں سے مارنا پینٹا شروع کر دیا۔  
شاہ زمان نہتا تھا، اس کے پاس کوئی ایسا موقع نہ تھا کہ وہ ان ظالم فرشتوں کا مقابلہ کرتا۔ وہ اگر ایسا کرتا بھی تو اہل از وقت ہی کہلاتا، وہ انہیں اپنی طرف سے محتاط نہیں کرتا چاہتا تھا۔ گلو خلاصی تک وہ انہیں بے وقوف بنانے کی اپنی ہی کوشش کرتا چاہتا تھا۔  
جب مار کھا کر وہ بالکل نڈھال ہو گیا تو اسے دو لڑکیوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور ایک طرف چل پڑے۔  
اب اس حشری دستے میں جیپ سے اترنے والے بھی پھونچے شامل ہو گئے تھے۔  
یہ لوگ پیدل ہی پکٹے تک پہنچے تھے۔ وہاں ایک بڑا سائیم بنا ہوا تھا۔ ایک نہبتا چھوٹا سائیم بھی اس کے بغل میں نظر آ رہا تھا۔ نیم بے ہوش شاہ زمان کو اسی فیصے کے اندر لے جایا گیا اور اس کی شکلیں کس دی گئیں۔ باہر دوسرا پہرہ دار موجود رہے۔  
کانی دیر گزر گئی۔ شاہ زمان اپنے رتن بستہ وجود میں دردی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس کر رہا تھا، لیکن اسے اپنی تکلیف کی غفلت پروا نہ تھی۔ اریہ کی اسے زیادہ تشویش تھی۔ یہ بدحالت ہی اس کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے کہ اریہ دہری مصیبت کا شکار تھی۔ ایک یہ کہ وہ ٹرانٹ فونی افسر اسے جانے کہاں لے گیا تھا اور دوسرے..... اریہ کو بچھوئے ڈس لیا تھا اور اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ جبکہ وہ خود یہاں بندھا اور بے بس پڑا تھا وہ اریہ کی مدد کرنے سے بھی قاصر تھا۔  
یوں لمحہ بہ لمحہ اس کی بے چینی فزوس تر ہونے لگی۔ اریہ کو خود سے دور اور تشویشناک حالت میں پا کر اسے کسی لمحے میں نہیں آ رہا تھا۔ دل و دماغ جیسے سرخ آئندھوں کی آدھیں تھے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے جذبہ جہتیت رکھ کر اپنے کی کوشش کی اور اس کے اندر کاروائی گوریلانٹائی نے گریہ بیدار ہو گیا۔ اسے اور اک ہوا کہ وہ ایک لنگو چاہد ہے۔ ایک گوریل ہے جو ہر قسم کے نازک حالات میں بھی اپنے خواص بحال رکھتا ہے اور اس کی توجہ کارکر صرف اپنا نظم کا زہوتا ہے۔  
کانی وقت بیت چلا۔ کسی سوزگازی کی آواز ابھری اور ساتھ ہی تیز روشنی غصے کی دیواروں پر پڑی اور مٹی گئی۔ شاہ زمان چونکا۔ تھوڑی دیر اور گزری تو غصے کے اندر تین

سے لگا لی۔  
وہ یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا کہ راج محل کے اندر سے روشنیوں کے بجائے دھوئیں کی سیاہ کھیریں کب اٹھنے دیکھے گا۔ پھر اسے دونوں ہی چیزیں نظر آئیں۔ روشنی بھی اور دھوئیں کی کھیریں بھی۔  
پہلے وہ بھی سمجھا کہ دونوں نشانے خطا گئے، لیکن ایک حد تک اگرچہ ایسا ہو بھی تھا، ایک گولہ تو راج محل کی جنوبی فصیل سے چند فٹ لگ بھگ کے فاصلے پر باہر جنگل میں کہیں گرا تھا جبکہ دوسرا گولہ بے مشکل فصیل تک پہنچ چکا تھا، وہ اندر تو نہیں گرا تھا مگر اسے فصیل کی منڈی پر تباہی ضرور پجادی تھی۔  
جس توپ کا گولہ قدرے نشانے پر لگا تھا، اسی توپچی کو بلسٹر وڈ نے فوری طور پر ایک ڈگری بڑھا کر دوسرا گولہ داغنے کا حکم دے ڈالا۔  
گولہ داغ گیا۔ کرنل نے دوبارہ اپنی آنکھ سے دور تین لگا لی۔ گولہ دھوئیں کی کھیر چھوڑتا ہوا فصیل پار کر گیا اور ایک دھماکے سے اندر نہیں گرا تھا۔  
”گریٹ.....“ کرنل بلسٹر وڈ نے ایک ہاتھ کا دمکا بلند کر کے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔  
☆ ☆ ☆  
اریہ کی حالت بدستور غریبی تھی۔ اس کا پورا جسم اپنے سے شرابور ہو چکا تھا۔ کانچے جانے والی جگہ پر ہی اسے اب اس کا پورا وجود درد اور تپ سے چھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ چھوڑے کی طرح اب بھی تپا پڑا کر رہا ہے اور اریہ تپ رہی تھی۔ نیم بے ہوش کی حالت میں بھی وہ درد و تکلیف سے کرا رہی تھی۔  
شاہ زمان اس سنگ دل انگریز کمانڈر کی جھپٹ کر تارہ گیا تھا، اسی دوران جو بغیر ہڈ والی جیپ ان کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے اندر سے چار پانچ.....  
فونی کدکڑے مار کر نیچے اترے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ایک نے فوراً اس دروازہ قامت گورے کے آگے آ کر سیٹھٹ کیا اور پھر دونوں میں کسی بات پر مختصر تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد نیم بے ہوش اور نڈھال اریہ کو وہ دو فونی سنبھالے ہوئے جیپ میں سوار ہوئے اور وہ دروازہ قامت کمانڈر بھی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھ گیا۔  
”سنگ..... کہاں لے جا رہے ہو اسے..... رکو.....“  
شاہ زمان چلا یا۔ اسی وقت ایک فونی نے شاہ زمان کے چہرے پر سنگین دائرہ لٹک کر اندر سیر کر دیا۔ شاہ زمان کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ خارج ہوئی اور وہ الٹ کر

کرنل بلسٹر وڈ کی کوبہاں سے دو درو پہاڑی چڑھیں گے درمیان سے راج محل کی جنوبی فصیل کی ایک دیوار صاف نظر آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس فصیل کی بیرونی سمت پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر بکھرے ہوئے ہر دروارے کی باقی ماندہ بکھرے ہوئے جنگل سے خوف بھی آتا تھا کہ وہاں راجا پر تاب کمان کی فوج نہ گھات لگائے بیٹھی ہو۔  
”مسٹر بلسٹر وڈ! امیر اخیال ہے کہ سب سے پہلے ایک ساتھ دو گولے ان سرسبز ڈھلوانوں پر داغے جائیں۔“ اس کے نائب کپتانی اچھوڑنے بلسٹر وڈ کا تذبذب بھانپتے ہوئے مشورہ دیا۔  
”اگر راجا کی فوج یہاں گھات لگائے بیٹھی ہوگی تو افراتفری کا شکار ہو کر ظاہر ہو جائے گی۔ پھر ہم مزید پیش قدمی کرتے ہوئے قلعے (راج محل) پر بے آسانی ہلا بول سکتے ہیں۔“  
کرنل بلسٹر وڈ نے غور کرنے والے انداز میں اپنے نائب کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔  
”لیکن..... اگر راجا کی فوج یہاں بھیجی ہوئی نہ لی تو ہمارے دو فونی گولے نہ صرف ضائع چلے جائیں گے بلکہ ممکن ہے فصیل کی جانب سے ہم پر حملہ بھی کر دیا جائے۔ یوں دوبارہ ہم راج محل پر گولے داغنے کی پوزیشن کھو دیں گے۔“  
کپتانی رچرڈ خاموش ہو گیا۔ کرنل کو اپنا جواب مل گیا تھا۔ یوں بھی اس کے تیزی سے سوچنے ذہن میں اپنے چیف کمانڈر کی ہدایات گونج رہی تھیں.....  
”کرنل بلسٹر وڈ! اس جنگ میں سب سے زیادہ اہمیت تمہاری رجمنٹ کی ہے، جو نہ صرف جنگ کا پانسا پلٹ سکتی ہے بلکہ اسے نتیجہ خیز بھی بنا سکتی ہے۔ تمہارا راستہ دشوار مگر ضرور ہے مگر اس کی منزل ہمیں کامیابی سے ہمسفار کر سکتی ہے۔“  
لہذا کرنل بلسٹر وڈ نے اسی وقت اپنی فوج کو خبردار کیا اور تو بچوں کو حکم دیا کہ دونوں توپیں ایک مقام پر ایڈوائس کر کے کھڑی کر دی جائیں اور بیک وقت دو گولے داغے جائیں۔  
اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ جب توپیں آگ اٹھنے کے لیے بالکل تیار تھیں تو اس کے حکم کا اظہار کیا جانے لگا۔ بلسٹر وڈ نے ”فائر“ کہا۔ ٹھیک اسی وقت تلے اوپر دو دھماکے ہوئے۔ آٹھ اور دس پونڈ کے دو گولے شعلے اڑاتے ہوئے عمودی سفر پر روانہ ہوئے۔ ٹھیک نشانہ دیکھنے کے لیے بلسٹر وڈ نے وہی یک عدد سے دلی دور تین اپنی ایک آنکھ



آخر ادا ہو گا۔ ایک نو دہائی دار کثافت کا منظر تھا، دوسرا چپ سوار تھا، جو اسے یہاں لایا تھا، جبکہ تیسرا ان کا کوئی سامنی تھا۔

گور کا منڈر چند ٹائے تک بڑی خشکی نظر دے اس کی طرف گھورتا رہا پھر دھنسی سے بولا۔  
”کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟“

”راج۔۔۔“ شاہ زمان نے وہی نام بتایا جو اس کے اور اریہ کے بچے نے شہد تھا، تاکہ ان دونوں سے الگ الگ پوچھا جا سکے کہ ان کا جواب ایک ہی ہو۔

”پورا نام بتاؤ۔۔۔؟“ تنہا اندر دھنسی سے پوچھا گیا۔  
”راج کمار۔۔۔“  
”کام کیا کرتے ہو؟“

”مائی گیری کرتے ہیں، مچھلیاں پکارتے ہیں صاحب!“ شاہ زمان نے اپنا لہجہ معتدل مگر خوش اخیار کھتے ہوئے جواب دیا۔ کیونکہ اب انداز بدلنا اس خرافات گور سے فوجی کو کسی تکلیف میں مبتلا کر سکتا تھا۔

”تمہاری سامی۔۔۔ کا نام۔۔۔؟“

”وہ میری جتنی ہے جناب! کینا نام ہے اس کا۔“ شاہ زمان نے فوراً جواب دیا۔ اس کے دل و دماغ میں اریہ سے متعلق کچھ بچپن بچی ہوئی تھی کہ اس گور سے نے اسی مقصد کے لیے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا تاکہ ان سے پوچھنے والے سوالات کی مماثلت کو جانچ سکے۔ کیونکہ یہ بات ممکن تھی کہ اس نے اریہ کو ہوش میں لا کر ایسے چند سوالات اس سے بھی پوچھے ہوں۔

”یہاں اس جزیرے میں کیا کرنے آئے تھے تم دونوں؟“ قد آور گور سے نے پوچھا۔

”بتایا تھا آپ کو کہ ہماری مشقی ٹوٹ گئی تھی۔“ شاہ زمان نے بھی مصطفیٰ مختصر جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاہم پھر فوراً ہی منت بھرے لہجے میں بولا۔

”صاحب! میری جتنی کہاں ہے؟ وہ کیسی ہے؟“  
”مم۔۔۔ مجھے اس کی چٹا کھائے جاری ہے۔ میرا دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں، اس کے بغیر میرا جیون ویران ہو جائے گا صاحب!“

”بکواس بند کرو اپنی۔۔۔“ گور سے کانڈر نے دھنسی سے اسے ڈنکا۔ ”وہ ٹھیک ہے اور اس کا علاج کر دیا گیا ہے۔“ شاہ زمان نے یہ سننا تو اس کے اندر مسرت کی لہر چلی۔ وہ دن بہت ہونے کے باوجود اپنے جسم کو احسان مند انداز میں تھوڑا اٹھ دیتے ہوئے بولا۔

”بڑی مہربانی آپ کی، بڑے دیا لو ہیں آپ سرکار۔۔۔ میں اور کیا کہوں؟“

شاہ زمان کے جوابات اور اس کے انداز کو دیکھ کر گور سے کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن کے اثرات ابھرنے لگے تھے جسے شاہ زمان کی بھانپتی ہوئی عقابلی نظروں نے فوراً نڈا لیا تھا۔

”تم مائی گیری کرتے ہو یا جاسوسی؟“ گور سے نے اس بار طنزیہ پوچھا۔

”مم۔۔۔ صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہو آپ؟“  
”مم۔۔۔ میں اور کچھ تو ایک غریب جدی پشتی مائی گیری ہیں، منشی بھی کرائے کی تھی۔ پہلے ہی ہم پر اتنا قرضہ چڑھ گیا اب پشتی بھی۔۔۔“  
”رہتے کہاں ہو؟“

”ہوڑہندی کے کنارے، پھیروں کی پوراوائی (بستی) میں۔“  
”تم اگر جاسوس نہیں ہو تو پھر ہمارے سپاہیوں پر حملہ کیوں کیا تھا؟“ اس بار چپ میں لانے والے نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا۔

”معاف کر دیں سرکار!“ شاہ زمان نے اسی انداز میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”بات اپنی عورت کی ہو تو کون نہیں پھر جاتا، لیکن پھر مجھے آپ لوگوں نے مارا پینا بھی تو ہے۔ پورا شریہ دکھ رہا ہے میرا درد۔۔۔“ وہ آخر میں دانستہ گرا۔

”ہوں۔۔۔!“ فرنگی گور سے نے ایک ہلکاری بھری اور بولا۔

”ہم ہوڑہندی سے تم دونوں کے بارے میں پتا کریں گے۔ اگر تمہاری بات جھوٹی ثابت ہوئی تو تم اور تمہاری جتنی ہمیشہ کے لیے قیدی بنا دیے جاؤ گے، ورنہ رہا ہو جاؤ گے۔“

”سرکار! میں اور میری جتنی بے قصور ہیں۔“ شاہ زمان بولا۔ ”میری جتنی بہت نازک دل کی ہے، وہ میرے بغیر مرنے لگی۔ آپ پوری تسلی کریں مگر اسے یہاں میرے پاس۔۔۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔۔۔“ کانڈر نے اس کی بات کاٹ کر اسے جھڑکا اور اپنے ساتھ کھڑے ماتحت سے بولا۔  
”اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ میں کل صبح کیٹھن صاحب سے بات کرتا ہوں، پھر ان دونوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔“ ماتحت نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

وہ تینوں خیمے سے نکل گئے۔ شاہ زمان سوچتا رہ گیا۔ وقت گزرنے لگا۔ شاہ زمان کو اریہ سے متعلق یہ سن کر کچھ تسلی تو ہوئی تھی کہ وہ خیریت سے تھی اور اسے ہوش بھی آچکا تھا مگر فکر و تشویش اپنی جگہ موجود تھی کہ وہ ہنوز اس کی نظروں سے دور تھی اور وہ بھی یقیناً اس کے لیے اتنی ہی پریشان ہو رہی ہوگی۔

شاہ زمان کو انگریز کانڈر سے باتیں کرتے ہوئے اتنا اندازہ تو ہو چلا تھا کہ وہ اس سے قدرے مطمئن ہوا ہے مگر پوری طرح نہیں، اگر اس نے ہوڑہندی کے کنارے آباد مائی گیریوں کی بستی سے ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو ان کی اصلیت آشکار ہو جائے گی، پھر ان دونوں کو یہ قول اس گور سے کانڈر کے، کیٹھن جیس کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ ان کا فیصلہ کرے گا۔ لہذا شاہ زمان اسے تھوڑی سی مہلت سمجھے ہوئے تھا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

فوجیوں کی مارنے اس کا بدن دکھا دیا تھا۔ اس نے تو تاروادی کا مظاہرہ کیا اور حوصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنے جکڑ بندوں۔۔۔ پر یکدم زور آزمائی شروع کر دی۔

وہ ایک گور بنا تھا اور اسے ہر قسم کی فریبنگ دی تھی، اس نے ایک خاص ٹینک سے اپنے ہاتھوں اور اٹھوں کو حرکت دینا شروع کر دی تھی۔ اس طرح جکڑ بند اپنے نرم اور پھڑپھڑانے پرانے کے بعد انہیں تھوڑی مزید کوشش سے کھولا جاسکتا تھا اور وہ یہی کر رہا تھا۔

اسی ”کوشش“ میں اسے سچ ہو گئی۔ اسے خیمے کی دیواروں پر روشنی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسی وقت ایک سایہ ابھرا۔ شاہ زمان اپنی ”کوشش“ میں تھک کر چور ہونے لگا تھا، یوں اس نے کسی کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کوشش ترک کر دی۔

اسی وقت پردہ ہٹا اور ایک گور سپاہی اندر داخل ہوا۔ وہ اس کے لیے کچھ کھانے پینے کو لایا تھا۔ اس نے قریب آ کر کھانا اس کے سامنے رکھ دیا، جو ایک بوسیدہ سی ٹرے میں تھا اور اس میں ایلے ہوئے چاول اور اس پر نہ جانے کیا ڈال رکھا تھا۔ پانی کا ایک گلاس بھی تھا۔

”سرکار! کیا آپ بتا سکتے ہو میری جتنی کلنا اب کس حال میں ہے؟“ شاہ زمان نے اپنی آواز میں لاجبت ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کے سینے میں الجھن ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھول چکا تھا۔ اب اس ایک آخری گرہ باقی رہ گئی تھی جس کے لیے وہ

غیر محسوس انداز میں اپنی ”کوشش“ کی دوبارہ ابتدا کر چکا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اندر آنے والا یہ گور سپاہی کیا تھا اور اس کے کندھے سے سنگین دار کٹھن بھی جھول رہی تھی۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر ”مچھائے“ کے چکر میں تھا۔  
اس کی بات سن کر وہ گور سپاہی کیٹھن سے مسکراتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا۔

”نمارا اوائف بہوت شاعر اور کھول بھورت ہے، ہمارے افسر کانڈر نے رینالڈ کا کھوب دل بہلائے گا وہ اور ہو سکتا ہے تم کو رہا بھی مل جائے۔“

اس گور سے سپاہی کی اس یادہ گوئی نے شاہ زمان کا دماغ التلاذ یا لہذا یہ سنتے ہی غیظ و غضب کا ایک طوفانی بگولا سا شاہ زمان کے سینے میں اٹھا۔۔۔ تب تک وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے بیٹھنے سے مشابہ فراہم سی اپنے حلق سے خارج کرتا ہوا وہ اس پر کسی پھینکے کی طرح چھینا تھا کہ گور سے سپاہی کو ایک ذرا پیٹنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

شاہ زمان کی اگرچہ ابھی تک دونوں ٹانگیں بندھی ہوئی تھیں لیکن، وہ انہی کے بل پر مخصوص انداز میں اچھل کر اس پر پڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے خیمے میں اس فرنگی سپاہی کی گردن آگئی اور پھر شاہ زمان جوش جنوں خیزی میں اسے دبا تا ہی چلا گیا۔

اس کے آہنی خیمے میں گور سے سپاہی کی گردن چند لمحے پھنسی رہی اور وہ فرخ ہونے والے جانوری طرح اپنے حلق سے خرخرات کی کھنکی کھنکی آوازیں نکالتا رہا، اس کے بعد ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

شاہ زمان نے اپنے اندر کا سارا غیظ اسے بل کے بل موت کی وادی میں ڈھیل کر نکالا تھا اور پھر اس خبیث کے جہنم داخل ہوتے ہی اس نے اس کی گن پر قبضہ جھالیا، اس کی مزید تلاش لینے پر پندلی سے بندھی ہوئی قروٹی بھی نیاں سمیت نکال لی، لیکن اس سے پہلے اس نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے دونوں پیروں کے جکڑ بند بھی کھول دیے تھے، اس سے پہلے کہ کوئی اندر آتا۔ شاہ زمان دبے پاؤں خیمے کے جھولتے ہوئے پردے کی جانب بڑھا۔ ذرا پردہ کھسکا کر اس نے باہر جھانکا۔

صبح کی روشنی چار سو پھلنے لگی تھی اور اسے پکے کی طرف صرف دو فرنگی سپاہی کھڑے نظر آئے۔ وہ کسی برتن سے پانی نکال کر منہ دھوئے اور کپیاں کرنے میں مصروف تھے۔

شاہ زمان نہایت احتیاط اور چابک دستی کے ساتھ



سوال کیا۔

جو نیر افسر لے سکتا تھا۔ وہ بھی ایسا جو نیر افسر جس کی شادی بھی نئی تھی ہوئی ہو اور مزید برآں بیوی بھی ساتھ ہو۔  
شاہ زمان نے یہ ساری باتیں غور سے سننے کے بعد اپنے ذہن میں رکھی تھیں۔

شاہ زمان یہ ساری باتیں سوچتا اور غور کرتا ہوا دوبارہ پکے میں داخل ہوا۔ پکے میں اس نے کچھ دقتی ہم، مراقلیں اور تھوڑی بہت تعداد میں بارود پڑا دیکھا۔ اس نے دوتین دقتی بموں کی باتیں سمجھ کر ان پر چیک دے دیے اور خود تیزی سے دوڑتا ہوا پکے سے دور چلا گیا۔

اس کے عقب میں سماعت ٹھن دھماکا ہوا اور سارا پکنا ہی شعلوں کی زد میں آ گیا۔ شاہ زمان یہاں افراتفری پھیلا دینا چاہتا تھا۔ اس نے اب اپنی شرٹ اتار چنگی تھی۔ تو اتنا جسم اب برہنہ تھا، فقط نیچے چست جھلون تھی اور اس کے پیٹ میں لگے ہوئے تین عدد دقتی بم، فاضل گولیوں کی بٹنی اور رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ تیزی سے مطلوبہ سمت کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ ایک جذبہ دل تھا، ایک جوش تھا جس نے شوکی کو دراندازہ واریہ قدم اٹھانے کے لیے اکسایا تھا۔ اسی سبب اس نے گارٹیا اور دابرٹ کے مشوروں کو بھی لائق اہتمام نہیں جانا تھا۔ شوکی حالات کی نزاکت کا ادراک کر چکا تھا، جانتا تھا کہ مشورے اور مدد لینے میں بہت دیر ہو جائے گی۔

ریناکسی ذکیت یا دابرن کے ہتھے نہیں چڑھی تھی، اسے کالی کے مندر کے خطرناک اور وحشی، شیطان بچاری بدری ناتھ کے چیلے اٹھا کر لے گئے تھے اور جن کے ناپاک مقاصد بہت بھیاںک ہو سکتے تھے۔

گارٹیا اور دابرٹ راج محل سے مدد لینا چاہتے تھے جبکہ شوکی انہیں پہلے بھی آزمایا تھا۔ اس کے خیال میں وہ ان شیطان بچاریوں کے کا لے کر توتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ لہذا ان شیطان بچاریوں کے مقابلے میں خود ہی میدان میں آنا زیادہ بہتر ہو سکتا تھا، اسی لیے شوکی نے سیدھا ہی طرف کارخ کیا تھا اور تنہا بھی تھا۔ وہ نہتا نہیں تھا۔

وقت اور حالات، پھر دابرٹ کی کج ادائیگیوں اور خامصوں نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس کے پاس ذرا تیرا احمد خان کا ہسپتال تھا۔ اگرچہ وہ احمد خان کا بھی نہ تھا، اس نے بھی ابتدا میں ساتھ آنے والے جنرل مانگیل شاہ کے ایک فرنگی سپاہی کی لاش سے حاصل کیا تھا جس کا اسی ہم میں

”بھارتی“ ہاک کے بارے میں.....؟ وہ کب اس جزیرے سے روانہ ہونے والا تھا یا پھر کب تک اس کے بارے میں پوچھتا۔ ممکن تھا وہ سپاہی اسے یہاں اس جزیرے میں دیکھو بیویوں کی نظری کے حوالے سے بھی کچھ بتا سکتا تھا۔

اسے بہر حال اپنے عظیم مشن کو اپنے محبوب و اپنی بہت سے مقدم رکھنا چاہیے تھا۔ بلکہ اس کا تو خورار یہ ہے کہ اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ کبھی اگر ایک طرف اس کے دشمن کی کامیابی اور دوسری جانب اس پر یہ کہ زندگی ہو تو اسے پہلے دونوں دھڑاپے مشن کو ترجیح دینا تھی، مگر کیا وہ اسے یہ بھی وعدہ خلائی کا سرکب ہوا تھا؟ وہ جیسے پانوں میں بھول کر رہ گیا۔ ایک دہرائے پر آن کھڑا ہوا، یوں جیسے وہ بھول کر رہ گیا۔

پھر جلد ہی اس کے اندر ایک عداوت غیب ابھری۔  
”ہرگز غلط نہیں کیا تم نے شاہ زمان! اگر یہ تمہاری ہمت ہی نہیں تمہارے مشن میں ایک بہادر اور دلیر سپاہی بھی ہے۔ اس کی حیثیت اب مجھ پر ہی نہیں، ایک مددگار مجاہدہ کی بھی اختیار کر چکی ہے۔ ایسا اس نے ثابت بھی کیا ہے کہ وہ ایک ایک مجاہدہ ہے اور پھر تمہاری محبوبہ۔ لہذا اس کی جان بچانا میرا فرض ہے۔“

وائس جیم سپاہی کے ذریعے اسے یہ کو اٹھانے والے امر کا نام رینالڈ پتا لگا تھا۔ دوسرا سارجنٹ گرگ تھا۔ آخری فوجی نے ان دونوں کے بارے میں اسے یہ بھی بتایا تھا کہ کمانڈر رینالڈ درحقیقت کرنل اینڈرسن کا ہی نائب ہے اور اسے ہی اپنا نمبر سمجھتا ہے۔ جبکہ اب اس کی جگہ نئے آنے والے افسر کمیشن جیس کو اپنا افسر ہی نہیں مانتا، تاہم وہ اس کے احکامات ماننے کا بہر حال پابند تھا، لیکن سارجنٹ گرگ کمیشن جیس کا آدمی تھا۔

کمانڈر رینالڈ اپنے افسر کرنل اینڈرسن کی طرح ایک ظالم اور بے حد سفاک انسان تھا۔ اسے کو وہی اپنے لکھانے پر لے گیا تھا۔ نیز وہ یہاں کے کئی اہم منصوبوں کے بارے میں پوری جان کاری رکھتا تھا جو کمیشن جیس کے بھی علم میں نہ تھی، وہ صرف کرنل اینڈرسن کو ہی علم تھا۔

کمانڈر رینالڈ، یہ قول مذکورہ فوجی کے، وہ منصوبے کمیشن جیس کے بھی علم میں لانا ضروری سمجھتا تھا، وہ بس کمیشن جیس کو ایک مجبور کی بنا پر برداشت کیے ہوئے تھا، اس کا نہیں خیال تھا کہ کرنل اینڈرسن کی جگہ یہ نیا اور

اس طرح کہ ایک تو زمان نے اسے اس کی رائفل سے محروم کر دیا، دوسرے اسے آسانی سے دیوے اور بے بس کیے ہوئے پکے کے اندر گھسٹ لایا۔  
”تیرے سر پر اس وقت خون سوا ہے۔ ہے فرنگی کتے.....!“ شاہ زمان نے شیرجی خرابت سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

”مجھے میری ساتھی کا پتا بتا..... ورنہ کتے کی موت ماروں گا، ہڑ پتا پا کر..... بول تیرے اس سفید سورا کمانڈر رینالڈ نے میری ساتھی کو کہاں پر غافل بنا کر رکھا ہے؟“  
فرنگی سپاہی پر شاہ زمان کے لیے اور اس کے غلط و غضب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یوں وہ کچھ فطرتاً شاہ تھوڑا لاجمی ثابت ہوا۔ ٹھیکائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”وہ..... وہ اسے کیسے فور میں لے گیا ہے۔“  
”کیسے فور کس طرف ہے؟“ شاہ زمان اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کے آہنی گھمے کو گھم کرتے ہوئے پھر غرایا تو فرنگی سپاہی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز خارج ہونے لگی۔ شاہ زمان کو فوراً اس کو ہوا کہ وہ جوش جوش خیزی میں اس کا زخرا ہی دیوچ ڈالنے والا تھا۔ اس نے ذرا گرفت ڈھیلی کی مگر چھوڑ نہیں۔

”بھوت بولنے سے پہلے ہی اور کھانا کھا میں تجھے بھی تصدیق کی خاطر اس مقام تک گھسٹا ہوا لے جاؤں گا اور پھر دیکھنا اپنا حشر بھوت بولنے کا۔“

یہ تہدید بھی کارگر ثابت ہوئی، وہ فر فر بتانے لگا۔ یہ سب ابھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد شاہ زمان نے اس کی گردن کو جھکا دے ڈالا۔ ”حق“ سے مشابہ آواز اس انگریز سپاہی کے منہ سے برآمد ہوئی اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

یہ تھوڑا فرنگی سپاہی بھی ان میں شامل تھا جنہوں نے اسے کو بے دردی سے گھسیٹا تھا۔ اسی لیے شاہ زمان نے اسے زندہ نہیں چھوڑا تھا، یوں بھی اس کے دل میں ہر فرنگی کے لیے ایسی ہی نفرت جاگزیں رہی تھی۔ یہ خاور حیات اور اس کے جڑی ساتھیوں کے قاتل بھی تھے۔

ایک ایسی شاہ زمان کو احساس ہوا کہ وہ اسے یہی کجبت میں اپنے عظیم کا ذکر کو فراموش کر رہا ہے..... اسے شاید اس فرنگی کو اپنی جلدی بالک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مشن سے متعلق کچھ اور بھی اس سے اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ یہ سوچ کر شاہ زمان کے اندر کک سی جاگی۔

”شلا..... اسے کیا پوچھنا چاہیے تھا؟“ اس نے خود

باہر نکلا اور خیمے کی ”چادری“ دیوار سے لگے، ان دونوں پر نگاہ رکھے، وہ خیمے کے عقب میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ ان دونوں پر ایک تو حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ گیا دوسرے اسے پکے کے اندر کا بھی نگاہ صاف نظر آ گیا۔

وہ پہلے بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے اندر کتنے فرنگی ہو سکتے تھے۔ اندر اسے ایک کو نلے والے کھلے گوشے میں صرف ایک ہی آدمی دکھائی دیا جو چوہے..... کے سامنے بیٹھا چائے یا کافی کی کپتلی آگ پر چڑھائے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ جبب بھی نہیں تھی، صاف ظاہر تھا کہ ان کا کمانڈر اپنے نائب کے ساتھ نہیں گیا ہوا تھا۔

گو یا سوچ غنیمت ہی نہیں اچھا بھی تھا۔ تب ہی شاہ زمان نے ایک لمبے بھی ضائع کے لیے ان دونوں پر بلا بول دیا۔ ایک کی پشت میں رائفل کی گتھیں گھونپ دی جبکہ دوسرے کی پشت پر اس زور سے لات رسید کی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی تک فل گئی، کیونکہ وہ پکے کی گارے مٹی والی دیوار سے ٹکرا کر گر اتوا اسے اٹھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی، حالانکہ وہ اپنی طرف سے بڑی پھرتی اور ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر شاہ زمان کو اس پر آخری اور کاری وار کرنے کے لیے اتنی مہلت ہی بہت تھی۔

پہلے والے کی پشت سے رائفل کی گتھیں نکال کر اس نے وہ گزے ہوئے دوسرے فرنگی کے پیٹ میں بھونک دی۔ وہ بھی اپنے پہلے والے ساتھی کی طرح ہل کے پل ڈھیر ہو گیا۔

اس کھڑ بڑے ان کے تیرے ساتھی کا چونک جانا لازمی امر تھا جس کا شاہ زمان پہلے ہی سے ادراک کیے ہوئے تھا۔ اس نے پکے کے اندر داخل ہونے کی بے وقوفانہ جلد بازی سے کام لینے کے بجائے اس کے باہر آنے کا انتظار کیا اور منڈیر کی مختصر آڑ سے اندر اس کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے جھانکا بھی۔

حسب توقع تیسرا ساتھی چونکا انداز میں اپنی رائفل سنبھالے اسی طرف آ رہا تھا۔

شاہ زمان جانتا تھا جب تک وہ باہر آ کر معاملے کی سن ممکن نہیں لے لیتا، مدد کے لیے ہوائی فائر نہیں کر سکتا تھا اور وہی ہوا وہ جیسے ہی باہر آیا، تب شاہ زمان چونکا جیتے کی طرح منڈیر پر چڑھا اور چپکے چپکے اس کی جانب گھسٹا ہوا اس کے سر پر پڑی گیا۔ اس کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس تب ہوا جب شاہ زمان نے شکاری جیتے کی طرح اس پر چھننا مارا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دیوے زمین پر آ رہا مگر



## دھوکے بازوں کے آئینے میں روپ بدلنے مکاروں کا دلچسپ قصہ

ایک سے بڑھ کر ایک اس دنیا میں شاہکار ہے... وہ جو خود ایک شاہکار تھی تصویروں کے روپ میں ایک اور شاہکار کا سودا کرنے نکلی مگر اسے کیا خبر تھی کہ بازار میں اسے شکاری ملیں گے... لیکن اس شکاری کو بھی تو کوئی احساس نہ ہو سکا تھا کہ یہ شاہکار خود کتنا بڑا شکاری ہے۔

## نیلے پہلے

زبیر حسین



جانچا اور کچھ نے دکان کے اندر آنے کی جرأت بھی کی لیکن اس کے باوجود اس پورے ہفتے اس کے سیل ریکارڈ پر صرف ایک تصویر درج تھی۔ یہ بہت پریشان کن صورت حال تھی۔ یہی ایک یوٹی وی صورت اندر چلی آئی۔ جانے کیوں اسی وقت وہ سمجھ

و کٹر فلیٹ وڈ... فن مصوری کو اتنا جانتا تھا جتنا ایک استاد کو اپنے کاروبار کے لیے جانتا ضروری تھا۔ اس کی ان کی بکری میں پورا ہفتہ کافی مندا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس کی بکری کے سامنے کے اوپر ڈسپلے میں لگی تصاویر کو گنہور

نظر اس پر پڑ جاتی تو معاملہ اس سے زیادہ بھی خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ شوکی کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کے ہاتھوں ایک سے زیادہ بھاری جہنم داخل ہو سکتے تھے۔

وہ ابھی عقی دروازے سے مندر کے اندر نہایت خاموشی سے داخل ہونے کے لیے پرتوئے ہوئے تھا کہ اچانک اس کے سامنے دو ایسے بایک کی خورد و چھاڑیوں میں سے دو بھاری نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ترشول اور ستان نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑی حشمتیں نظروں سے اسے گھورنے لگے، جبکہ شوکی انہیں دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ دونوں مکار اور بد معاش بھاری اس کی گھات میں بی بیٹھے ہوں گے۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کے عقب سے ایک غصیلی اور نفرت خیز آواز ابھری۔  
”تم نے یہاں آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے ملے۔۔۔۔۔۔“

شوکی اس جانی بچائی آواز کو کن کرتیزی سے پلٹا تو رنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے دو بھاری اور چوکس کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ترشول اور ترولیاں دلی ہوئی تھیں۔

یہ ظاہر شوکی ان چاروں بد معاشوں کے نرنے میں آ گیا تھا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور..... تیزی سے چا تو اپنے دوسرے ہاتھ میں حقن کیا اور شرٹ کے نیچے بلیٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔  
”ہا۔۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔۔ ان کھلونوں سے ہمیں مت ڈراؤ چھو کرے! ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار ہیں۔“ ایک بھاری نے بدست اور پر غرور قبضہ اپنے حلقے سے خارج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

شوکی نے پستول کی نال انہی کی طرف کر دیکھی تھی لیکن اب بھی وہ خاطر خواہ پوزیشن میں نہیں آ سکا تھا کیونکہ اگر ایک وقت یہ چاروں بد معاش بھاری اس پر حملہ کر دیتے، جیسا کہ آج ابھی کچھ یہی نظر آ رہے تھے، تو شوکی کے لیے مشکل ہو جاتی۔

”میں رہنا کو لینے آیا ہوں..... شرافت سے اسے میرے حوالے کر دو۔“

شوکی نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں لٹکا رہا تو وہی ہوا۔ چاروں بھاری جارحانہ انداز میں یک یک حرکت میں آئے۔

اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا فضا میں ابھرا تھا۔ (جاری ہے)

صرف چار گولیاں تھیں۔ ایک شکاری چا تو بھی تھا۔ شوکی نے دل میں پورا تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس کے سامنے بڑا بھاری بدی تاحہ بھی آ گیا تو وہ اسے بھی گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ شوکی کو آج تک پروفیسر ہنری برنارڈ جیسے شفیق انسان کی ان زہریلے شیطان بھاریوں کے ہاتھوں ہلاکت کا بہت دکھ تھا۔

شوکی ”خیرا“ دیکھنا چاہتا تھا، وہ اسی نشانوں پر جیسے گئے جنگل کے درمیان سے آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس کا جوش اور جذبہ نزو تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کا یقین کی حد تک شہر درست تھا نیزوں کے وہ مشتبہ نشانات کالی کے مندر کی طرف ہی جا رہے تھے۔

شوکی راستے پھر اپنے گرد و پیش سے غلط بھی تھا۔ کیا خبر ان کا کوئی سچی گھات لگائے بیٹھا ہو۔ دوسرے اسے ان سانپوں کا بھی ڈر تھا لیکن آج شوکی بری طرح بھرا ہوا تھا۔ اسے زہریلے سانپوں کی بھی پروا نہیں تھی، جو ہما بھاری کے اشاروں پر تپتے تھے۔  
وہ جلد ہی کالی کے مندر کے قریب پہنچ گیا۔ مٹھوک قدموں کے نشانات اسے مندر کے اندر ہی جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔

اس نے وہاں رک کر مندر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں اسے غیر معمولی سناٹا ہی محسوس ہوا۔ اس کا دل بننے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ کے نیچے اور پتلون کی بلیٹ میں پستول اڑس لیا اور اب اس کے ایک ہاتھ میں شکاری چا تو نظر آ رہا تھا۔

وہ اب دبے پاؤں مندر کے داخلی دروازے کے بجائے اس کی عقی سمت کی جانب نہایت احتیاط کے ساتھ سرکے لگا۔ تب ہی اسے مندر کے داخلی دروازے سے دو بھاری گیر وے رنگ کے لبادوں میں باہر آتے نظر آئے مگر وہ پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

مندر کی پچھلی عمارت خاصی سالنودہ نظر آتی تھی، جیسے برسوں سے کسی نے یہاں کی تعمیر کی مرمت ہی کروانا چھوڑ رکھی ہو۔

اس نے یہاں بھی گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ راستہ صاف پاکر وہ مندر کے عقی دروازے کو کسی طرح کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، ایک خدشہ اس کے دل و دماغ میں یہ بھی ابھرا تھا کہ..... اگر کسی چیلے کی



کر کیا کہ آج اس کی قسمت بدلے والی ہے اور اس کا یہ مشکل ہفتہ اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے۔  
 "گڈ آفٹر نوون....." اس نے ایک صفی مسکراہٹ کے ساتھ دھیر کا سلام کیا۔  
 "اوہ..... گڈ آفٹر نوون تو....." بڑھیا نے جواب دیا۔  
 "آپ مسز قلیٹ ڈو ہیں؟"  
 "جی ہاں۔"

"ہم ٹیلی فون پر بات کر چکے ہیں۔"  
 "اوہ..... تو پھر آپ یقیناً مس پلیمن ہیں۔"  
 "جی بالکل..... گیرالڈا کی پلیمن۔"  
 "آپ کیسی ہیں؟" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن بڑھیا کے دستوں میں کچھ انگلیاں ہی اس کی پھٹکی سے ٹکرائیں۔  
 "آپ نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا۔"  
 "واقعہ طور پر مسز وکٹر..... بہت لمبی واک تھی ریلے اسٹیشن سے یہاں تک۔"  
 "مجھے لگا آپ ٹیکسی پر آئیں گی۔"  
 "ٹیکسی آج کل بہت مشکل ملتی ہے مسز وکٹر۔"

بڑھیا کے اس فقرے نے اس کے ہاشور ہونے کی تصریح کی۔ مس پلیمن بہت قریب کپڑوں میں نہیں لیکن بار بار پہننے کی وجہ سے ان کپڑوں کی خواست پر فرق آ گیا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بال ایک ہیٹ کے نیچے بندھے اور کچھ باہر کھل کر شرمش کے پروں کی طرح مڑے ہوئے تھے۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی لیکن اس کا اپنے آپ پر قابو پانے کا اعزاز بہت نرالا تھا۔ وکٹر نے اس سے اٹھنے والی خوشبو کو سستی لیکن بہت عمدہ گردانا۔  
 "آپ وہ تصویر لے کر آئی ہیں؟" وکٹر نے اسے جانچتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مگر برائے گے تو میں بیٹھ جاؤں؟ اس کو اٹھا کر لانا ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔"  
 "جی ہاں بالکل....." اس نے کرسی بھیج کر آگے بڑھائی۔ "آپ اپنا پورا وقت لیں۔"

"شکر۔"  
 "میں انتظار کرتا ہوں جب تک آپ اپنی سانسیں بحال کر لیں۔"  
 "مجھے معلوم نہیں تھا کہ بیانی بھاری ہوگی۔"  
 "نہں کا اپنا ایک وزن ہوتا ہے۔" اس نے ہلکے سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

وکٹر ایک لمبا اور ذرا سا دبلا ساٹھ کی دہائی کا دیکھنے والا

فحص تھا اس نے اچھی پرورش حاصل کی تھی۔ عمدہ کپڑوں شوقین تھا۔ وہ اپنی ڈاڑھی کو کھلاتے ہوئے بڑھیا کو جانچنے والی نظروں سے گزرتا رہتا تھا۔ مس پلیمن بالکل بھی آرٹ گیلری سے مانوس نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ تصویروں کو آنکھیں بڑی بڑی کر کے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے بچے کھلی بار چڑیا گھر پر نظر کرنا دیکھتے ہیں۔

"آپ کے پاس تو بہت ساری تصویریں ہیں۔"  
 "مجھے زیادہ سے زیادہ سامان رکھنے کا شوق ہے۔"  
 "زیادہ تر قدرتی مناظر سے آراستہ ہیں۔"  
 "میری خاصیت ہے۔"  
 "لیکن ان تصویروں پر قیمت کیوں نہیں درج کی گئی؟"  
 "نہں پر قیمت لگانا ایک بھدا کام ہے مس پلیمن....." اس نے کہا۔ "ایک عبادت گاہ ہے ہر مارکیٹ نہیں۔ میں اصل چیز بیچتا ہوں اور کبھی کبھی اصل چیز کی قیمت مقرر کرتا آسان نہیں ہوتا۔ آپ یہاں پر جتنی بھی تصویریں دیکھ رہی ہیں ان کی ایک حیثیت ہے اور میں اسی بات کی قیمت لیتا ہوں کیونکہ اصل قیمت ایک پینٹنگ کی دہی ہوتی ہے جو اس کو خریدنے والا دیکھ کر تیار ہو۔ یہی پینٹنگ کی ایک الگ دنیا ہے۔"

"کیا واقعی؟"  
 "جی ہاں مس پلیمن..... اب آپ کو کیا معلوم کہ آپ کے بعد جو آئے گا وہ بھی پینٹنگ خرید کرے گا۔ یہ سچ ہے۔" اس کی نظریں بڑھیا کی گود میں چڑی پینٹنگ کی طرف تھیں جو کہ ایک خاک کی گانڈ میں لپٹی گلابی رنگ کے دھاکے سے بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ بڑھیا نے ایک ہاتھ سے اس پینٹنگ کی سلاخ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔  
 "کال کے دوران آپ نے ریک بانی کا نام ظاہر کیا تھا۔" وکٹر نے کہا۔

"جی ہاں مسز وکٹر..... متعجب ریک بانی..... یہ اپنے دور کا ایک مشہور پینٹر تھا..... اسے ایڈورڈ این کاٹیل بھی کہا جاتا تھا۔"  
 "نہیں، یہاں تھوڑی سی غلطی ہے۔" وہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ ان دونوں میں کچھ چیزیں مشترک تھیں لیکن ریک بانی تو ایک جھٹکس انسان تھا۔  
 "ایڈگر بھی یہی کہتا تھا۔"  
 "کون ایڈگر؟"

"ایڈگر..... میرا بھائی۔" بڑھیا نے سمجھایا۔ "اصل میں یہ پینٹنگ اسی کے پاس تھی۔"  
 "تجسس مطلب؟"  
 وہ غم میں سر ہلانے لگی۔ "ایڈگر کچھلے سال مر گیا تھا۔"

یوٹھ اور میرے لیے..... لیونڈا میری بہن ہیں۔ ہم ایک ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ایک وقفے کے بعد وہ بھرے ہوئے۔ "ایڈگر کوئی امیر آدمی نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں وہ کافی کچھ جانتا تھا۔ اس نے ایک مونس پر چالیس سال پہلے ریک بانی کی یہ تصویر لے لی تھی۔ ایڈگر کہتا تھا کہ اب اس کی قیمت دس گنا سے بھی زیادہ ہو گئی۔"

"مگر اس کی قیمت..... مگر یہ اصل ہوئی تو۔"  
 "کوئی شک ہی نہیں اس کے اصلی ہونے میں۔"  
 "اس ایڈگر کے الفاظ ہیں۔"  
 "میں پلیمن اکیلا وہی مصوری میں مہارت رکھتے تھے؟"  
 "نہیں نہیں..... مسز وکٹر وہ تو ایک ٹیکس انسپیکٹر تھا۔"  
 "پینٹنگ ایک آنکھ سے خریدی گئی جیسا کہ آپ نے کہا۔"  
 "ہاں۔" بڑھیا نے جواب دیا پھر اس نے اپنے پرس کھولا۔ "میرے پاس اس کی رسید بھی ہے..... ٹیکس انسپیکٹر اسے کی وہ ہے وہ چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کا عادی تھا۔"  
 "ایسا ہی ہوگا۔"

"مجھے یقین ہے رسید ابھی مل جائے گی۔" بڑھیا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

وکٹر نے اسے دیکھا۔ وہ ایک عرصے تک اس پینٹنگ کو ایک دیکھا جاتا ہوں۔ میں خود ریک بانی کی تصویروں میں اپنی مہارت رکھتا ہوں۔ مجھے زیادہ وقت نہیں لگے گا اس کو دیکھوں۔

"مجھے مل گئی۔" وہ بولی پھر اس نے ایک پھٹی ہوئی کلابی رسید وکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "کرڈ پلین آف دی ڈیٹیل۔ یہ یعنی پینٹنگ کا کاروبار کرتی تھی۔ ان دنوں کافی عام ملتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کرڈ پلین کے بارے میں۔" اس نے کہا۔ "مگر وہاں بڑھیا کو بیٹھے ہوئے تھا۔" میں نے خود دیا۔ "پینٹنگ ان سے خریدی تھیں..... کیا اب میں یہ پینٹنگ لے سکتا ہوں؟"

مس پلیمن تھوڑا سا گھبراہٹ ہوئی کیونکہ اس پینٹنگ کے بارے میں اس کے بڑے بھائی رشتے بھی تھے۔ وہ اسے بیچتا تو چارہری کی گولی کچھ فزود بھی لگ رہی تھی لیکن اسے چیموں کی ضرورت تھی۔ آخر اس نے پینٹنگ وکٹر کے حوالے کر دی۔ وکٹر نے اسے کھل کر دیکھا پھر گلابی ڈوری کھول کر اس کو لائی کلاب سے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد اس نے غور سے اس دیکھ کر بڑے قدرتی مناظر کو دیکھنا شروع کر دیا۔

"یہ ایڈگر کا کھل ہے۔" بڑھیا بولی۔  
 "میں جانتا ہوں کس پلیمن۔"  
 "ہم بھی یہاں گئے تھے بچپن میں..... ایڈگر کو یہ جگہ ہمیشہ سے یاد تھی تھی۔ اسی لیے اس نے اس پینٹنگ کو خریدا۔ اس سے بہت پرانی باتیں دانت ہیں۔"

پینٹنگ بالکل اصلی تھی۔ وکٹر تھوڑی دیر میں ہی جان گیا تھا۔ یہ بالکل ریک بانی کا ہی روشنی اور اندھیرے کا کام تھا۔ موسم کو کس طرح تصویر میں قید کرنا ہے، یہ ریک بانی کا کمال تھا۔ وہ تصویر میں کھویا ہوا تھا جیسا اسے محسوس ہوا کہ مس پلیمن اس کے بالکل ساتھ آن کھڑی ہوئی ہیں۔

وکٹر نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اوہ..... کسی نے بہت چالاکی سے یہ نقل پینٹنگ تیار کی ہے۔"  
 "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہی ہے مس پلیمن۔"  
 "لیکن ایڈگر نے یہ بہت سوچ سمجھ کر خریدی تھی۔"

آپ رسید دیکھ چکے ہیں۔  
 "مجھے کوئی شک نہیں کہ کرڈ پلین والوں نے یہ پینٹنگ اصل کچھ کر ہی بیچی ہوگی۔" وکٹر نے بڑھیا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پینٹنگ بہت سے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتی ہے کیونکہ صرف دو چیزیں ہی ایسی ہیں جس کی وجہ سے یہ نقل ظاہر ہوتی ہے لیکن ابھی میں آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ آپ کا بہت شکر ہے۔" وکٹر نے پینٹنگ دوبارہ پیک کرنا شروع کر دی۔ "لیکن میں اسے بالکل نہیں خرید سکتا۔"

"اوہ ڈیئر..... ایسا مت کہو۔"  
 "مجھے بھی بہت سی امیدیں تھیں مس پلیمن۔"  
 "ایڈگر نے قسم کھائی تھی کہ یہ اصلی ہے۔"  
 "یہ نقلی پینٹنگ کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے؟"  
 "نہیں، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وکٹر بولا۔ "کچھ تا جرایسے بھی ہوتے ہیں جو ان چیزوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ایسے ایک تاجر کے پاس میں آپ کو بیچ سکتا ہوں۔"

مس پلیمن بہت افسردہ تھی۔ وہ کرسی پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات تھے جیسے کسی اپنے نے اسے بہت بڑا دھوکا دیا ہو۔ وکٹر نے اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ سجاتے ہوئے ایک کارڈ بڑھیا کے حوالے کر دیا۔

"اس آدمی کے پاس جائیں..... یہ آپ کے لیے



یقیناً کچھ کرے گا۔

☆☆☆

نام ہولی پرانی چیزوں کو بیچنے اور خریدنے کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے پاس بے شمار قسم کے فرنیچر، پرانے برتن، ٹیلی فون، پیسٹنگز، پرانی کتابیں اور کئی قسم کے آلات موجود تھے۔ ٹیلی فون کی کھٹی بجتی ہی اس نے ریسیور اٹھالیا۔ "نام ہولی بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں آپ کی کیا دکر سکتا ہوں؟" اس نے سگریٹ منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ "نام! میں وکٹر بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ کیا یہ صحیح وقت ہے بات کرنے کا؟"

"میرے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب بولو۔" "گڈ! وکٹر بولا۔" میں تمہاری طرف کچھ بھیج رہا ہوں۔" "سننے میں اچھا لگ رہا ہے۔"

"یہ بہت ہی اچھا ہے میرے دوست۔" "نام نے سگریٹ ایک طرف کیا اور غور سے وکٹر کی بات سننے لگا۔ وہ اور وکٹر کی بار ایک ساتھ کاروبار کر چکے تھے۔ جب بھی وہ اسے کام کرتے تو وہ دونوں کے لیے زیادہ منافع بخش کام نظر آتا۔ نام کا قد چھوٹا لیکن جسمانی اعتبار سے وہ ذرا موٹا تھا۔ وہ غور سے اس کی بات سننے لگا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ پیسٹنگ اصلی ہی ہے۔ اور نام کیا بتا یا تم نے اس معصوم کا؟"

"ریک بائی۔۔۔۔۔ وکٹر نے کہا۔" "میسو ریک بائی۔۔۔۔۔ اور مجھے کوئی شک نہیں اس پیسٹنگ کے اصل ہونے میں۔"

"میں بڑھیا کو کتنے پیسے آفر کروں؟"

"تم دوسو پچاس پاؤنڈ سے شروع کرنا اور چار سو پاؤنڈ سے اوپر نہ جانا۔"

"چار سو پاؤنڈ؟۔۔۔۔۔ یہ زیادہ نہیں ہیں۔" نام نے وضاحت چاہی۔

"اوہ نام۔۔۔۔۔ یہ اس سے دس گنا زیادہ کی پیسٹنگ ہے۔ تم بس یہ پیسٹنگ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ اس بار بہت بڑا منافع ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

"بیچ دو اسے یہاں۔"

"بس کبھی بھی وقت وہ تمہارے پاس پہنچنے والی ہوگی۔ میں نے اسے جگہ میں بٹھا کر اور کریدو کے کمرے میں کال کی ہے۔"

"وکٹر۔ اتنی ہمدردی تو تم نے اپنی وادی سے بھی نہیں کی ہوگی۔" نام نے قہقہہ لگایا۔

"میں تمہیں اتنی بڑی ذیل میں پانز ہزار بارہا ہوں اور تم بجائے شکر یہ کہنے کے طنز کر رہے ہو۔"

"شکر یہ میرے دوست۔"

"یہ ہم تینوں کی جیت ہوگی۔" وکٹر نے کہا۔

"تینوں۔۔۔۔۔ تیسرا کون ہے؟"

"تم، میں اور ریک بائی۔"

اس سے پہلے کہ دونوں کے قبضے ملتے، لائن کٹ گئی۔ اس کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جب اس نے وکٹر کو ایک ٹیلی اس کی دکان کے سامنے آکر رکھی ہے۔ اس نے سگریٹ نیچے پیسٹنگ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ اس نے مس پٹیشن کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ نام نے ایک مددگار سیسکراہٹ کے ساتھ بڑھیا کو خوش آمدید کہا۔

"میں آپ کی کیا دکر سکتا ہوں؟"

"کیا آپ مسٹر نام ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ نام ہولی۔۔۔۔۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

"مجھے وکٹر فلیٹ وڈنے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"وکٹر فلیٹ وڈ؟"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں مسٹر وکٹر۔"

بڑھیا نے کہا۔

"وہ تو لندن کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ ان کا تو ایک نام ہے۔ فی مصوری کی پیمان میں۔ نام نے آگے سے چیزوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔" آپ کے پاس کچھ ہے بیچنے کو؟"

"بہت کچھ کہانی ہے۔"

"بڑھیا نے کہا۔"

"آپ آرام سے بیٹھ جائیں پہلے۔" نام نے کرسی آگے کرتے ہوئے کہا۔

مس پٹیشن نے کرسی پر بیٹھنے ہی مختصر ساری داستان نام ہولی کے گوش گزار کر دی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔۔۔ ایک چیز جس کو آپ ایک عرصے سے اصل سمجھ کر رکھے ہوئے تھے، وہ اچانک ٹھکی ٹھکی لگنے لگی۔ بہت شرمندگی کی بات ہے۔ لیکن میرے لیے نئی بات نہیں۔ میں کئی بار ایسی کہانیاں سن چکا ہوں جب بھی میرے پاس یہاں کوئی کچھ فروخت کرنے آتا ہے۔"

"لیکن میرے بھائی نے یہ آکھن سے خریدی تھی۔ بڑھیا بولی۔" میرے پاس اس کی رسید بھی ہے۔"

"رسید کی ضرورت نہیں مس پٹیشن۔" نام نے کہا۔

"میرے پاس ایڈر کی وصیت کی کاپی بھی موجود ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ پیسٹنگ قانونی طور پر میری ہے۔ میں کئی چیز چھپاتا نہیں چاہتی۔"

"مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔" نام نے فوراً کہا۔ مس پٹیشن نے نام کو پیسٹنگ پکڑاتے ہوئے چہرے پر غمزہ ڈالتا کو چھپانے کی کوشش بھی کی۔

مس پٹیشن اب اپنے ارگرد کچھ رہی تھیں۔ یہ جگہ گھاسی بکری سے بہت خفگ تھی۔ یہاں تو ہر طرف چیزیں گھسری پڑی تھیں۔ نام نے پیسٹنگ کا گلابی ربن کھول کر اسے لاکر کاغذ سے لپیٹ کر لیا اور پیسٹنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے بالکل ہی آہستہ لہجے میں کچھ کہا۔

"ایڈر بکل۔" بڑھیا نے غریب لہجے میں کہا۔

"کیونٹ کی طرف ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔"

"یہ اچھی ہے۔ مجھے ماننا پڑے گا۔" نام نے کہا۔

"بہت اچھی۔" مجھے یہ خریدنا ہوگی۔ یہ اصل نہیں ہے لیکن اصل میں بھی اس کا معیار بہت بلند ہے۔۔۔۔۔ وکٹر جیسا کہ اس شخص ہی اصل اور نقل کا فرق کر سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب کہ تم اسے خریدو گے؟"

"یقیناً۔۔۔۔۔ لیکن قیمت بھی اس کے خریدنے پر منحصر ہوگی۔" نام نے کہا۔ "دیے آپ کے ذہن میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟"

"مجھے بالکل معلوم نہیں۔" بڑھیا نے جواب دیا۔

"ایڈر کہتا تھا کہ اس کی قیمت چار ہندسوں میں ہوگی لیکن اب جب یہ اصل ہی نہیں تو کیا کہا جائے۔" بڑھیا نے افسردگی سے کہا۔

"دوسو پچاس پاؤنڈ کیسے رہیں گے اس کے لیے؟"

مس پٹیشن چونکی۔ "کیا یہی ہے آپ کی ذیل؟"

"جیس جیس سو پاؤنڈ کریں۔"

"میں تو اس سے بہت زیادہ کا سوچ رہی تھی مسٹر نام۔" مس پٹیشن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اور میری اہلیہ سوئڈش ایڈر پینشن پر ہی گزارہ کر لیں گی۔ اصل میں ہمیں کچھ اضافی پیسوں کی ضرورت تھی اسی لیے اسے فروخت کرنا چاہ رہے تھے۔"

"تمیں سو پچاس پاؤنڈ۔"

"اگر میں نے اتنے کی فروخت کی تو یوئسٹرا اعصر ہوگی اور ایڈر تو قبر میں چھین مارے گا۔"

"اور ریک بائی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اس کی نقل پیسٹنگ کا فروخت کر رہا ہے تو وہ کیا کرے گا۔ ہر معصوم کا ایک ہمارا ہوتا ہے۔" نام نے جلدی سے کہا پھر اپنے پرس سے چار

## مزاحیات

ایک خوش شکل خاتون سوشل ورکر وراثی امراض کے اسپتال کے دورے کے دوران ہر شیفٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کانپ گئیں۔

کچھ آگے جا کر غمزہ آواز میں ہر شیفٹ سے کہا۔ "خدا کی پناہ! کیسی خوف ناک صورت تھی، کیا یہ خطرناک ہے؟"

"کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔" ہر شیفٹ نے نالے والے انداز میں کہا۔

"پھر آپ لوگ اسے کوٹھڑی میں بند کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟"

خاتون نے تشویش سے پوچھا۔

ہر شیفٹ نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجبور ہے کہ اس کو کوٹھڑی میں بند نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔"

مرسلہ۔ قدرت اللہ نیازی

سو پاؤنڈ نکال کر کہنے لگا۔

"چار سو پاؤنڈ۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اپنی بھی اور نہیں۔"

"ہم ایک دوسرے کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

بڑھیا نے کہا اور اپنی پیسٹنگ کو بیک کرنا شروع کر دیا۔ "مجھے معاف کیجئے گا مسٹر نام۔" مجھے کسی اور جگہ کوشش کرنی ہوگی۔"

"آپ کو اس سے اچھی پیشکش اور نہیں نہیں ملے گی۔"

"دیکھیں گے۔"

"بہت سے تاجر نقلی تصویروں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔"

"اسے نقلی مت کہو۔۔۔۔۔ بڑھیا چلائی۔" مجھے غصہ آتا ہے۔"

"چار سو پچاس پاؤنڈ۔"

"کیا اس سے اوپر جاؤ گے؟"

میں پہلے ہی چار سو پچاس پاؤنڈ ذرا زیادہ کہہ گیا



آئی اور فٹ پاتھ کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے تین آدمی باہر آئے اور سڑک پار کر کے چرچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کے لباس سے گورڈن نے اندازہ لگا لیا کہ ان میں دو پاروی اور ایک راب تھا۔ وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا، تھوڑا سا اور بھی کر سکتا تھا۔

”تم دیکھو گے۔“ قادر ڈوسکی نے ایبٹ جوزف اور برادر لیو کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”کہ اس گرجا میں اعلیٰ اقسام کی کئی چیزیں اور مجھے ہیں۔“ شپ نے ایک ڈبلر سے کہا ہے کہ وہ فروخت کے لیے ان کی قیمت لگائے۔ ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم گرجا کا قرض

جیسے گورڈن نے اپنی گاڑی پارک کی۔ باہر نکل کر ایک چکر لگایا اور دوبارہ پنجرہ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ چرچ کے مرکزی دروازے کو جانے والی سیڑھوں پر نظر رکھ سکتا تھا اور اگر کوئی چرچ میں داخل ہوتا تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی کار وہاں آتی تب بھی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہتا۔ اسے سڑک خالی ہونے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں سیڑھیاں چڑھ کر چرچ میں داخل ہو سکتا تھا۔

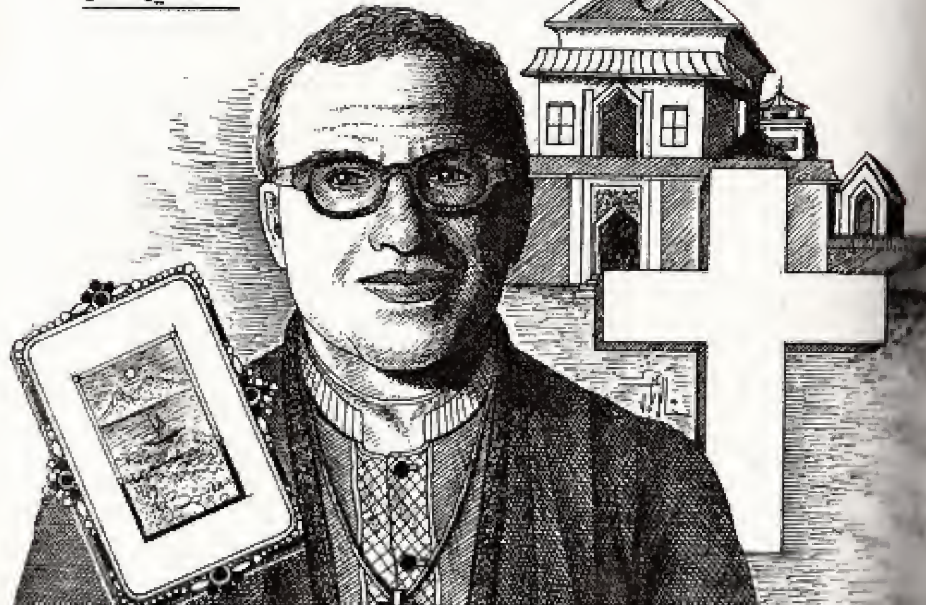
وہ اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہی والا تھا کہ ایک نیلے رنگ کی ہنڈا اسٹیشن اسٹریٹ سے مڑ کر پارک اسٹریٹ پر

### بنادٹی پاکیزگی کا پیرا من ادو سے ایک چور کی کارستانی

مقاد پرست کی پہچان یہی ہے کہ وہ ہر شے، ہر تعلق حتیٰ کہ ہر تقدس میں بھی مفاد کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر رہی لیتا ہے جیسے کہ اس تصویر کو مقدس سمجھنے والوں کے نظریات میں اختلاف تھا لیکن ان میں کوئی ایک ایسا بھی تھا جسے ان نظریات کی قطعاً کوئی پروا نہ تھی بلکہ ایسے .... بھی اس نے اپنے فائدے کی خاطر چرچ لیا۔

## مقدس تصویر

شاہ زین رضوان



”ہاں وکٹر۔۔۔“  
”تم بالکل ہو۔۔۔ بے وقوف۔“  
”تم کیا کہہ رہے ہو؟“  
”تفلی پیٹنگ ہے۔“  
”یقیناً تم نے خود نوں پر مجھے کہا تھا کہ بڑھیا اصلی

پیٹنگ لاری ہے۔“  
”جب میری ٹیلیوی سے پیٹنگ باہر گئی تو اس وقت تک وہ اصلی ہی تھی۔“

”تم سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ نام نے غصے سے کہا۔  
”نہیں۔۔۔ وہ اصلی پیٹنگ ہی تھی۔“

”پھر یہ سب کیسے ہوا؟“  
”وکر سوچنے لگا۔۔۔ چند سیکنڈ بعد وہ سمجھ چکا تھا۔

”نام۔۔۔ اس بڑھیا نے ہمیں ہمارے ہی کھیل میں شکست دے دی۔ اس نے راستے میں ہی پیٹنگز تبدیل کر لیں۔۔۔ وہ بوڑھی بھی نہیں بلکہ شیطان مفت عورت نکلی۔“

☆☆☆  
ایڈگر وہیں بیٹھا تھا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ ایڈگر نے اس کی آواز سنی۔ وہ کوئی گانا گنا کر نکلتا رہی تھی۔

ایڈگر اٹھا اور ایک کپڑے سے اپنے پیٹنگ برش کو صاف کرنے لگا۔ وہ اندر داخل ہوئی اس کی نظر میں ایک پیٹنگ تھی۔ ایڈگر بولا۔

”کتنے کسائے آج اس نفی پیٹنگ سے؟“  
”پانچ سو پاؤنڈ۔“

”بہت خوب۔۔۔ آدھے دن کی کمائی اور وہ بھی پانچ سو پاؤنڈ۔۔۔ گنڈا۔“

”جس میں بھی تو آدھا دن لگتا ہے ایک نفی پیٹنگ کو تیار کرنے میں۔“

”سو۔۔۔ آج میں کیا تھا تمہارے لیے؟“  
”میرے برے ہوئے بھائی۔“

”اوہ۔۔۔ پچھلی بار میں تمہارا باپ تھا۔“  
”چھوڑو ڈیئر۔۔۔ تم ہی تو میرے سب کچھ ہو۔“

”سوئی باقی رہی؟“  
”ختم ہو چکی۔ میں اسے مکمل کر چکا ہوں۔“

”تو آؤ، اب اس خوشی کو منائیں۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔

”کہاں ہے شروب کی بوتل؟“  
”یہ رہی۔“ ایڈگر نے اسے اشارے سے بتایا۔

”تم بیوقوف میں برف لے کر آ جاؤ۔“

ہوں۔۔۔ چار سو پچاس یا پھر نہیں۔“  
”کیا یہی اس کی قیمت ہے؟“ بڑھیا بڑبڑائی۔ بڑھیا کی آنکھوں میں ایک غم تھا جو نام نے شدت سے محسوس کیا۔

نام کو معلوم تھا کہ اصل قیمت دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔ بڑھیا اپنے آنسو پونچھ کر دوبارہ پیٹنگ کو باندھنے لگی۔ نام کو اب یہ خوف تھا کہ اگر اسے باہر کوئی سچا تاجر مل گیا اور اس نے اس بڑھیا کو اس کی اصل قیمت بتا دی تو منافع بھی ان کے ہاتھ سے جائے گا اور عزت بھی۔

نام نے ہمت کی اور کہا۔ ”پانچ سو پاؤنڈ۔۔۔ یا پھر آپ جاسکتی ہیں۔“

☆☆☆  
وکٹر آج بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی دکان بند کی اور اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوا نام کی دکان کی طرف جانے لگا۔

اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ دس گنا سے بھی کم قیمت پر اس نے ریگ بانی کی اصلی پیٹنگ حاصل کر لی تھی۔ نام کا منافع نکال کر بھی اسے اپنے خاصے پیسے مل رہے تھے۔ نفی کو کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ نام کے پاس آیا۔

”کیا تم وہ پیٹنگ لے چکے ہو؟“ وکٹر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”آخر کار۔۔۔“ نام نے جواب دیا۔  
”کیا مطلب۔۔۔؟“

”وہ بوڑھی نفی پانچ سو پاؤنڈ سے کم پر نہیں آئی۔“  
”پانچ سو۔۔۔؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ چار سو سے زیادہ نہ جانا۔“

”کیا فرق پڑتا ہے رقم کہیں زیادہ کمالو گے۔“  
”لیکن میں زیادہ سے زیادہ منافع چاہتا تھا۔“

”اسے پیسوں کی ضرورت تھی وکٹر۔“ نام نے کہا۔

”ایک سو پاؤنڈ سے کیا جاتا ہے تمہارا۔“  
”چھوڑو اب۔۔۔“ وکٹر نے ہزاروں سے کہا۔ ”اب ہمارے پاس ہے لہذا نفی کی تصویر۔۔۔ ریگ بانی کے ہاتھوں سے تیار کی ہوئی۔“

”پتھاری سس پائمنٹ۔“  
”تم اور تمہاری وہ بوڑھی بھیڑ۔۔۔ جسے ہم ذبح کر چکے ہیں۔“

نام نے پیٹنگ اس کے سامنے کی۔ وکٹر بغور پیٹنگ کو دیکھنے لگا۔ نام، وکٹر کی طرف ہنسی دیکھ رہا تھا جب وکٹر کے چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے۔

”تم نے پانچ سو پاؤنڈ اس کے لیے ادا کیے؟“



چکانے میں کام آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ بپ تمہیں اپنی خاتون کے لیے ان میں سے کوئی ایک چیز لے جانے کی اجازت دے دے گا۔

ایبٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس جلتے لوگ اپنے چرچ کا نقصان برداشت کر لیں گے؟“

”انہیں بے جان کر بہت دکھ ہوا کہ جس چرچ میں ان کی شادیاں ہوئیں، ان کے بچوں کا نام رکھا گیا، ان کے پیاروں کی آخری رسومات ادا کی گئیں، اب وہ بند ہو رہا ہے۔ ان میں سے کئی ایک مستحق ہو کر دوسرے چرچ میں چلے گئے اور باقی لوگ مایوس بلکہ ناراض ہیں۔“ فادر نے ایک بار پھر غصہ کی سانس بھری اور کہا۔ ”لیکن نوجوان نسل باقاعدگی سے چرچ نہیں آتی۔ اس لیے۔۔۔“

”ہاں۔“ ایبٹ جوزف نے کہا۔ ”بپ گرجا گھروں کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی لیے سخت فیصلے کرنا پڑے رہے ہیں۔ ان پادریوں کا کیا ہوگا جو اس گرجا کو چلاتے ہیں۔۔۔ ان کا کیا مستقبل ہے؟“

”فادر سائمن کی عمر کافی ہو چکی ہے اور وہ عقرب ربیٹاڑ ہونے والا ہے۔ نوجوان پادری اشارک جو اس کی معاونت کے لیے پولینڈ سے آیا تھا، وہ واپس جانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔“

”مٹی پیاری ہے۔“ برادر لیو نے سر گھڑی کی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے اسی جوت پہلے بھی دیکھی ہو۔“ ”یہ لکڑی کی جوت ہے۔“ فادر ڈوکی نے وضاحت کی۔ ”اسے اتنی برس پہلے پولینڈ میں تعمیر کیا گیا تھا۔“

”یعنی جلتے کے اصلی لوگ پولینڈ سے ہجرت کر کے آئے تھے؟“ ایبٹ جوزف نے پوچھا۔

”ہاں۔ ان میں سے کچھ اپنے ساتھ مصنوعی اشیاء لے کر آئے تھے۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں تھیں کیونکہ زیادہ تر ہجرت کرنے والے غریب تھے لیکن پولش پادری کچھ قیمتی چیزیں بھی لے کر آئے جیسے چاندی کے پیالے۔۔۔ اس چرچ میں بھی ایک بہت خوب صورت منبر کی صلیب ہے۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ صلیب پولینڈ کے کس حصے سے لائی گئی تھی؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ کوئی پراٹا آدمی اس بارے میں جانتا ہو۔“

”بھئی۔۔۔“

تینوں آدمیوں نے پلٹ کر دیکھا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ ایک عورت سیاہ کوٹ اور نیلے پھولدار۔۔۔

اسکارف میں ملبوس لکڑائی ہوئی ان کے پاس سے گزری اور عبادت میں مشغول ہو گئی۔

”بھئی؟“ ایبٹ جوزف نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ”یہ روس کی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا شہر ہے۔“ فادر ڈوکی نے وضاحت کی۔

تینوں آدمی عبادت گاہ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ عورت ایک سینٹ کی پینٹنگ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

”یہ سینٹ کون ہے؟“ جوزف نے پوچھا۔ ”سینٹ ہیڈوگ۔۔۔ پولینڈ کی ملکہ تھی، بہت ہی خیر اور حلیم کو کہ اس نے کبھی اقرار نہیں کیا لیکن وہ شاہانہ لباس کے بجائے فن کا لباس پہنتی تھی۔ کچھ لوگ اس سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ میں اس پینٹنگ کی تاریخ نہیں جانتا۔“

وہ بوڑھی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور ان تینوں کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”سینٹ ہیڈوگ۔۔۔“ اس نے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ نیچور سے آئی تھی۔“

فادر ڈوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تمہارا مطلب ہے کھل سے؟“

اس عورت نے تائید میں سر ہلادیا۔ فادر ڈوکی نے سینٹ ہیڈوگ کی عبادت گاہ میں قدم رکھا اور پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ بوڑھی عورت کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”پھر تو یہ بہت قیمتی ہوئی؟“

”یہ ایک طویل دکھ بھری کہانی ہے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں یوں سمجھو کہ اسے تباہ ہونے سے بچایا گیا۔“

”یہ کہہ کر وہ عورت مڑی اور لکڑائی ہوئی گرجا سے باہر چلی گئی۔ فادر ڈوکی اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

ایبٹ جوزف اور برادر لیو کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ”وہ کیا کہہ رہی تھی؟“ جوزف نے فادر ڈوکی سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ نیچور کا مکمل سترھویں صدی میں بنا تھا پھر یہ ایک امیر کیر خاندان ریڈزی ول کے تصرف میں آ گیا۔ وہ اس میں 1945ء تک رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنگ کے دوران نازیوں نے اسے لوٹا ہوگا۔ جنگ کے خاتمے پر کیونسٹ حکومت نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ریڈزی ول خاندان اس حکومت کے خاتمے تک مکمل واپس لینے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں کاشیانی ہوئی یا نہیں۔“

”ریڈزی ول۔۔۔“ جوزف نے کہا۔ ”یہ نام کچھ جانا بیچا نا لگتا ہے۔“

”جیکو لین کینیڈی کی بہن کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی۔“

”ادو ڈیر!“ برادر لیو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ فادر نے جواب دیا۔ ”اس محل کا فرنیچر اور تھیں اور اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ پینٹنگ بھی بہت قیمتی ہو۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریڈزی ول خاندان ہی اس کا اصل مالک ہو۔“ برادر لیو نے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔“ فادر ڈوکی بولا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ تصویر کب اور کیسے اس گرجا میں آئی۔“

ایبٹ جوزف قریب جا کر اس پینٹنگ کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس عورت نے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی قیمتی تصویر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پیچھے ایک المیہ ہے اور اسے تباہ ہونے سے بچایا گیا۔“ وہ فادری کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا وہ محل تباہ ہو گیا تھا؟“

”مجھے یقین ہے کہ نہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”اور نہ ہی میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ کوئی قیمتی تصویر ہے۔ جیسا کہ تم دو کچھ کہتے ہو کہ اس میں زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔“

ایبٹ جوزف نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور سینٹ ہیڈوگ کے تاج میں لگے ہوئے سبز پتھروں کو چھوتے ہوئے بولا۔ ”میرا کسی بھی خیال ہے۔“

فادر ڈوکی تصویر کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”یہ سبز پتھر، کیا تم سمجھتے ہو۔۔۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”یہ زمری طرح تو نہیں لگتے؟“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔“ جوزف نے کہا۔ ”ان پتھروں پر عجیب سی سفید باریک لائیں ہیں لیکن صاف نظر آتی ہیں۔“

”یعنی یہ زمرہ نہیں ہے۔“ برادر لیو نے کہا۔

”اگر زمرہ نہیں تو پھر کیا ہے؟“ فادر ڈوکی نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ جوزف بولا۔ ”لیکن بپ کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ ان پتھروں کی مالیت کا اندازہ لگوالیں۔“

فادر ڈوکی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید بپ نے پہلے ہی اس کا انتظام کر دیا ہے۔“

جوزف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم ڈیر کی بات کر رہے ہو۔“

دروازے کھلے اور قدموں کی آواز سن کر وہ تینوں ہلکے پڑے۔ ”یہ کھسائی جلتے کے لوگ ہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”مجھے ان کی میننگ ہو رہی ہے جس میں گرجا بند

ہونے کی صورت حال پر غور کیا جائے گا۔ مجھے شہ ہے کہ ان کے جذبات بہت شدید ہوں گے۔ کیا تم اس میننگ میں جانا پسند کرو گے؟“

برادر لیو چند قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔ ”میں فادر سائمن سے اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ شاید وہ مجھے کچھ بلب دینا چاہ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ جوزف نے کہا۔ ”میں تم سے میننگ کے بعد ملوں گا۔“

برادر لیو چرچ سے باہر نکلا۔ اس نے سڑک کے دوسری جانب کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر سر ہلایا اور پادری کے گھر کی جانب چل دیا۔ نیچے میننگ روم میں جوزف اور فادر ڈوکی کچھ نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیسا کے لوگ ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں سے جذبات کی شدت، اداسی، پریشانی، تجسس اور غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور ماتھے پر ٹل پڑے ہوئے تھے۔ وہ صدائیں کر رہی پر بیٹھ گیا جبکہ وہ اس کے دائیں بائیں کرسیوں پر براہمان ہو گئے۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔

وہ بے چین شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور اس نے میننگ شروع ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم سینٹ ہیڈوگ کو بچانے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ہسپانوی چرچ میں ضم ہو جائیں، پھر اس نے اپنے بائیں جانب پیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مستر سائمن؟“

سائمن اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور اس نے اس تجویز کے حق میں رضامندی ظاہر کر دی۔ ناراض رکن جس کا نام مسٹر رابرٹ تھا، کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں ایک نکتے پر مسٹر سائمن اور مسٹر ولیم سے متفق ہوں۔ ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں کہ بپ کو چرچ بند نہ کرنے پر قائل کر سکیں جبکہ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اس کے اخراجات پورے کرنے کا کوئی راستہ نکال لیں گے۔ وہ ہماری کوئی بات نہیں سمجھتا۔“

یہ کہہ کر اس نے ڈرامائی انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ بے چینی کے عالم میں اپنی نشستوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ رابرٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی ہم اپنے چرچ کے لیے کچھ نہ کر سکتے ہیں۔ کم از کم ہمیں اپنے ورثے کی ضرورت حفاظت کرنی



چاہیے۔ ہم اپنے بزرگوں کے احسان مند ہیں جو یہاں آئے کام کیا اور یہ چرچ بنایا۔“

پھر اس نے میز پر دنگا مارتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اپنی منبر کی صلیب کو بچانا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ سینٹ ہیڈوگ کی حفاظت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری نظر میں اس کی کیا اہمیت ہے کیونکہ وہ ہماری سینٹ ہے۔“

سب لوگوں نے تائید میں سر ہلادیا۔ ان میں سے ایک چلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، ہمیں اس کو ضرور بچانا ہے۔“

”لیکن.....“ مسٹر ولیم نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ ”ہم اسے کس طرح بچا سکتے ہیں؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مغرب ایک تاجر ان چروں کا تحنیز لگانے آ رہا ہے۔ اگر اس نے سینٹ ہیڈوگ کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو ہم اسے کیسے روک سکیں گے؟ اس حلقے کو پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔“

مسٹر رابرٹ نے مسٹر ولیم کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ”ہم اسے بچالیں گے۔ میں نے مسٹر ہیک سے مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔“ اس نے تیسری قطار میں بیٹھے ہوئے ایک ہماری جگر جس شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے چڑباتی انداز میں کہا۔ ”ہم اسے کس طرح بچا سکتے ہیں؟ آپ اسے چرچ سے چرا نہیں سکتے اور نہ ہی اس تاجر کو اسے لے جانے سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہشپ نے اسے اجازت دے دی۔“

مسٹر ہیک نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اور مسٹر رابرٹ کئی سالوں تک ایک ساتھ کام کر چکے ہیں۔ ہم کوئی طریقہ نکال لیں گے۔ سینٹ ہیڈوگ خود نہیں بتائے گی کہ اس کی حفاظت کس طرح کی جائے۔“

مسٹر رابرٹ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ہم جاننا چاہیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی میٹنگ ختم ہو گئی۔ فادر ڈونکی اور جوزف گر جا کے درمیانی جھے میں آئے۔

”میں ایک بار پھر سینٹ ہیڈوگ کی پیٹنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جوزف نے کہا۔ ”مجھے ان سبز پتھروں کے بارے میں تجسس ہو رہا ہے۔“

ادھر کی منزل پر ایک شخص عمدہ ترش خراش کے سوٹ میں ملبوس پیٹنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”شاید یہی وہ تاجر ہے جسے ہشپ نے بلایا تھا۔“ فادر ڈونکی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

جوزف نے اس کا بازو پکڑا اور اسے روکے ہوئے بولا۔ ”ایک منٹ صبر کرو۔“

وہ تاجر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”شاید اس نے ہماری بات سن لی۔“ جوزف بولا۔ ”آؤ اس سے بات کرتے ہیں۔“

”ہمارا خیال ہے کہ تم وہی تاجر ہو جسے ہشپ میگلین نے بھیجا ہے۔“ فادر ڈونکی نے کہا۔

اس شخص نے محسوس کر دیکھا اور بولا۔ ”ہاں، میں ہی ہوں اور تم؟“

”میرا نام فادر ڈونکی ہے اور یہ ایبٹ جوزف ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس تاجر کا یاوری فادر.....“

”فادر سامن۔“ ڈونکی نے کہا۔ ”میں قرعہ چرچ سے آیا ہوں۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ پیٹنگ جیس قیمت ہے؟“ جوزف نے پوچھا۔

تاجر شکر مارتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میں نے اسے سرسری نظر سے دیکھا ہے اس لیے یقین ہے کہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے لیے مجھے اس کا تفصیل سے معائنہ کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”مجھے ذرا جلدی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد جوزف بولا۔ ”وہ غالی اصول کر رہا تھا۔“

فادر ڈونکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جیسا کہ اس نے کہا کہ وہ تصویر کا بغور معائنہ کیے بغیر اس کی قیمت کا تعین نہیں کر سکتا۔“

”اس نے ہمیں اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“

”اگر تم چاہو تو میں ہشپ سے اس کا نام معلوم کر سکتا ہوں۔“

”پلیز یہ کام ضرور کرو۔“ جوزف پیٹنگ کی طرف حڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم قریب میں مجھے کسی اچھی لائبریری کا پتا دیتے ہو؟“

فادر ڈونکی نے کاؤنٹی لائبریری کے بارے میں بتایا اور وعدہ کیا کہ وہ فون کر کے اسے ڈیٹر کے نام سے آگاہ کر دے گا۔

چند منٹوں بعد جوزف ایک کرسی پر بیٹھا فادر ڈونکی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ یہاں آکر ہمیشہ سکون محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ڈونکی کا کافی کا بگ لے کر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ”اسکی کیا بات معلوم ہو گئی جس نے تمہیں پریشان کر دیا؟“

”پریشان نہیں جبران.....“ یہ کہہ کر جوزف نے اپنی

جیب سے وہ تصویریں نکالیں جو اس نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ ”میں ان سبز پتھروں کے بارے میں جان گیا ہوں، وہ یا قوت ہیں۔“

”کیا یہ بہت قیمتی ہیں؟“

”ہاں۔ ایک قیراط کم از کم ایک ہزار ڈالر مالیت کا ہے۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس طرح کے تین یا چار پتھر سینٹ ہیڈوگ کے تاج میں بڑے ہوئے ہیں۔“

فادر ڈونکی نے کہا۔ ”اور یہ اتنی زیادہ مالیت نہیں کہ اس میں کوئی تاجر دلچسپی لے سکے۔ لہذا ہم غلطی پر تھے۔ کیا یہ پیٹنگ بڑا بڑا خود جیس قیمت ہے؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”اس کے باوجود.....“ ڈونکی نے میز پر کافی کے پیالے رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہشپ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تاجر اس پیٹنگ کو خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

جوزف نے اپنی بھوس ادھر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہشپ نے یہ بتایا کہ اس تاجر نے کیا قیمت لگائی ہے۔“

”شاید تم نے اس کا نام تجس گورڈن بتایا تھا۔“

”صحیح اندازہ تو نہیں لیکن ہشپ اس بارے میں بہت رنجوش ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس تاجر نے بہت اچھی پیٹنگ کی ہے اور اس رقم سے ہمارے اسکول میں ضروری سرمت کا کام ہو سکے گا۔“

جوزف اور فادر ڈونکی کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر ڈونکی نے کہا۔ ”اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ پیٹنگ اتنی قیمتی نہیں ہے تو وہ تاجر اسے خریدنے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور اس نے ان پتھروں کی قیمت سے کہیں زیادہ کی پیشکش کی ہے۔“

جوزف اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”میری رائے سچ سے ایک اور امکان ظاہر ہوتا ہے۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ ایک مخصوص قسم کا یا قوت ہے جو روس سے آتا ہے۔ اس کی ایک کھپ اول کی پہاڑیوں سے سڑکی دہائی میں دریافت کی گئی تھی اگر ان کا رنگ چمک دار ہو تو یہ بہت قیمتی ہیں اور اگر نہیں تب بھی ان کی مالیت ایک ہزار ڈالر زنی قیراط سے کہیں لیکن نہیں یا وہ ہے کہ اس بڑی عورت نے ہمیں اس پیٹنگ کی اصلیت کے بارے میں کیا بتایا تھا؟“

”میں سوچ رہا ہوں..... وہ محل جس میں ریڈی ول خانداں رہتا تھا۔“

جوزف نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ”اگر یہ بات

درست ہے اور واقعی ریڈی ول خانداں اس پیٹنگ کا مالک تھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں لگے ہوئے یا قوت اتنا ہر سوسا کھپ کے ہیں اور ان کی قیمت بھی وہی ہے لیکن ریڈی ول خانداں سے تعلق کی بنا پر یہ اور پیٹنگ دونوں ہی زیادہ قیمتی ہو سکتے ہیں۔“

”کتنے قیمتی؟“

جوزف نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یقیناً اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو مسٹر گورڈن نے لگائی ہے اور اگر ہشپ اسے حقیقی قیمت پر فروخت کرنا چاہے تو اسے اس کا ماخذ ثابت کرنا ہوگا۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟“

فادر ڈونکی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔ مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسے اس پیٹنگ کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ وہ کیسے اور کہاں سے آئی ہے۔“

”لیکن وہ بوڑھی عورت جانتی ہے۔“

”اس نے یقیناً اس جانب اشارہ کیا تھا۔“

”تم اس عورت کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

فادر ڈونکی منہ ہناتے ہوئے بولا۔ ”وہ پولینڈ کی رہنے والی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وہیں پیدا ہوئی ہوگی اور اس کا شمار سینٹ ہیڈوگ کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے۔ بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔“

”لگتا ہے کہ اس پیٹنگ سے اس کا گہرا جذبہ بانی تعلق ہے۔ کیا تم اس کا نام اور پتا معلوم کر سکتے ہو؟“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فادر سامن کے پاس کلیسا کے تمام لوگوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تصویر کا ماخذ ثابت کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے تو ہشپ یقیناً خوش ہوگا۔“

”مجھے یقین ہے کہ گورڈن کو اس تصویر کی اصلیت کا پتا ہے۔ ورنہ وہ کیوں اسے خریدنے کا خواہش مند ہوتا۔“

فادر ڈونکی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس کا جواب بہت آسان ہے، اس کے پاس ایسا کوئی گاہک ہے جو سینٹ ہیڈوگ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔“

جوزف نے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ عام طور پر جنگ عظیم دوم کی اشیاء مثلاً ہتھیاروں، جنموں اور دستاویزات کے سودے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ عظیم دوم کی چرائی ہوئی تصویریں اور نوادرات میں بھی اس کی دلچسپی ہے۔“



”اگر سینٹ ہیڈ وگ کی پیشنگ بھی اسی زمرے میں آتی ہے تو گورڈن اس کی حقیقی قیمت جانتا ہوگا۔“

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے اور اسی وجہ سے وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”کیا وہ اس بارے میں بشپ کو بتانے کا پابند نہیں ہے؟“

”اعلافا تو اسے بتا دینا چاہیے۔ البتہ قانوناً اس پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔“

”پھر ہمیں اس یوزمی عورت سے ضرور معلوم کرنا چاہیے۔ صرف وہی اس معاملے کو حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔“

جوزف نے کہا۔ ”میں اس عورت سے جلد از جلد ملنا چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اس کا نام پتا معلوم کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔“

اس شام جیس گورڈن دوبارہ چرچ میں داخل ہوا۔ اسے یہ پریشانی نہیں تھی کہ اس کے علاوہ وہاں اور کون ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ بشپ یہ پیشنگ اسے ہی فروخت کرے گا اور اگلے روز یہ سوداٹے پا جائے گا لیکن اس سے پہلے وہ ایک دفعہ اپنا طمینان کر لیتا چاہتا تھا۔

مگر جاس میں روشنی ہو رہی تھی اس لیے اسے ٹارچ نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہاں تین افراد اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ انہوں نے اس کی آمد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی نظر ایک شخص پر گئی اور گورڈن کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ ایک طویل قامت بھاری بھر کم شخص تھا۔ گورڈن ایک ستون کی آڑ میں ہو کر اس کے جانے کا انتظار کرتے گا پھر وہ شخص ایک شیخ کی جانب بڑھا اور وہاں سے ایک کتاب اٹھائی۔ یہی کچھ اس نے دوسری ٹیبلوں پر بھی کیا۔ گورڈن سمجھ گیا کہ وہ چرچ کا دربان ہے۔ پھر وہ تصویر کی جانب بڑھا اور بخور دیکھنے کے بعد طمینان ہو گیا کہ یہی وہ شاہکار ہے جس کی اسے عرصے سے تلاش تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگا کر چاہا تھا لیکن اس نے خود کو روکا اور بتلی اور واڑے سے باہر نکل گیا۔

”سب کچھ کھو گیا۔“ مسز وائو بڑبڑائی۔ ”اب میں بہت یوزمی ہو گئی ہوں اس لیے اس کی حفاظت نہ کر سکی۔“

جوزف اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں دیکھ سکتا تھا۔ نازبوں نے پولینڈ میں بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ انہوں نے عظیم موسیقار چوپن کا مجسمہ مسمار کر دیا۔ وارسا

میں تباہی مچائی اور تشدد کے ذریعے حکومت کی۔ میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کی حفاظت نہ کر سکی۔ اسے پولینڈ واپس جانا چاہیے تھا۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میں بہت چھوٹی تھی اس لیے اس پیشنگ کو وہاں نہ لے جا سکی پھر میں خود ماں بن گئی اور پولینڈ پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ اب میں بہت یوزمی ہو گئی ہوں۔ وہ تصویر بھی واپس نہ جاسکے گی۔ یہ ایک اور المیہ ہے۔“

جوزف اس کی جانب جھٹکے ہوئے بولا۔ ”کیسا المیہ؟“

”وہ پولینڈ کا دل اور اس کی روح ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ جوزف نے پوچھا۔ ”پولینڈ میں سینٹ ہیڈ وگ کی کئی جینٹلمن ہوں گی اگر اس میں کوئی خاص بات ہے تو بتاؤ۔ شاید ہم اس کی حفاظت کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں۔“

”اس کی موسیقی پولینڈ کی آواز ہے۔ میرے باپ نے یہی بتایا تھا۔“

اسیٹ جوزف دم بخورہ گیا۔ ریڈی ول خاندان کے بارے میں اس کی ریسرچ کے دوران جو اشارہ ملا، شاید وہ سچ تھا۔ ”اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا؟“

”میں بہت چھوٹی تھی جب اس کا انتقال ہوا لیکن مرنے سے پہلے اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اسے کہاں لے کر جانا ہے۔“ اس نے دروازے کی اپنی آنکھیں خشک کیں۔

”کہاں؟“ جوزف نے پوچھا۔ ”اس نے کہاں لے جانے کے لیے کہا تھا؟“

”وارسا کے بولی کر اس چرچ میں لیکن میں اسے لے جانے میں ناکام رہی۔“

جوزف کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے باپ کا کیا مطلب تھا۔ اس پیشنگ میں یقیناً پولینڈ کی موسیقی ہے۔“

اس نے مسز وائو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”امید کا دامن مت چھوڑو۔ ہم اب بھی اسے پکڑ سکتے ہیں۔“

ایک گھنٹے بعد جوزف نے کاؤنٹی لائبریری سے فادر ڈوکی کو فون کیا۔ ”مجھے مسز وائو سے پیشنگ کے بارے میں اہم معلومات ملی ہیں۔ میں اس وقت لائبریری میں ہوں لیکن جلد ہی اپنی ریسرچ ختم کروں گا۔ ہم رات کو بات کریں گے۔“

”ضرور۔ میرے پاس بھی کچھ اہم معلومات ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکتی تم آ جاؤ۔“

جیس گورڈن بہت ناراض تھا۔ وہ اس معاملے میں

کر جا کے کسی فرد یا پادری سے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا تعلق بشپ کے کلین سے تھا جس کے پاس اس تصویر کو بیچنے کا اختیار تھا اور وہ اس پر راضی بھی ہو چکا تھا۔ گورڈن نے اس تصویر کی بہت زیادہ قیمت لگائی تھی اور وہ کسی کو اپنی ریسرچ کے بارے میں بتانے کا پابند نہیں تھا۔

اس نے کئی سالوں تک ریڈی ول خاندان پر تحقیق کی تھی۔ شہزادہ اٹوئی ریڈی ول خود ایک اچھا موسیقار تھا۔ اس کے باوجود اس نے نو جوان موسیقار چوپن کو اپنے محل میں مدعو کیا۔ اس کے انتقال کے بعد مائیکل ریڈی ول اس کا وارث بنا لیکن پولینڈ کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے اسے جلاوطن ہونا پڑا۔ اس کا اسٹیٹ فیکر جان بچا کر جیس چلا گیا اور اپنے ساتھ سینٹ ہیڈ وگ کی تصویر بھی لے گیا۔ گورڈن اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا پھر اسے معلوم ہوا کہ کئی عشروں بعد فیکر کا پوتا اس تصویر کو لے کر امریکا آ گیا اور اب وہ اس چرچ میں ہے۔

گورڈن نے گھڑی دیکھی۔ وہ اس پادری سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہ رہا تھا تا کہ صبح پیشنگ لے کر سیدھا انٹرپورٹ چلا جائے۔ بول کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے براسا نہ بنایا۔ یقیناً وہ پادری اب یہ جڈیانی اپنی لے کر آیا ہوگا کہ گرجا کے لوگوں کو اپنے ساتھ یہ تصویر لے جانے کی اجازت دی جائے جس کر جاس میں وہ بحالت مجبوری جا رہے ہیں۔ اسے پادری سے خٹے سے انکار کر دینا چاہیے تھا لیکن کچھ سوچ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

اسے امید تھی کہ پادری اس سے جھگڑا کرے گا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس پر چرچ میں داخل ہونے اور تصویر پوری کرنے کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔ گورڈن نے بھی اپنا قصہ نکالا اور پادری کو خطرناک قسم کی دھمکیاں دیں لیکن وہ اس ضرب کے لیے تیار نہیں تھا جو پوری قوت سے اس کی نوزی پر لگی۔ وہ چیخے کی جانب گرا اور اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا پھر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھا گیا۔

جوزف نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بہت دیر ہو گئی۔“

”جس کسی نے بھی یہ پیشنگ لی ہے، اس نے گزشتہ شب یہ کام کیا ہے۔“ فادر ڈوکی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خلفے کے لوگ چرچ کے تہ خانہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ مجھے بھی وہاں ہونا چاہیے۔ کیا ہم مسز وائو کا انتظار کریں؟“

جوزف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں انتظار کرنا

## تصدیق

ایک آدمی نے اپنی ٹیم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ ”ٹیم! مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔ صبح کے لیے میرے کپڑے دھو کر استری کر دینا اور میری پسند کی ڈش میرے آنے سے پہلے تیار رکھنا۔ کھانا آ کر کھا لوں گا۔“

ٹیم کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک اور پیغام بھیجا۔

”اور ہاں، میں بتانا بھول ہی گیا کہ میری پروموشن ہو گئی ہے اور اس دفعہ مجھے زیادہ سیکریٹے گی۔ مہینے کے آخر میں ہم نئی کار بھی لے رہے ہیں اور پھر ڈیجیٹل ساری شاپنگ کر کے کسی اچھی جگہ سیر کے لیے جا سکیں گے۔“

ٹیم کو فوراً جواب آیا۔ ”واؤ۔ کیا واقعی؟“

اس آدمی نے غصے سے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تو صرف یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ تمہیں میرے پیغام مل بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ چلو جلدی سے اٹھو اور جو پہلے شیخ میں کام بتاتے ہیں وہ کرو۔“

مرسلہ۔ قدرت اللہ نیازی

ہوگا۔ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس کا رخ کس طرف جاتا ہے۔“

دو آدمی تہ خانے کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے اور پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مسز رابرٹ اور مسز ہلم کے سامنے ایک میز کے پیچھے کھڑے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔

”یقیناً تم نے سن لیا ہوگا کہ سینٹ ہیڈ وگ کی پیشنگ غائب ہے۔“ مسز ہلم نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔“

مسز رابرٹ نے کہا۔ ”ہم سب جانتے ہیں کہ بشپ میکسین کو وہ پیشنگ چاہیے تھی، ہمیں وقت ضائع کیے بغیر بشپ سے مل کر اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بشپ نے وہ تصویر لی ہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”لوگ باقاعدگی سے یہاں عبادت کے لیے آ رہے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ عترت یہ چرچ بند ہونے والا



ہے۔ ان میں سے تو کسی کی جرأت نہیں کہ وہ یہ حرکت کرے۔ البتہ بپ ایسا کر سکتا ہے۔ اسے کوئی روکے گا اور نہ کچھ پوچھے گا۔

ایک اور شخص نے پوچھا۔ ”کیا کسی نے بپ کو تصویر لے جاتے ہوئے دیکھا؟“

مسٹر رابرٹ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر دیکھا بھی ہوگا تو کون اس کی رپورٹ کر سکتا ہے اور کس سے کرے گا۔ یقیناً کسی نے بھی مجھ سے یا مسٹر ولیم اور مسٹر ہیک سے کچھ نہیں کہا۔“

جوزف نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ہیک نظر نہیں آ رہے۔ کیا کسی کو معلوم ہے کہ وہ کیوں نہیں آئے؟“

ایک آدمی نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ آج کام پر گیا ہے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں کام کرتا ہے؟“

”پبلک اسکول میں۔ وہ وہاں سکیورٹی کا ڈو ہے۔“

جوزف دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مسٹر ولیم کی جانب سے مینٹگ ختم ہونے کا اعلان بھی نہیں سنا۔ فادر ڈوکی نے اس کا کندھا پکڑ کر بلایا تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ سب لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ رہے تھے۔

”اب یہ لوگ بپ کے پاس جا رہے ہیں۔“ ڈوکی نے کہا۔ ”لیکن وہاں ان کا گرم جوشی سے استقبال نہیں ہوگا۔“

”مجھے شبہ ہے کہ ان کے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ جوزف نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور مسٹر رابرٹ کو بھی یہ بات معلوم ہے۔ چلو تمہارے مگر چل کر بات کرتے ہیں۔“

☆☆☆

فادر ڈوکی کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”تم نے یہ کیوں کہا کہ مسٹر ولیم کو بھی معلوم ہے؟ بپ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

جوزف نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے غور کیا کہ مسٹر رابرٹ نے ایک دفعہ بھی گورڈن کا نام نہیں لیا۔“

”شاید..... لیکن میرا خیال ہے کہ گورڈن بھی مشتبہ شخص ہو سکتا ہے۔“

”اگر وہ پینٹنگ لے گیا ہے تو اس میں بپ کی اجازت شامل ہوگی۔ کیا اس میں جڑے ہوئے یا قوت اٹھتی جیتی ہیں؟“

جوزف نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، مجھے یقین ہے کہ اس پینٹنگ میں کوئی اور جیتی چیز بھی ہے۔ مسٹر گورڈن اس کے بارے میں جانتا ہے یا کم از کم اسے شبہ ضرور ہے۔“

”اور تم بھی اس بارے میں جانتے ہو؟“

”مجھے بھی شبہ ہے لیکن ہم اس بارے میں نہیں جان سکتے جب تک ہم اس کا معائنہ نہ کر لیں..... خصوصاً اس کی پشت لیکن ہمیں بہت دیر ہوگئی۔“

ڈوکی نے بھوسلا پر کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کی پشت؟“

جوزف بولا۔ ”میری تحقیق کے مطابق مائیکل ریز زری دل جب جلاوطن ہوا تو اس نے گل کی کٹی پیش قیمت اشیا چھپا دیں تاکہ اس کی واپسی تک وہ محفوظ رہیں لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کے بیٹے نے کئی خاندانی جیتی اشیا جیس میں غلام کر دیں۔“

”کیا یہ پینٹنگ بھی اس میں شامل تھی؟“

”نہیں۔ اگر مسز ولوکی اطلاع درست ہے تو یہ تصویر اس کا دادا جیس لے کر آیا تھا۔“

ڈوکی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کے پاس یہ پینٹنگ کہاں سے آئی؟“

”جب مائیکل جلاوطن ہوا تو اس وقت وہ اس کا اسٹیٹ فیئر تھا اور اپنی جان بچا کر جیس چلا آیا۔“

”لیکن یہ تصویر..... کیا یہ اس کے لیے ذاتی اہمیت رکھتی تھی؟“

”اس سے بھی زیادہ۔ جب وہ 1915ء میں فوت ہوا تو اس نے یہ تصویر اپنے بیٹے یعنی مسز ولو کے باپ کے حوالے کر دی۔ اس وقت جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی اور پولینڈ غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو چکا تھا لیکن اس غلامی اور بربادی کی یادیں لوگوں کے دلوں میں تازہ تھیں۔“

ڈوکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج بھی ہیں۔“

”مسز ولو کے باپ نے عہد کیا کہ وہ اس پینٹنگ کی پوری طرح حفاظت کرے گا کیونکہ اس میں پولینڈ کا دل ہے۔“

فادر ڈوکی نے کہا۔ ”مسز ولو نے تمہیں بتایا ہوگا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟“

جوزف نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، وہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی جب وہ اور اس کا باپ تازیوں کے تسلط سے جان بچا کر امریکا آ گئے۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ بارہ سال کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ پینٹنگ کسی طرح پولینڈ کے چرچ میں پہنچا دی جائے لیکن

وہ پولینڈ واپس نہ جا سکی چنانچہ اس نے کئی سال پہلے اسے اس چرچ کو عطیہ کر دیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“

”مجھے یقین ہے کہ میں اپنی تحقیق اور جو کچھ مسز ولو نے بتایا ہے، اس سے کچھ اندازہ لگاسکوں۔“

”مائیکل ٹون کی کھنٹی بھی۔ فادر ڈوکی نے فون اٹھایا اور سننے کے بعد بولا۔ ”کسی نے گورڈن پر اس کے ہونٹ کے کمرے میں حملہ کر دیا۔“

”کیا وہ مر گیا؟“ جوزف نے پوچھا۔

”نہیں، وہ اسپتال میں ہے اور اس نے ڈاکٹروں کو بتایا ہے کہ اس پر کسی پادری نے حملہ کیا تھا۔“ ڈوکی نے کہا۔ ”میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ فادر سامنسن نے یہ حملہ کیا ہوگا کیونکہ وہ بہت ضعیف اور کمزور ہے۔ البتہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”تم اس پولش پادری کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“

ڈوکی نے سر جھکا تے ہوئے کہا۔ ”ہاں، فادر اسٹارک۔“

”میرا شک کسی اور پر ہے۔“ جوزف نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے کہ مسٹر رابرٹ نے کیا کیا تھا کہ سینٹ یڈیوگ میں اس تصویر کی حفاظت کا طریقہ بتائے گی۔“

فادر ڈوکی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

”اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ آج مسٹر ہیک نے پینٹنگ میں شرکت نہیں کی۔“

فادر ڈوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ بولا۔

”تم یہ کہا جا رہے ہو کہ مسٹر ہیک پادری کا روپ دھار کر گورڈن کے کمرے میں گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گورڈن نے وہ تصویر لی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہی ہوا ہے۔ اسی لیے مسٹر رابرٹ نے ایک دفعہ بھی گورڈن کا نام نہیں لیا اور سب کی توجہ بپ کی جانب کر دی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب وہ پینٹنگ مسٹر ہیک کے پاس ہے۔“ ڈوکی نے کہا۔

جوزف نے کہا۔ ”شاید یا پھر کسی ایسے شخص کے پاس جو اس کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو مسز ولو، پولینڈ کی تاریخ اور اس کے اگلے سے اچھی طرح واقف ہے۔“

فادر نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ وہ کون ہے اور یہ پینٹنگ کیوں پیش قیمت ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کر سکتا لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ

پینٹنگ پیش قیمت کیوں ہے۔ ایک نوجوان پولش موسیقار نے ریڈ زری دل کی نوجوان بیٹی کے لیے دھنیں تیار کیں۔ اس نے ایک لوک دھن بھی تیار کی جو بہت مشہور ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے اور بھی دھنیں تخلیق کی تھیں جن میں پولینڈ کے اگلے کو بیان کیا گیا تھا لیکن وہ کم ہو گئیں۔“

”تم چوہن کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں اور اگر تمہیں یاد ہو کہ مسٹر گورڈن اس پینٹنگ کی پشت میں دھنیں لے رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس دھن کا کم شدہ نگلاد ہاں چھپایا گیا تھا تاکہ وہ جلد آدروں سے محفوظ رہے۔“

”چوہن.....“ فادر نے کہا۔ ”جو دارسا کے ہولی کر اس چرچ میں دفن ہے۔“

”ہاں اور اس کے لوگ گیتوں میں پولینڈ کے لوگوں کے جذبے اور بربادی کی پوری داستان بیان کی تھی ہے۔“

کمرے کا دروازہ کھلا اور برادر لیو اندر داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا آیا اور دونوں پادریوں کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے یہ کام کل ہی کر لینا چاہیے تھا۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ فادر ڈوکی اور جوزف اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”اسی وجہ سے گورڈن زخمی ہوا لیکن وہ تصویر لے کر نہیں گیا تھا۔“

”پھر کون ہے؟“

”فادر سامنسن۔“

”اور وہ پینٹنگ کہاں ہے؟“

”راستے میں۔“ برادر لیو نے کہا۔ ”اسے پولینڈ لے جایا جا رہا ہے۔ فادر اسٹارک اسے لے کر گزشتہ شب روانہ ہو گیا ہے۔“

فادر سامنسن نے مجھے بتایا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اسے یہ پینٹنگ پولینڈ واپس پہنچائی ہے۔“

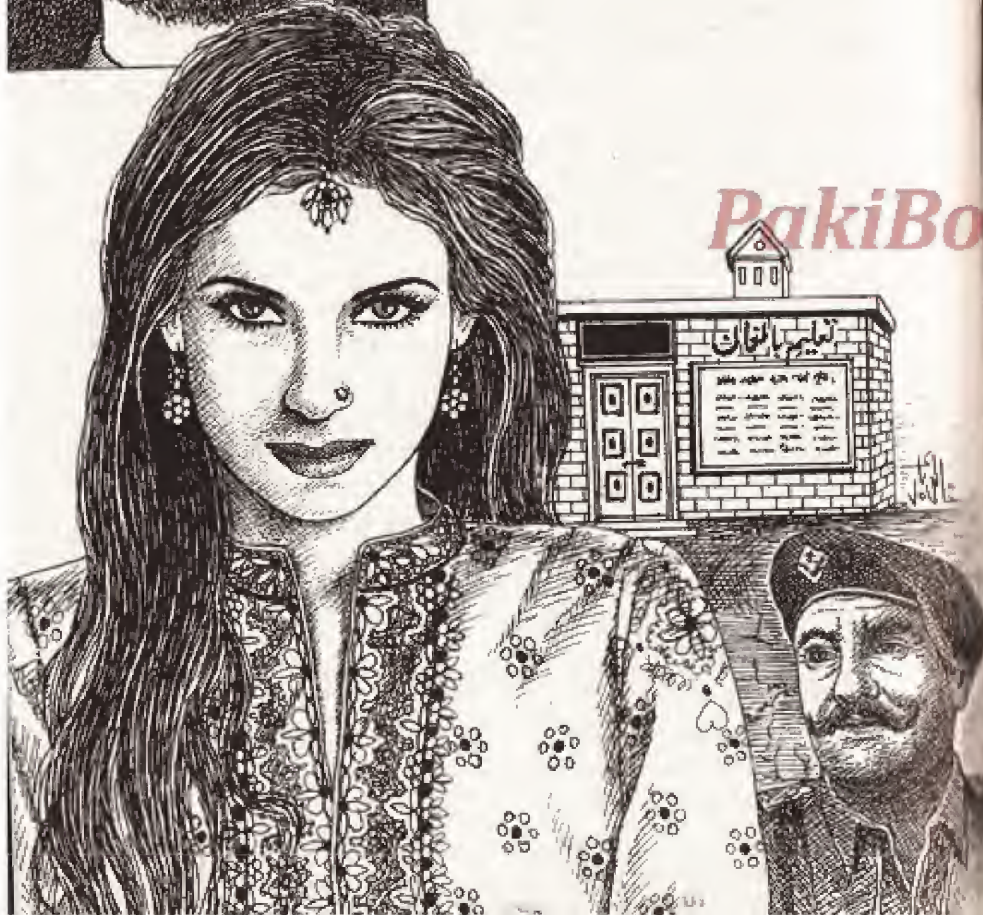
”لہذا اسی لیے فادر سامنسن نے اسے چرچ سے ہٹا دیا۔“

برادر لیو نے اثبات میں سر ہلایا۔

فون کی کھنٹی بھی۔ فادر ڈوکی نے فون سننے کے بعد کہا۔ ”بپ بہت ناراض ہے۔ اس نے فادر سامنسن کو فون کر کے پوچھا کہ پینٹنگ کہاں ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ نہیں جانتا۔ اس وقت وہ کہاں ہے؟“

جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں سے کوئی بھی نہیں جانتا لیکن اگر میں بھی پولینڈ گیا اور مجھے ہولی کر اس چرچ جانے کا اتفاق ہوا تو میں اسے وہاں دیکھ سکوں گا۔“





PakiBooks.Site

# انجاشہ

ملک صفدر حیات

سادگی کا چولا اور معصومیت کا روپ معاشرے میں انسان کو کتنا معتبر کر دیتا ہے... حتیٰ کہ وہ خطاوار ہو کر بھی سزاوار نہیں ٹھہر پاتا کیونکہ خود کو شک کے دائرے سے ہمیشہ دور رکھتا ہے مگر... کب تک۔ اس نے بھی شاید یہ نہ سوچا تھا کہ تفتیش کا جال دھیرے دھیرے ایک دن مجرم کو قید کر ہی لیتا ہے بس نرا ہوشیار آفیسر کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر چالاک سے چالاک مجرم بھی ساری ہوشیاری بھول جاتا ہے۔ وہ تو پھر ایک سادہ فطرت اور معصوم صورت انسان تھا۔ بس نرا کسی کے عشق میں ایسا قدم اٹھا بیٹھا جس کی نہ کوئی منزل تھی نہ مضبوطی۔

ایک الجھے ہوئے کس اور بھٹکے ہوئے

قدموں کا انجم

بجلی کی آنکھ چوٹی نے ملک کے طول و عرض میں آج کل عوام انسان کی زندگی کو بے رحم و بے رحم کر رکھا ہے۔ جو لوگ صاحب حیثیت ہیں وہ بجلی کی کوئی بیانیہ اور جڑی کی عدد سے پورا کر لیتے ہیں لیکن عوام کی اکثریت کا جینا دوسرا ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ یہ کھیت آئی کم اور جاتی زیادہ ہے۔ ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا، موضع کوٹ ڈوگراں کی بجلی چلی گئی ہے۔

ان دنوں میں قصبہ رسول پور تارڑ کے تھانے میں تعینات تھا۔ موضع کوٹ ڈوگراں میرے تھانے سے لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مذکورہ گاؤں کم و بیش پانچ سو نفوس پر مشتمل تھا۔ ایک مختار اندازے کے مطابق کوٹ ڈوگراں میں سو، سو سو گھر ہوں گے۔ اطلاع کنندہ کا نشیمل کوٹیش نے گھور کر دیکھا اور کہا۔

”ایقرب! کیا تم ہوش و حواس میں ہو؟“  
”جی، ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

اگست 2018ء سسٹمز ڈائجسٹ



کہا۔ ”بجلی کے باپ کو اندر بھیج دو۔“  
 ”اوکے سرا“ کا نشیمل یعقوب مجھے سیلیوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔  
 تھوڑی دیر پہلے جب میں برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے وہاں ایک چوٹی نیچ پر دو افراد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً ان میں سے ایک کشیدہ بجلی کا باپ ہوگا۔  
 کا نشیمل نے مذکورہ دونوں افراد کو میرے پاس بھیج دیا۔ ان کے چہروں سے پریشانی چھٹکتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں انہیں بیٹھے کو کہا اور پوچھا۔  
 ”تم میں سے بجلی کا باپ کون ہے؟“  
 ”جی، میں ہوں۔“ ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرا نام خیردین ہے تھانے دار صاحب۔ میں بجلی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“  
 خیردین کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے اریب قریب قائم کیا۔ وہ درمیانے قد کا مالک، گول چہرے والا ایک سادہ لوح شخص تھا۔ اس وقت وہ گہری فکر مندی میں تھا۔ واقعہ خیردین کے ساتھ دوسرا شخص اس کا بڑا دھڑی تھا جو مو بیوروٹ کے لیے خیردین کے ہمراہ چلا آیا تھا۔ مذکورہ بندے کا نام مقصود علی تھا۔  
 ”خیردین؟“ میں نے کشیدہ لڑکی کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری بیٹی کب اور کہاں سے غائب ہوئی ہے؟“  
 ”سرکار! وہ رات کو اچھی خاصی سوئی تھی۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”مگر صبح وہ اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ میں نے پورے پنڈ میں اسے ڈھونڈا مگر وہ ہمیں نہیں ملی پھر کسی نے مشورہ دیا کہ مجھے اس واقعے کی تھانے میں رپورٹ درج کرانا چاہیے۔ میں مقصود کو لے کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔“  
 ”تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ پچھلے مہینے پورے اٹھارہ سال کی ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا۔  
 ”تم نے اپنی بیٹی کا نام بجلی کیوں رکھا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔  
 ”یہ بھی جھلا کوئی نام ہوا۔۔۔۔۔۔؟“  
 ”سرکار! بجلی کا اصل نام شازبہ ہے۔“ خیردین نے بتایا۔  
 ”لیکن بچپن ہی میں اس کا نام بجلی پڑ گیا تھا اور آج تک سب اسے بجلی ہی بلاتے ہیں۔ شازبہ بہت خطرناک لڑکی ہے جتنا اسی وجہ سے اس کا نام بجلی رکھ دیا گیا تھا۔“  
 ”بجلی کے علاوہ تمہارے اور کتنے بچے ہیں؟“

”کوئی نہیں تھانے دار صاحب!“ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”بجلی ہماری اگلی اولاد ہے۔ ہمارا صرف تین افراد کا کنبہ ہے۔ میں، میری مہروالی بیٹھیں اور بجلی مگر۔۔۔۔۔۔ لگائی توقف کر کے اس نے بڈپائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔  
 ”پتا نہیں، بجلی کہاں چلی گئی ہے۔۔۔۔۔۔!“  
 ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خیردین۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری بیٹی جہاں بھی ہوگی، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس مقصود کو پانے کے لیے تمہیں مجھ سے ہمراہ روتا دن کرنا ہوگا۔“  
 ”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانے دار صاحب۔“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس کسی طرح آپ میری بجلی کو ڈھونڈ دیں۔“  
 ”کیا تم نے بجلی کی سیلیوں سے پوچھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”بجلی کی تین گہری سیلیاں ہیں۔ فرزاد، صدف اور عارفہ۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے ان تینوں سے بجلی کے بارے میں کچھ پوچھا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی بجلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“  
 ”تم نے بتایا کہ بجلی کتنے رات کو بھیک تھاں اپنے گھر میں سوئی تھی اور آج صبح وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔“ میں نے خیردین کے چہرے پر نگہ ہما کر نرم لہجے میں کہا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے ابھی تک بجلی کی شادی نہیں کی۔“ میرا اندازہ غلط تو نہیں؟“  
 ”نہیں جناب! آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔“  
 اس زمانے میں، گاؤں دیہات میں لڑکیوں کی شادی عموماً پندرہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان ہو جایا کرتی تھی۔ اسی تناظر میں، میں نے خیردین سے پوچھا۔  
 ”کیا تم نے ابھی بجلی کی شادی وغیرہ کر رکھی ہے؟“  
 ”نہیں سرکار! ابھی تک ایسا کوئی سلسلہ نہیں بنا۔“ وہ دیکھ لہجے میں بولا۔ ”ہم دونوں میاں بیوی کسی اچھے رشتے کی تلاش ہی میں تھے کہ بجلی اچانک غائب ہو گئی۔۔۔۔۔۔“  
 اپنی بات کے اختتام پر وہ آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔ میں نے شفقی بھرے انداز میں کہا۔  
 ”حوصلہ رکھو خیردین! میں جلد از جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس تم ایک تھکے کوڈھن میں رکھنا کہ کسی بھی مرحلے پر مجھ سے تم نے کوئی غلط بیانی نہیں

کرتا۔۔۔۔۔۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟“  
 ”جی۔۔۔۔۔۔ چنگی طراں سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔  
 میں مزید پندرہ بیس منٹ تک خیردین اور اس کے پڑوسی مقصود سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا مگر اس پوچھ گچھ کے نتیجے میں کوئی بھی ایسی بات سامنے نہ آ سکی جو بجلی کی تلاش میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی چنانچہ میں نے کوٹ ڈوگراں جا کر نقیض کرنے کا فیصلہ کیا اور تاکنے میں بیٹھ کر مذکورہ گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ وہی تھا جس میں خیردین اور مقصود علی تھانے آئے تھے۔ میں نے کا نشیمل باسٹ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔  
 جیسا کہ میں نے بتایا، میرے تھانے سے موضع کوٹ ڈوگراں کم و بیش چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت ہمارا تاکہ مشرق سے مغرب کی سمت کے راستے پر رواں دواں تھا۔ مذکورہ راستہ کھیتوں کے بچوں سے گزرتا تھا۔ میں خیردین کے ساتھ تاکنے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور ہمارے درمیان بجلی بھٹکی ٹنگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس دوران میں ہمارے پیچ جو باتیں ہوئیں ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔  
 جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا، شازبہ عرف بجلی خیردین کی اگلی اولاد تھی۔ بجلی کی پیدائش کے وقت دانی کی کسی کوٹا ہی کے باعث نقیض کے نظام تولید میں کوئی خشکی خرابی پیدا ہو گئی تھی جس کے سبب نقیض مزید کوئی بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی لہذا وہ میاں بیوی اپنی اگلی اولاد بجلی تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔  
 اگلی اولاد کی پرورش ایک کھنن اور پیچیدہ کام ہے۔ اپنی اوقات اور حیثیت کے مطابق خیردین اور اس کی بیوی نے بڑے لاڈ اور پیار سے بجلی کی پرورش کی تھی۔ اس کے خوب ناز و نگرے اٹھائے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کافی حد تک مضبوط اور خودمختار ہو گئی تھی۔ اس پر بجلی کے مزاج کی تیزی و طراری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ وہ ایک پارا صفت، من مانی کرنے والی پٹاؤ قسم کی لڑکی کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی۔ پورے کوٹ ڈوگراں میں بجلی کے بچے تھے۔  
 خیردین قیام پاکستان کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ وہ اس وقت جس مکان میں رہائش پذیر تھا وہ گورنمنٹ کی طرف سے اسے الاٹ کیا گیا تھا۔ اس کے حصے میں دو تین ایکڑ زمین بھی آئی تھی جو بعد ازاں اس

نے فروخت کر دی تھی کیونکہ زمیندار ہی اس کے بس کا کام نہیں تھا۔ زمین کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے اس نے مکان کے سامنے والے کمرے میں پرچوں کی دکان کھولی تھی۔ یہ کمرہ اصل مکان کی چھٹک تھا جو اب کرایہ اسٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ آباد کاری کے وقت بعض شاطر لوگوں نے حکومتی عملے کے ساتھ ساز باز کر کے بہت زیادہ فائدے اٹھائے تھے۔ انہوں نے درجنوں سیکڑوں ایکڑ اراضی اور کئی مکان اپنے نام الاٹ کر لیے تھے لیکن مہاجرین کی اکثریت کے ساتھ خیردین جیسا یا اس سے بھی زیادہ بدتر سلوک کیا گیا تھا۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک پورے ملک میں کمزور کے ساتھ نا انصافی اور تنگی کا رویہ ایک عام بات ہے اور اب اسے روزمرہ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا ہے۔ کاش! اس ارض پاک کو کوئی ایسا صاحب بصیرت تھکراں مل جائے، عدل و انصاف جس کی گھٹی میں شامل ہو۔۔۔۔۔۔  
 خیردین کا کنبہ مختصر اور زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ دن بھر پرچوں کی دکان چلاتا تھا جس سے ہونے والی آمدنی ان تین افراد کی ضروریات کے لیے بہت کافی تھی۔ وہ مہینے میں ایک بار رسول پور تارڑ اور حافظ آباد کا پتھر لگایا کرتا تھا۔ یہ خالصتاً کاروباری نوعیت کا پتھر ہوتا تھا۔ وہ رسول پور تارڑ اور حافظ آباد کی ٹھوک کی مارکیت سے اپنی دکان کے لیے سودا وغیرہ خرید کر لایا کرتا تھا۔ زندگی اس دن و سکون سے گزر رہی تھی کہ ایک بچہ چلا، شازبہ عرف بجلی گھر سے غائب ہے۔  
 ☆☆☆  
 دس بجے ہم کوٹ ڈوگراں میں تھے۔ وہ بچپن جیولائی کا دن تھا۔ سادوں کی شروعات ہو چکی تھی۔ آج صبح ہی سے مظلوم ابراؤ کوڈ تھا۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے اس وقت بھی بجلی پھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ بادلوں سے ڈھکے آسمان نے دھوپ کے راستے میں ایک نامعلوم سی دیوار چھین اٹھا رکھی تھی۔ خیردین کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد میں مذکورہ گھر کے اندر تھا۔  
 وہ آٹھ مرلے کا ایک کشادہ مکان تھا۔ کراچی کے رہائشی اس مکان کے رقبے کو کم و بیش دوسو گز سمجھ لیں۔ مکان کی چھٹک میں خیردین نے پرچوں کی دکان کھول رکھی تھی۔ جس کا ایک دروازہ گلی میں اور دوسرا گھر کے اندرونی حصے کے صحن میں کھلتا تھا۔ داخلی دروازے سے اندر آئیں تو ایک کشادہ صحن سے سامنا ہوتا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں تین کمرے تھے جن میں دو پہلو پہ پہلو اور ایک سائڈ میں بنا ہوا



تھا۔ اس سانڈ والے کمرے کے ساتھ ہی باورچی خانہ تھا۔ یہ پورا مکان بجلی سے چلنے والا تھا اور خاصا ہوا دار تھا۔

خیر الدین کی بیوی بقیس ایک پست قامت خالص گھریلو عورت تھی، سادگی جس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خیر الدین سے اسے راستے میں کافی بات چیت کر چکا تھا لیکن کام کی کوئی بات میرے ہمتے نہیں لگی تھی۔ اس حوالے سے بقیس نے بھی مجھے خاصا مایوس کیا۔ ان دونوں میاں بیوی سے حاصل ہونے والی معلومات کسی بھی ذرا بے سے گمشدہ بجلی کی بازیابی کے سلسلے میں کارآمد نظر نہیں آتی تھیں۔ دونوں کا بیان ملتا جلتا تھا۔ رات کو وہ تینوں گھر کے کچن میں سوئے تھے۔ لگ بھگ نصف شب بوند باندی کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے اپنی چار پائیاں برآمدے میں لگا لیں اور گہری نیند سو گئے۔ صبح جب بقیس کی آنکھ کھلی تو بجلی اپنی چار پائی پر موجود نہیں تھی۔ بقیس نے خیر الدین کو چکا کر صورت حال سے آگاہ کیا اس کے بعد بجلی کی تلاش کا آغاز ہو گیا۔ وغیرہ!

”جب آپ لوگوں نے دیکھا کہ بجلی غائب ہے تو کیا تم دونوں میں سے کسی نے گھر کے داخلی دروازے کو چیک کیا تھا؟“ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”جی تھانے دار صاحب۔“ بقیس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بجلی کو گھر کے اندر نہ پا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا تھا اور وہ دروازہ بند تھا۔ اندر سے کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔“

میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا گھر کے اندر آنے یا باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“ وہ دونوں بیک زبان ہو کر بولے۔ ”نہیں جناب! بس، یہی ایک دروازہ ہے۔“

”مکان میں آمد و شد کا راستہ اگر اندر سے بند تھا اور اس دروازے پر کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجلی مذکورہ دروازے سے نہیں نکلی ہوگی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر کاشییل کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”باسط اتم ذرا چھت پر جا کر گرد و خاک کا جائزہ لے کر آؤ۔“

”اوکے سر۔“ باسط یہ کہتے ہوئے میرے حکم کی تعمیل میں چل پڑا۔

میں نے خیر الدین کے مکان کا سروے کرتے ہوئے اس نے کد کوڈ لیا تھا جو بیٹھک اور ایک اندرونی کمرے کے بیچ میں سے اوپر کو جاتا تھا۔ باسط اسی کچے زینے کی جانب

بڑھا تھا۔ میں نے روئے سخن خیر الدین کی طرف موڑتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے بجلی کی تین گہری سہیلیوں کا ذکر کیا تھا۔ کیا وہ تینوں بھی کوٹ ڈوگر اس ہی میں رہتی ہیں؟“

”جی بالکل۔۔۔۔۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”فرزاند، صدف اور عارفہ جی رہتی ہیں سرکار۔“

”ایک کام کرو۔۔۔۔۔“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”تم ان تینوں لڑکیوں کو یہاں لے آؤ۔ میں ان سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔“

”مجھے امید ہے، ان تینوں میں سے کوئی ضرور بجلی کے غیاب پر روشنی ڈال سکے گی، بس، مجھے ذور کا کوئی ایسا سرا چاہیے جسے پکڑ کر میں دوسرے سرے تک پہنچ سکوں اور مجھے یقین ہے، تلاش کی اس ذور کے دوسرے سرے بجلی سے لازماً ملاقات ہوگی۔“

خیر الدین اس انداز میں گردن کو حرکت دینے لگا جیسے میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔ اس نے فرماں برداری سے کہا۔

”ٹھیک ہے جناب۔ میں ابھی ان تینوں کو بلا کر لاتا ہوں۔“

خیر الدین کے جانے کے بعد میں نے بقیس کی معیت میں گھر کے اندرونی حصے کا بھی جائزہ لے لیا۔ مجھے کسی کمرے سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جو بجلی کی تلاش میں مددگار ثابت ہو سکتا۔ میں تمام کمروں کا گونا گونا جھانک کر برآمدے میں پہنچا تو چھت پر سے باسط کی آواز آئی۔

”ملک صاحب! آپ ذرا اوپر آئیں۔“

”خیریت۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

کاشییل کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بقیس کو ادھر برآمدے ہی میں چھوڑا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے کچے زینے کی جانب بڑھا۔

خیر الدین کے مکان کی چھت عقب سے ایک دوسرے مکان کے ساتھ لی ہوئی تھی۔ میں نے باسط کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”ہاں بھئی باسط! بتاؤ تم مجھے کیا دکھانا چاہتے ہو؟“

وہ مجھے اپنے ساتھ خیر الدین کی چھت سے ملحقہ دوسری چھت کے کنارے پر لے گیا پھر ایک زینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ دیکھیں ملک صاحب۔ یہ زینہ اس پچھواڑے والے مکان کے اندر آتا ہے۔ خیر الدین کے گھر کا کوئی بھی

انجام دہہ شر

خیر الدین کے راستے اس مکان میں یہ آسانی اتر سکتا ہے اور پھر اس مکان کا دروازہ کھول کر باہر جاسکتا ہے۔“

”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو۔۔۔۔۔“ میں نے باسط کی سوچ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے کہا۔ ”بجلی اس راستے کے ذریعے غائب ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟“

”جناب! میرا ذہن تو یہی کہہ رہا ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”بائی آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔“

کاشییل باسط کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس گھر کے اندر اتر کر معلوم کیا ہے کہ وہاں کون رہتا ہے؟“

”نہیں ملک صاحب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کسی کے گھر میں اس طرح داخل ہونا مجھے اچھا نہیں لگا حالانکہ اس زینے سے نیچے اترنا بہت آسان کام ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو باسط۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بلا اجازت یوں کسی کے گھر میں اترنا سراسر غیر اخلاقی اور غیر قانونی فعل ہے۔“

”لحاحی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم باہر کا پچھواڑے والے اس گھر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ میں جب تک بجلی کی ماں کو کریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔ میں جاتا ہوں اس طرف۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں دونوں چھت سے نیچے اتر آئے۔ اس دوران میں بوند باندی کا سلسلہ رک گیا تھا۔ کاشییل خیر الدین کے گھر سے نکلا تو میں بقیس کو لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

”بقیس بی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری بیٹی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے اور میری یہی کوشش ہے کہ جلد از جلد بجلی کو تلاش کر کے تمہارے حوالے کر دوں۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب۔“ وہ مغموم لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“

”اگر میں بجلی کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ تم پر میرا کوئی احسان نہیں ہوگا بقیس بی بی۔“ میں نے اپنا تپ بھرے انداز میں کہا۔ ”بلکہ اس طرح میں اپنا فرض نبھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ باقی جہاں تک تمہاری دعا

کا تعلق ہے تو۔۔۔۔۔“ میں نے تھوڑی دیر کو رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اللہ تو سب کا بھلائی کرتا ہے لیکن انسان اکثر اپنے غلط فیصلوں کے ذریعے اپنا برا کر لیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔۔۔۔۔“

اس نے پلٹیں چھپکا میں پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”تھانے دار صاحب، آپ کی آخری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر تم چاہتی ہو کہ بجلی بازیاب ہو جائے تو تمہیں مجھ سے غلط بیانی نہیں کرنا چاہیے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا سچا اور سچ جواب چاہیے مجھے۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟“

”جی، اب آگئی سمجھ۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے دیکھ لہجے میں بولی۔ ”میں بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میری تو شہید خواہش ہے کہ بجلی ابھی اور اسی وقت مجھے مل جائے۔“

”ابھی اور اسی وقت بجلی نہیں ملی تو بھی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔“

میں نے حوصلہ بخش لہجے میں کہا پھر گھر کے داخلی دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”آج صبح جب تم دونوں میاں بیوی سو کر اٹھے تو دروازہ بند تھا اور اندر سے کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی لیکن بجلی غائب تھی۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“

”جی۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہے۔“ وہ نجف سی آواز میں بولی۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ بجلی گھر کے دروازے سے باہر نہیں گئی۔“

”میں نے مقتول انداز میں کہا۔ ”اور یہ بھی طے ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اگر اس کے ساتھ زور زور دیتی کی گئی ہو تو یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ دونوں اس بجرمانہ کارروائی سے بے خبر رہتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب۔۔۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”چتا نہیں، اس کڑی نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ بس، میں تو یہی دعا کر رہی ہوں کہ اللہ خیر کرے اور میری بجلی صحیح سلامت ہو۔“

”بقیس بی بی! میری بات غور سے سنو۔“ میں نے سمجھیر انداز میں کہا۔ ”مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ



بجلی جہاں بھی ہے، صبح سلامت اور بخیریت ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے مٹی ہے اور میں نے اس کے جانے کا راستہ بھی دریافت کر لیا ہے۔

”کون سا راستہ؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔  
 ”وہ راستہ میں بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس سے پہلے تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا اور..... بہت سوچ کچھ کہ جواب دینا ہوگا کیونکہ اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر بجلی تمہیں بھی نہیں ملے گی۔“

آخری جملہ میں نے اس کے جذبات میں ہلچل مچانے کے لیے ادا کیا تھا۔ اس جملے کا بقیہ پر گہرا اثر ہوا اور وہ تڑپ کر پڑی۔

”تھانے دار صاحب! آپ ایسی بات تو نہ کریں۔ بجلی ہماری بہت ہی لازمی بیٹی ہے۔ ہم اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ درپاسی ہو گئی۔ ”آپ کسی بھی طرح بجلی کو دھونڈ لگائیں۔ میں سوئے رب کی قسم کھاتی ہوں کہ آپ مجھ سے جو بھی سوال کریں گے، میں اس کا سولہ آنے سچا اور حرا جواب دوں گی۔“

”بجلی کی ابھی کہیں منگنی نہیں ہوئی..... اور ابھی تک آپ لوگوں کے سامنے اس کا کوئی رشتہ بھی موجود نہیں۔“ میں نے انہی کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”لیکن حالات و واقعات یہ بتاتے ہیں کہ بجلی اپنی مرضی سے مٹی ہے۔ اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کسی کے ساتھ مٹی ہے..... کسی مرد کے ساتھ۔“

بقیہ میں بی بی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میں نے جو کچھ اٹھایا تھا اس کے حوالے سے بقیہ کے ذہن میں کچھ تھا ضرور۔ وہ چند لمحات تک تپتی ہوئی نظر سے مجھ دیکھتی رہی پھر سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔

”لگ..... کون..... کس کے ساتھ مٹی ہے وہ.....!“  
 ”یہ تو تم نے مجھے بتانا ہے بقیہ میں بی بی!“ میں نے غصہ سے بولے۔ ”میں کوٹ ڈوگراں میں بجلی مرتبہ آیا ہوں۔ یہاں کے کسی مرد سے واقف نہیں ہوں میں۔ تم بتاؤ، کیا بجلی کا گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ کوئی جکر چل رہا تھا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میری بجلی کا کسی مرد میں دھیان نہیں تھا، ہاں البتہ.....!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک مٹی تو میں نے استفسار کیا۔ ”البتہ کیا؟“

”خادم حسین کو چوان کا لڑکا بجلی میں دلچسپی رکھتا تھا۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”لیکن بجلی نے مجھے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

”خادم حسین کے لڑکے کا نام کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اور وہ کیا کرتا ہے؟“

”اس کا نام امیر ہے جی۔“ بقیہ نے بتایا۔ ”اور وہ بس آوارہ گردی کرتا ہے یا پھر بجلی کو کچھ کھنڈی آئیں بھرتا ہے۔“

بجلی کی کشمکش کا معاملہ رفتہ رفتہ ڈھب پڑ رہا تھا۔ امیر کا نام سامنے آنے پر مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ بعد ازاں یہ لڑکا اس کیس کی ایک کڑی ثابت ہوگا۔ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے بقیہ میں بی بی سے پوچھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بجلی بھی امیر میں دلچسپی رکھتی ہو؟“  
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”تم یہ بات اسے دہرائی ہو؟“  
 ”میں نے اور خیر دین نے امیر کے حوالے سے بجلی سے بات کی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”بجلی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ امیر کو پسند کرتی ہے۔ اگر بھی خادم حسین کو چوان یا اس کی بیوی زبیدہ امیر کا رشتہ لے کر آئیں تو ہم انہیں واضح طور پر جواب دے دیں۔ اگر بجلی کی امیر میں ذرا سی بھی دلچسپی ہوئی تو وہ اتنی سخت بات بھی نہ کرتی۔“

”مختلف طور پر تو تمہاری بات بالکل درست ہے بقیہ بی بی۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دل کے معاملات میں منطق اور عقل کی نہیں چلتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بجلی بھی امیر کو پسند کرتی ہو اور اس نے اپنی پسندیدگی کو چھپانے کے لیے اس قسم کی بات کی ہو.....!“

”آپ کی مرضی ہے جو بھی سمجھیں تھانے دار صاحب۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے حقیقت آپ کو بتادی ہے۔“

”تمہارے گھر کے پیچھے کس کا مکان ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہاں بابا جلال رہتا ہے۔“ بقیہ نے بتایا۔ ”آپ

نے یہ سوال کیوں کیا؟“  
 ”تمہارے گھر کی چھت بابا جلال کے گھر کی چھت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے

”بابا جلال فجر کی نماز گاؤں کی مسجد میں باجماعت ادا کرتا ہے ملک صاحب۔“ کانشیل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلے گا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ اسے ابھی طرح یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نہ صرف یہ کہ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا تھا بلکہ اس کی کنڈی بھی چڑھائی تھی۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر وہ کہا پھر بقیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بجلی کس راستے سے مٹی ہے تو پتا چل گیا۔ اب مجھے سراغ لگانا ہے اس بندے کا جس کے ساتھ وہ فرار ہوئی ہے۔ اگر وہ بندہ مجھے مل گیا اور مجھے تعین ہے کہ وہ ضرور ملے گا تو..... بجلی بھی اس کے ساتھ ہی ملے گی۔“

”آپ..... یہ کہنا چاہ..... رہے ہیں کہ.....“ بقیہ بی بی کی بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”بجلی گھر سے بھاگ مٹی ہے.....؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔  
 ☆☆☆  
 اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ بجلی اپنی مرضی سے غائب ہوئی تھی۔ گھر میں اس کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا جو سچا جاتا کہ وہ فرار یا خودکشی کے ارادے سے نکلے ہوگی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی اور یہ ”کسی“ میرے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ بجلی کی کشمکش کا شریک تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر بجلی کو باز یاب کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ یہی ملے تھا کہ وہ ”کسی“ اثر مومن کوٹ ڈوگراں کا وسیع تھا تو وہ بھی بجلی کی طرح گاؤں سے غائب ہوگا۔

لگ بھگ آدھے مہینے کے بعد خیر دین دو لڑکیوں کو لے کر آ گیا۔ ان میں سے ایک صدف اور دوسری عارفہ تھیں۔ خیر دین کے بارے میں خیر دین نے بتایا کہ اس کا بچہ بیمار ہے اس لیے وہ اپنے بچے کو چھوڑ کر گئیں اسٹکی۔ خیر دین شادی شدہ تھی اور اس کا ایک سال کا ایک لڑکا تھا۔ خیر دین کی شادی دو سال پہلے ہی گاؤں کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ صدف اور عارفہ، بجلی کی طرح ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں۔ ان کی عمریں علی الترتیب اٹھارہ اور سترہ سال تھیں۔

میں میں نہیں منٹ تک ان دونوں لڑکیوں کا انٹرویو کرتا رہا لیکن مجھے کوئی بھی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے بجلی کی تلاش میں کوئی مدد مل سکتی۔ امیر کے حوالے سے ان دونوں کا موقف بھی وہی تھا جو بقیہ کا تھا۔ انہوں نے اس

”میں نے تمہاری دیر پہلے کسی دوسرے راستے کا کر کیا تھا۔“ میں سمجھتا ہوں، بجلی تم دونوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے مکان کی چھت پر پہنچی ہوگی اور پھر بابا جلال کے مکان میں اتر کر اس کے دروازے سے باہر نکل گئی ہوگی۔ کیا تم لوگوں نے بابا جلال یا اس کے گھر والوں سے پوچھ چکے؟“  
 ”بابا جلال اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے۔“ بقیہ نے بتایا۔ ”اس نے شادی نہیں کی اس لیے بیوی بچوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے قریبی رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ ہم نے اسے ہمیشہ اکیلا ہی دیکھا ہے۔“

بقیہ کی زبانی مجھے بابا جلال کے بارے میں مزید پتا چلا کہ اس کا اصل نام جمال دین تھا لیکن وہ بابا جلال کے نام سے کوٹ ڈوگراں میں مشہور تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے ستاویز تھی۔ اس نے ایک گدھا پال رکھا تھا جو اس کے لیے سواری اور دھندے کے کام آتا تھا۔ بابا جلال اپنے گھر میں مٹی کے برتن تیار کرتا تھا اور پھر ان برتنوں کو گدھے پر لاد کر گاؤں گاؤں محکم کر انہیں فروخت کر کے اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتا تھا۔ اپنے گھر کے سارے کام معاشی سہولتی اور کھانا پکانا بابا جلال خود اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے حال میں مست رہتا اور اپنے وقت نمازی بھی پڑھتا۔

میں بقیہ بی بی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا کہ کانشیل لوٹ آیا۔ اس دوران میں باسط نے بابا جلال کے بارے میں ابھی خاصی معلومات اکٹھا کر لی تھیں جو بقیہ کے بیان سے لگ کھاتی تھیں۔ باسط نے بابا جلال سے بات بھی کی تھی۔ مجھے کانشیل کے چہرے پر دوبارہ باسا جوش دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس کوئی خاص خبر ہے۔ میں نے ناسے کر کے اسے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بھئی! اھر کی کیا پرٹ ہے؟“  
 ”میرا اندازہ صد فیصد درست نکلا ملک صاحب!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”بجلی آدھی رات کے بعد اور فجر کی اذان سے پہلے ہی وقت اپنے گھر سے بابا جلال کے گھر میں پہنچی تھی اور پھر اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔“

”کیا بابا جلال نے بجلی کو اپنے گھر سے نکلنے دیکھا تھا؟“ میں نے اظہارِ اری لہجے میں استفسار کیا۔ ”یا اس نے بجلی کو چھت سے اپنے گھر میں اترتے دیکھا ہو.....!“  
 ”ایسی کوئی بات نہیں ملک صاحب۔“ وہ رسائییت بھرے لہجے میں بولا۔

میں پوچھے باندہ رکھا۔ ”پھر کیسی بات ہے باسط؟“



اس کی تصدیق کی کہ اصغر، بجلی سے محبت کا دعوے دار تھا لیکن بجلی کو اس کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ اصغر کا یکطرفہ عشق تھا۔ اس صورت حال نے میرے ذہن کو الجھا دیا اور میں خیر دین کے گھر سے نکل کر خادم حسین کو چوان کے گھر کی سمت چل پڑا۔ اصغر، خادم حسین کا بیٹا تھا۔

خادم حسین کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم ایک منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت خادم حسین گھر کے اندر موجود نہیں تھا تاہم اس کی بیوی زبیدہ کو جب پتا چلا کہ میں اس علاقے کا تھا تو اس نے مجھے اور بجلی کی گمشدگی کے حوالے سے گفتیش کر رہا ہوں تو اس نے مجھے اور باسط کو گھر کے اندر بلا لیا۔ ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد اس نے بتایا۔

”خادم حسین تانگا لے کر گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی شام تک ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں زبیدہ بی بی۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تم ہی سے چند سوال کر لیتا ہوں۔ آخر اصغر تمہارا بیٹا بھی تو ہے۔“

میں نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور بولی۔ ”جی، بالکل۔ اصغر میرا اور خادم حسین کا بیٹا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ تو بجلی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں پھر میرے اصغر کا کیا ذکر.....؟“

زبیدہ کی عمر پینتالیس سال رہی ہوگی۔ وہ سانولے رنگ کی ایک فربہ اور پست قامت عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص نوعیت کی ہوشیاری پائی جاتی تھی۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ اصغر کے علاوہ ان کے دو بچے اور بھی تھے اور یہ دونوں لڑکیاں تھیں۔ پندرہ سال کی زبیدہ اور بارہ سال کی نسیم۔ اصغر کم و بیش بیس سال کا تھا۔

”جب تمہارے بیٹے کا نام بجلی کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو پھر بجلی کی گمشدگی پر سب سے پہلے اصغر ہی کا ذکر آئے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ہے کہ نہیں؟“

”یہ کیا بات کر دی آپ نے۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اصغر کا بجلی سے کیا واسطہ.....!“

”واسطہ ہے تو میں تمہارے دروازے تک پہنچا ہوں نا۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے بیٹے کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ اصغر بجلی کے عشق میں گرفتار تھا۔“

”یہ اصغر کا پاگل پن ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ

اکٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں ہزار بار اس نالائق کو سمجھا چکی ہوں کہ عشق و شوق کے چکر میں سوائے خواری کے کچھ نہیں رکھا۔ میں نے کیا کھٹ لیا جو وہ کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے گا۔“

بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں اسی اتر آئی تھی۔ میرے کیریدنے پر اس نے بتایا کہ اس نے خادم حسین سے محبت کی تھی۔ ان کی شادی بھی ہوئی لیکن زبیدہ کے بیان کے مطابق خادم حسین نے اس کی وہ قدر نہیں کی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ پھر زبیدہ کو یہ بھی افسوس تھا کہ خادم حسین میں ترقی کرنے کے جراثیم نہیں تھے۔ وہ کوچوانی میں خوش تھا جبکہ زبیدہ کی خواہشات کہیں زیادہ تھیں۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ عاشقی اصغر کی کھٹی میں شامل ہے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”وہ اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھا رہا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اصغر اندھا ہو گیا ہے جو بجلی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے ورنہ وہ لڑکی اس قابل نہیں کہ اسے کوئی ایسے گھر کی عزت بنائے۔“

یہ ایک نئی بات سامنے آئی تھی۔ میں نے نٹولنے والی نظر سے زبیدہ کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیوں..... بجلی میں ایسی کون سی خرابی ہے کہ اسے گھر کی عزت نہیں بنایا جاسکتا؟“

”بس رہنے دیں تھانے دار صاحب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”میرا منہ نہ کھلوا میں تو اچھا ہے۔“

”میرے خیال میں تم منہ کھول ہی تو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ہو سکتا ہے، میں حقیقت کی تہ میں اتر کر بجلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں.....!“

”پتا نہیں جناب، اس بجلی نے کیسے کیسے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ”پچھلے دنوں تار انے میرے پتر کو سنگین نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔“

زبیدہ بی بی ایک پر ایک انکشاف کیے جا رہی تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ تار کون ہے؟“

”نذیراں ماچھن کا لڑکا۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے

بولی۔ ”نام تو اس کا ستارے لیکن پورے پنڈ میں وہ تار کے نام سے مشہور ہے۔ اکثر لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بڑا

بد معاش بنا پھر تا ہے۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ میں نے اس کے بیان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تار انے تمہارے بیٹے



کو کیوں دمکی دی تھی؟“

”تارار نے اسفر سے کہا کہ بجلی سے دور رہو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ اس نے بتایا۔ ”تارار بجلی کو اپنی جان کا رکتھتا ہے۔“

”میں نے بجلی کے معاملے میں خیر دین اور بقیہ سے تعمیلی بات کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے تارار کا کوئی ذکر نہیں کیا اور تم کہہ رہی ہو کہ تارار بجلی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے؟“

”وہ دونوں اپنی اکلوتی بیٹی کے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولی۔ ”انہوں نے بے جالا ڈیپار سے بجلی کو لگا ڈیا ہے۔ وہ خود اور خدی بن چکی ہے مگر خیر دین اور بقیہ اسے ابھی تک دودھ پیتی معصوم بچی سمجھتے ہیں۔“

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ زبیدہ بجلی اور اس کے والدین کے لیے اپنے دل میں ایسے جذبہ بات نہیں رکھتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ بجلی نے اس کے بیٹے کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس معاملے میں ماہمیں بہت حساس ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کا بچا اپنی منکوحہ میں حد سے زیادہ دیکھی لینے لگے تو انہیں پریشانی لاحق ہو جاتی ہے، بجلی تو پھر بھی ایک غیر لڑکی تھی۔

”زبیدہ؟“ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ”میں تارار کو خود دیکھ لوں گا کہ وہ کتنا بڑا بد معاش ہے۔ ابھی تو میں تمہارے بیٹے سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ بتاؤ اسفر کہاں ہے؟“

”اسفر تو گھر میں نہیں ہے جی۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ اس کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ گھر میں نہیں تو پھر کدھر گیا ہے؟“

”وہ پنڈی بھٹیاں گیا ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کب گیا ہے وہ پنڈی بھٹیاں؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میرا تھانہ یعنی رسول پور تارڑ پنڈی بھٹیاں اور حافظ آباد کے درمیان واقع تھا کہ کوٹ ڈوگرہاں سے پنڈی بھٹیاں جانے کے لیے رسول پور تارڑ سے گزرنا پڑتا تھا۔

”اسفر کل دوپہر میں گھر سے نکلا تھا جی۔“ زبیدہ نے بتایا۔ ”ادھر پنڈی بھٹیاں میں میری بڑی بہن منیہ رہتی ہے۔ اسفر اپنی خالہ کے پاس دو چار دن کے گا۔“

”اسفر کل دوپہر میں گھر سے نکلا اور گزشتہ رات بجلی غائب ہو گئی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا

پھر زبیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بڑا عجیب اتفاق نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ چند لمحات تک متذبذب نظر سے مجھے جھکتی رہی پھر شک آلود لہجے میں بولی۔ ”کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ اسفر بجلی کو بھگوانے گیا ہے؟“

”بالکل، میں ایسا ہی سوچ رہا ہوں زبیدہ بی بی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”آپ میرے پتر کو اس معاملے میں نہ ٹھیکس جی۔ بجلی نے بھی اسے گھاس نہیں ڈالی، اس کے ساتھ بھاگے گی کیسے!“

”میں نے ایک امکاٹی بات کی ہے۔“ میں نے۔۔۔ بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں گہرا رابطہ خفیہ ہو کر بجلی نے اس بات کو گاؤں والوں سے چھپا رکھا ہو۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب۔“ وہ پورے یقین سے بولی۔ ”میں اسفر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کی تسلی کے لیے میں آپ کو صاف کامل ایڈریس دیتی ہوں۔ آپ پنڈی بھٹیاں جا کر چیک کر لیں۔ انشاء اللہ میرا بیٹا آپ کو ادھر ہی ملے گا اور بجلی اس کے ساتھ نہیں ہوگی۔ صنفی آپ کو یہ بھی بتائے گی کہ اسفر کل کتنے بیچے وہاں پہنچا تھا۔“

”وہ تو میں لازمی چیک کروں گا۔“ میں نے محسوس لہجے میں کہا۔ ”دیسے تمہارا کیا خیال ہے، اگر بجلی اسفر کے ساتھ نہیں گئی تو پھر وہ کہاں غائب ہوئی ہے؟“

”میری جوتی جانے وہ کہاں غرق ہوئی ہے۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”اس کہیں نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ جب تک وہ گاؤں میں تھی تو میرے اسفر کو اس نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اب کہیں دلع ہوئی ہے تو پولیس ہمارے دروازے پر آگئی ہے۔۔۔۔۔ پھر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں بولی۔

”میرے سونہرے بچے! ہمیں اس مصیبت سے نکال۔۔۔۔۔!“

میں مزید چندہ میں منٹ تک زبیدہ سے سوال و جواب کرتا رہا کہیں کوئی مفید بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے پنڈی بھٹیاں میں اس کی بہن منیہ کا ایڈریس نوٹ کیا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔

اگر بجلی کسی بھی زاویے سے اسفر میں کوئی دلچسپی نہیں

رکھتی تھی تو پھر ان کا ایک ساتھ کہیں جانا خارج از امکان تھا کیونکہ ان کے کوٹ ڈوگرہاں سے نکلنے کے اوقات میں کم از کم بارہ گھنٹے کا فرق تھا۔

”ملک صاحب! اب کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟“ اس نے مجھے سے پوچھا۔ ”بجلی کا معاملہ تو ایک جگہ آ کر رک گیا ہے۔ کیا آپ دوبارہ خیر دین کے گھر جا رہے ہیں؟“

”اگر خیر دین سے ملاقات کی ضرورت پیش آئی تو ادھر کا پتھر بھی لگا نہیں گے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نی الحال تو میں تارار کی خبر لینا چاہتا ہوں۔ ذرا بتاؤ چلے کہ وہ بجلی کا چوکیدار کیوں بنا ہوا ہے۔ اگر زبیدہ نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو مجھے امید ہے، تارار سے ملاقات خاصی سووند ثابت ہوگی۔“

خادم حسین کو چران کے گھر سے نکلنے ہوئے ملنے زبیدہ سے نذریراں ماچھن کے گھر کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ تارار نذریراں ماچھن کا انکوٹ اور بنگلا ہوا بیٹا تھا اور مہینہ طور پر وہ گاؤں میں غنڈا اگردی کرتا تھا۔

”مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ کانٹھیل نے تائیدی انداز میں کہا۔

اس وقت یونہی باہری کا سلسلہ رکا ہوا تھا تاہم ابھی تک آسمان گہرے بارشوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یعنی کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ نذریراں ماچھن کا گھر زیادہ اور نہیں تھا۔ ہم ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوئے تو ایک دروازہ قامت شخص نے میرے نزدیک آ کر شاکست لہجے میں کہا۔

”السلام علیکم تھانے دار صاحب!“

اس شخص نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور عمر پتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس پر نگاہ پڑنے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن فوری طور پر یاد نہ آ سکا کہ آج سے پہلے ہماری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔

”علیکم السلام!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا نام ماسٹر عیادت ہے۔“ وہ معاملے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بدستور شاکست انداز میں بولا۔

اس نے میری نگاہ میں جیسے استفسار کو پڑھ لیا تھا اسی لیے اس نے اپنا تعارف کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اپنی بات چیت اور انداز سے وہ ایک تعلیم یافتہ اور سمجھ دار انسان لگتا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”ماسٹر صاحب! مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں؟“

”یہ ہماری پہلی ملاقات ہے جناب۔“ وہ رسائیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کچھ دیر پہلے مجھے خیر دین کے گھر کے آس پاس دیکھا ہو۔ جب مجھے پتا چلا کہ تھانے دار صاحب بجلی کی کمشدگی کے سلسلے میں تفتیش کرنے کوٹ ڈوگرہاں آئے ہیں تو میں اپنے گھر سے نکل کر سیدھا خیر دین کے گھر پہنچا تھا لیکن جب تک آپ خادم حسین کے گھر کی طرف چل پڑے تھے چنانچہ میں بھی ادھر ہی آ گیا اور اب آپ سے ملنے کا موقع میسر آ گیا۔“

اس کی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے ٹوٹے والے انداز میں پوچھا۔ ”ماسٹر جی! خیریت تو ہے نا۔ آپ مجھ سے ملنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہو رہے تھے؟“

”خیریت کہاں ہے جناب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس گاؤں سے ایک جوان جہان لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ میں آپ سے اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ بتا چلے، آپ نے بجلی کی تلاش کے سلسلے میں اب تک کیا پیش رفت کی ہے۔۔۔۔۔ لگاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”کوٹ ڈوگرہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ہم سب لوگ یہاں ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اور جی المقدور دوسرے کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ میں جانتا ہوں، بجلی کی کمشدگی پر خیر دین اور بقیہ سخت پریشان ہیں۔ مجھے بھی اس واقعے کا سخت افسوس ہے۔ اگر میں بجلی کی تلاش کے حوالے سے آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو مجھے ضرور بتائیں۔ آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔“

ماسٹر عیادت ایک پر غلوس اور ہمدرد انسان ہونے کے ساتھ ساتھ سخت باتونی شخص بھی تھا۔ بہر حال اس کے اخلاص اور انسان دوستی کے پیش نظر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ماسٹر جی! آپ کی اس پر غلوس پیشکش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اگر آپ کا تعاون بجلی کو ڈھونڈنے میں مفید ثابت ہوا تو یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ کوٹ ڈوگرہاں پر بھی آپ کا احسان ہوگا لیکن اس ذکر پر قدم رکھنے سے پہلے آپ کو چند باتیں ذہن نشین کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کون سی باتیں جناب؟“



”بکلی نثر غائب ہوئی ہے اور نہ ہی اس کی غیر موجودگی کو گمشدگی کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اب تک کی تحقیق کے مطابق وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی اور خوشی سے گئی ہے اور اس امر میں مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ کوٹ ڈوگراں کے کسی دستیک کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے اور ظاہر ہے، وہ جس شخص کے ساتھ بھی گئی ہے وہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں ہوگا۔“ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”اوہ۔۔۔“ وہ ایک پرتشویش اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے تھانے دار صاحب۔ آپ اسی لیے خادم حسین کے گھر گئے تھے کیونکہ اس کا بیٹا اصغر اس وقت کوٹ ڈوگراں میں موجود نہیں۔“

”بالکل ٹھیک!“ میں نے ماسٹر عاتیت کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”بکلی کی ماں نے مجھے بتایا ہے، اصغر بکلی پر بری طرح فریفتہ تھا لیکن اصغر کی ماں نے بتایا ہے کہ بکلی کی۔۔۔ گمشدگی سے بارہ مہینے پہلے اصغر اپنی خالہ سے ملنے پنڈی بھڑیاں چلا گیا تھا یعنی گزشتہ روز دو پہر میں اور اب زبیدہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ تارا بد معاش بھی بکلی پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا اور چند روز پہلے اس نے اصغر کو کوئی خطرہ پاک دیکھی بھی دی تھی۔ اس نے اصغر سے کہا تھا کہ وہ بکلی سے دور رہے یعنی تارا بھی بکلی کا امیدوار ہے اسی لیے میں نذیراں ماچھن کی طرف جا رہا ہوں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”زبیدہ نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی۔ میں نے بھی کئی دو پہر کے بعد سے اصغر کو گاؤں میں نہیں دیکھا اور۔۔۔ تارا کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ جو بچے باپ کی عدم موجودگی میں ہل پڑھ کر جوان ہوتے ہیں ان کی شخصیت میں بہت سی کمی رہ جاتی ہے۔ اولاد کی صحت مند پرورش کے لیے سر پر باپ کا سایہ ہونا بہت ضروری ہے۔ اس سمجھتے نے دو تین بار میرے ساتھ بھی بدتمیزی کی ہے۔ اس کے بعد سے میں نے اس سے کتنا شروء کرو یا ہے۔ تارا کو آپ ایک بکڑا ہوا لڑکا سمجھ لیں۔“

”ماسٹر جی! بکڑے ہوئے انسانوں کو سیدھا کرنا مجھے خوب آتا ہے۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”تارا کی آپ فکر نہ کریں۔ اسے میں دیکھ لوں گا۔ آپ نے رضا کارانہ طور پر تعاون کی پیشکش کی ہے تو پھر اپنا کام بھی سمجھ لیں۔“

وہ ہر تین گوش ہو گیا اور غصے سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تھم کریں جناب۔“

”آپ کوٹ ڈوگراں کے اسکول ماسٹر ہیں۔“ میں نے کہا شروع کیا۔ ”کسی بھی اسکول میں پڑھانے والا وہاں کے ایک ایک فرد سے اچھی طرح واقف۔۔۔“

”قطع کلاہ کی معافی چاہتا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ میں کوٹ ڈوگراں میں بسنے والے ایک ایک بندے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”جب یہاں کوئی اسکول ہی نہیں تو پھر آپ کس چیز کے ماسٹر ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جناب! اصل بات یہ ہے کہ میں اس گاؤں کا واحد پڑھا لکھا آدمی ہوں اس لیے لوگوں نے میرا نام ماسٹر رکھ دیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام تو عنایت ہے مگر کوٹ ڈوگراں میں ”ماسٹر عاتیت“ کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ گاؤں میں ایک اسکول ہو مگر یہاں کے لوگوں میں اپنی اولاد کو پڑھانے لکھانے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو یہاں آکر پچیس گیا ہوں۔ بس، مصدور واپس آجائے، پھر میں چلا جاؤں گا۔“

”کیا آپ کا تعلق کوٹ ڈوگراں سے نہیں ہے؟“ وہ باتوں میں شخص ڈراؤں کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جناب! وہ گاؤں میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کچھ عرصہ پہلے میں اپنے ایک دوست مصدور سے ملنے یہاں آیا تھا۔ پھر ایک روز مصدور کہیں چلا گیا اور میں اس کی راہ دیکھ رہا ہوں لیکن میں جب سے یہاں ہوں، میں نے اس گاؤں میں علم کی شمع روشن کر دی ہے۔ میرے بار بار کے سمجھانے پر کچھ لوگ میرے پاس پڑھنے آنے لگے ہیں مگر وہ سب بڑی عمر کے ہیں۔ آپ میرے اس مشن کو تعلیم بالغان کہہ سکتے ہیں۔“

وہ اللہ کا بندہ شروع ہوتا تھا تو پھر پھر کے کام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر اسٹاپ لگانے کی غرض سے کہا۔

”ماسٹر جی! تعلیم بالغان اور تعلیم طفلان پر ہم پھر کسی وقت فرصت میں تفصیلی بات کریں گے۔ فی الحال، میرے لیے سب سے اہم معاملہ بکلی کو موٹا ڈالنا ہے اور اطمینان کا پتہ یہ ہے کہ آپ کوٹ ڈوگراں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب آپ میری بات دھیان سے سنیں۔“

لٹائی تو وقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی تو وہ بد معاش نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ کل اس کے کہ اس کی زبان کا فٹل کھل جاتا، میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

انجام دہ شہر

”یہ بات تو میں طے کر چکا کہ بکلی گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگی ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ بکلی کو بھگا کر لے جانے والا بندہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں۔ میں نے اصغر کے گھر کو چیک کر لیا ہے اور اب نذیراں ماچھن کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں خیرہ دین کے گھر جاؤں گا۔ آپ کے پاس لگ بھگ ایک گھنٹا ہے۔ اس دوران میں آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس وقت کوٹ ڈوگراں کے کتنے مرد گاؤں میں موجود ہیں ہیں۔ آپ کے لیے یہ کام مشکل تو نہیں ہوگا۔؟“

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے سر کا ہٹائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ تقریباً نہ کریں تھانے دار صاحب۔ میں ایک گھنٹے سے پہلے آپ کو پورٹ پیش کرتا ہوں۔“

”اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنے ذہن میں یہ نکتہ بھی محفوظ رکھنا ہے۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”اصغر اور تارا کے علاوہ گاؤں کا اور کون کون سا مرد بکلی کو پسند کرتا تھا یا یہ کہ بکلی یہاں کے کس بندے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ آپ میری بات تو سمجھ گئے ہوں گے؟“

”جی بالکل۔۔۔“ میں بھی طرح سمجھ گیا تھا تھانے دار صاحب! وہ اپنے منہ میں ہلچلے ہوئے بولا۔

ماسٹر عاتیت کے جانے کے بعد کاشفیل باسط نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ بندہ تو کام کا لگتا ہے۔“

”ابھی صرف لگتا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جب ماسٹر عاتیت کوئی کام کر دکھائے گا، تب اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ بندہ کام کا ہے یا نہیں!“

”یہی آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ملک صاحب!“ باسط نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

جب ہم نذیراں ماچھن کے گھر پہنچے تو وہ اپنے کام سے ”فارغ“ ہو چکی تھی اور تام پھنی کے ایک کتے میں آئے والے ہاتھ دھو رہی تھی۔ نذیراں نے اپنے گھر کے باہر گلی میں دروازے کے قریب ہی خود لگا رکھا تھا جہاں وہ گاؤں والوں کے لیے روٹی لگانے کی خدمات انجام دیتی تھی۔ خود کو اور نور کو بارش اور دھوپ سے بچانے کے لیے نذیراں نے نور کے اوپر ایک چھپرہ سا ڈال رکھا تھا۔ نذیراں کے علاوہ اصل لوگوں نے اپنے گھروں کے اندر بھی خود لگا رکھے تھے۔ نذیراں یہ کام کاروباری بنیادوں پر جاری رکھے ہوئے تھی۔

جو لوگ اس کے حور سے روٹی لگوانے آتے، وہ ان سے اس کام کا باقاعدہ معاوضہ لے کر دیتی تھی۔ یہی اس کا روزگار اور ذریعہ آمدنی تھا۔ وہ درمیانے قد اور بھاری جسم کی مالک ایک خالص دیہاتی تھی۔

نذیراں نے ہمیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سر پر دو پٹا درست کیا اور ہمارے قریب پہنچنے پر اس نے مجھے سلام کیا اور تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”کسی عورت نے ذکر کیا تھا کہ پنڈ میں پولیس آئی ہوئی ہے اور بکلی کی گمشدگی کے مسئلے میں تفتیش کر رہی ہے۔“

”اس عورت نے تمہیں بالکل ٹھیک بتایا ہے نذیراں!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے کے بعد غصے سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا نام ملک مصدور حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔“

”اللہ آپ کو حیاتی دے تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی پھر پوچھا۔ ”بکلی کا کچھ پتا چلا؟“

”ہاں۔۔۔!“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہٹائی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ آپ اندر آجائیں۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کے لیے روٹی پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔“

”اس تکلف کی ضرورت نہیں نذیراں۔“ میں نے اس کی تقلید میں گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بس تم سے چند ضروری باتیں کروں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔“

”نہ جی۔۔۔۔۔ تکلف والی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہمیں برآمدے میں بھیجا چار پانی پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ”آلو گوشت کا سالن میں نے جج ہی تیار کر لیا تھا اور ابھی پانچ منٹ پہلے گرم روٹیاں بھی لگائی ہیں۔ آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں۔ میں کچھ کھلائے پلائے بغیر آپ کو جانے نہیں دوں گی۔“

”صرف تمہارے گھر ہی میں نہیں، میں کوٹ ڈوگراں میں بھی آج پہلی بار ہی آیا ہوں۔“ میں نے گھر کے اندر روٹی حصے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”پلو، میں تمہارا دل رکھنے کے لیے آدھی بات مان لیتا ہوں۔“

نذیراں کا گھر ایک عام سادہ بیانی طرز کا مکان تھا۔ پچھلے حصے میں دو کچے کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے کمرے کے آگے برآمدہ تھا جہاں اس وقت ہم ایک چار پانی پر بیٹھے تھے۔ برآمدے کے بعد وسیع دھریں صحن تھا۔ نذیراں کو



بادرچی خانے وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا تیار کرنے کے لیے اس کا تنور ہی کافی تھا۔ تاہم صحن کی ایک دیوار کے ساتھ میں نے چولہا بنا دیکھا تھا اور اس کے نزدیک ہی چند برتن بھی نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک پینڈ پب بھی نصب تھا جس کے نیچے پتھر کا ایک دھنٹ چوڑا مستطیل ٹکڑا پڑا تھا جو یقیناً برتن اور کپڑے دھونے کے لیے ایک پلیٹ فارم کا کام دیتا تھا۔ گھر کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس وقت ہم تینوں کے سوا اس گھر کے اندر اور کوئی ذی فہم موجود نہیں تھا۔

”آدمی بات والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا نے دار صاحب!“ وہ ابھن زدہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”تم نے کہا کہ کچھ کھلائے پلانے بغیر مجھے جانے نہیں دو گی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”یہی بات کی تھی نا تم نے۔۔۔۔۔؟“

وہ تیزی سے ہلکے چمکاتے ہوئے بولی۔ ”جی!“

”بس تو پھر تمہاری آدمی بات کا مطلب یہ ہوا کہ۔۔۔۔۔“ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”اس“ کھلائے پلانے“ میں سے“ کھلائے“ کو نکال دو اور ”پلانے“ کی مد میں تمہیں ٹھنڈا پانی پلا دو۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے جی۔“ وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ لوگوں کے لیے چائے کی ٹھنڈی ٹمکین لے کر آتی ہوں۔“

اگلے چند لمحات میں نذریراں ماچھن ہمیں کھن دالی ڈانٹتے دار کی سرور کرنے کے بعد ایک موڑھے پر ہمارے سامنے براجمان ہو چکی تھی۔ قبل اس کے کہ میں پوچھتا چھکا آغاز کرتا، اس نے سوال داغ دیا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے باہر مجھے بتایا تھا کہ آپ کو بجلی کا پتا چل گیا ہے۔ آپ نے اسے کہاں سے پکڑا ہے؟“

”ابھی پکڑا نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”صرف اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔“

میرے معنی خیز انداز نے اسے ہر دھڑکھڑا کر دیا، بے صبری سے مستفسر ہوئی۔ ”آپ کو کیا معلوم ہوا ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہی کہ بجلی اس گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھ انداز میں کہا۔ ”وہ لے گیا تو بجلی بجلی مل جائے گی اور۔۔۔۔۔ مذکورہ مرد تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔“

”میں۔۔۔۔۔!“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر متحجب انداز میں مجھے سمجھنے لگی۔ ”آپ بھی بڑی دھڑکی ناپ کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔ نہ میں کیا بجلی کی کوئی چوکیدار لگی ہوئی ہوں جو مجھے اس بات کی خبر ہو کہ بجلی اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگی ہے۔“

بجلی کے ذکر پر نذریراں کے لہجے میں جلی اترا آئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ شارپ عرف بجلی کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے لہجے میں کہا۔

”تم نہ سبکی گھر تمہارا یہاں تو بجلی کا پھرے دار بنا بیٹھا ہے نا۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ وہ ایک بیک پریشان ہوئی۔ ”نہ میرے تارا کا بجلی سے کیا لینا دینا۔ آپ اسے بجلی کے ساتھ تھی کیوں کر رہے ہیں؟“

”جو کرنٹ اور تار کا رشتہ ہے وہی نا بجلی اور تارا کے بیچ بھی ہے۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا پتا اس گاؤں میں بدعاشی کرتا بھر رہا ہے اور خود کو بجلی کا گھبرانہ بھستا ہے۔ اس نے خادم حسین کو چوان کے لڑکے امیر کو دھکی دی تھی کہ وہ بجلی سے دور رہے ورنہ وہ امیر کا حشر کر دے گا۔ اس کی خیر ناک باتیں تو وہی شخص کر سکتا ہے جو بجلی کو اپنی جائز بھٹا ہوا ورم کسب دے ہو کہ تارا کا بجلی سے کیا لینا دینا۔۔۔۔۔؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ کلفت زدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”آپ۔۔۔۔۔ کو کسی نے۔۔۔۔۔ غلط بتایا ہے تھانے دار صاحب، تارا کو کوئی فحش بدعاشی نہیں۔ بس، وہ ذرا غصے کا شکار ہے۔ غلط بات برداشت نہیں کرتا۔ فوراً مرنے مارنے پر تھل جاتا ہے اور جہاں تک بجلی کا معاملہ ہے تو۔۔۔۔۔“ وہ سانس بھرا کر بجلی کی غرض سے جلی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”بجلی اس گاؤں کی لڑکی ہے۔ اگر اسے خود اپنی عزت کا خیال نہیں تو اس میں میرے بچے کا کیا قصور۔ امیر اگر بجلی کے لیے بھجوں بنا پھرتا ہے تو یقیناً بجلی ہی نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ تارا کی نہ تو امیر سے کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی اس کا بجلی سے کوئی تعلق واسطہ ہے۔ تارا نے امیر کو شخص اس لیے ڈرانے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ گند خانہ ختم ہو۔ کوٹ ڈوگر اس کے اور بھی گھروں میں جوان لڑکیاں پلٹی ہیں۔ امیر، بجلی کی محبت میں جس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتا ہے اس سے گاؤں کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ بس، اتنی ہی بات ہے جی۔“

انجاء ہر شر

”تمہارا بیٹا کتنا شریف اور کتنا بدعاش ہے اس کا اندازہ میں خود لگا لوں گا۔“ میں نے اس کی منطقی وضاحت کو گھر نظر انداز کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے بتا دو یہ کہاں؟ اس گھر میں تو وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔۔۔!“

”تارا منڈھورا کلاں گیا ہوا ہے۔“ نذریراں نے جواب دیا۔

منڈھورا کلاں نامی وہ گاؤں موضع کوٹ ڈوگر اس سے دو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔ کوٹ ڈوگر اس سے منڈھورا کلاں تک پندرہ بیس فٹ چوڑا ایک سوا (چوٹی نہر) کا تار تھا اور منڈھورا کلاں اسی سوئے کے کنارے پر آباد تھا۔ نذریراں کے جواب نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وہ منڈھورا کلاں کب گیا ہے؟“

”آج صبح جی۔“ اس نے بتایا۔

”وہ منڈھورا کلاں کس سے ملے گیا ہے؟“ میں نے نذریراں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اور اس کی واپسی کب تک ہوگی؟“

”بھول گیا ہے، وہ آج شام ہی کو لوٹ آئے اور یہ بھی کہ وہ کل واپس آئے۔“ نذریراں نے عام سے لہجے میں بتایا۔ ”منڈھورا کلاں میں تارا کا ایک دوست منظور حسین رہتا ہے۔ تارا اسی کے پاس گیا ہے۔“

تارا کے گاؤں سے غیب نے مجھے بہت دور تک پہنچے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اپنے خدشات کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

”تارا آج صبح کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟“

”وہ آرام سے ناشا کر کے گیا ہے تھانے دار صاحب۔“ نذریراں نے نظریے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”میرا خیال ہے، وہ آٹھ بجے کے قریب گیا ہے۔“

بجلی نصف شب کے بعد اور اذان فجر سے پہلے کسی وقت اپنے گھر سے نکلی تھی۔ اگر بجلی اور تارا کی روانگی میں کوئی تعلق تھا تو پھر بجلی نے تین چار گھنٹے تارا کے بتائے ہوئے کسی مقام پر گزرا ہے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ کسی سمت روانہ ہو گئے ہوں گے۔ یہ میرا ایک مفروضہ تھا۔ ابھی تک میں بجلی اور تارا کے درمیان کسی سنجیدہ ربط غلطی کا سراغ نہیں لگا پایا تھا۔

”تھانے دار صاحب!“ مجھے ادھر مرن کی کیفیت میں جہاد کچھ گزندہراں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اگر آپ یہ سمجھ

رہے ہیں کہ میرا تارا بجلی کو بھگا کر کہیں لے گیا ہے تو آپ بالکل غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔ آپ اپنے کسی بندے کو منڈھورا کلاں پہنچ کر میرے بیان کی چھائی کو آزمائیں گے۔“

”میں ایسا بھی کروں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”لیکن فی الحال تم کان کھول کر میری ایک بات سن لو نذریراں۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

”تارا منڈھورا کلاں سے جیسے ہی واپس آئے تم نے بجلی فرصت میں اسے سیدھا رسول پور تارڑ بھیجا ہے۔ میرے پاس تھانے میں۔ باقی کے سوال جواب میں تارا سے ادھر تھانے ہی میں کروں گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ چلتی طراں سمجھ گئی تھانے دار صاحب۔“

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں جانتی ہوں، میرا تارا بے قصور ہے اس لیے مجھے تھانے پکھری سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”اگر واقعی ایسا ہے تو پھر تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی کسی بے قصور کے ساتھ زبردستی نہیں کی لیکن اگر تمہارا بیٹا کسی بھی حوالے سے بجلی کی کشیدگی میں ملوث پایا گیا تو پھر تم مجھے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا۔“

”منظور ہے۔۔۔۔۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی پھر قدرے عنادمت بھرے انداز میں بتایا۔ ”میں جانتی ہوں، تارا بڑا دکھا لڑکا ہے مگر آپ اس کے بارے میں جیسا سوچ رہے ہیں وہ ویسا نہیں ہو سکتا۔“ لگائی توقف کر کے اس نے ایک ٹھنکی ہوئی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”تارا چار پانچ سال کا تھا جب اس کے باپ کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نے اسے کتنی مشکلوں اور مصیبتوں سے پالا ہے یہ میں جانتی ہوں یا پھر میرا خدا جانتا ہے۔۔۔۔۔!“

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تارا کے باپ کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

”شوکت علی کو کھیتوں میں زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ جن بچوں کے سر پر والد کا سایہ موجود نہ ہو ان کی پرورش کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تارا کی عمر اس وقت تھی ہوگی؟“

”وہ خیر سے پچیس سال کا ہو گیا ہے۔“ اس نے



جواب دیا۔  
 ”تمہارا اپنا کوئی کام دوسرے بھی کرتا ہے یا سارا دن دوسرے  
 دوسرے آوارہ رہی حکومت چھوڑتا ہے۔“  
 ”کام تو وہ کوئی نہیں کرتا تھا۔ دار صاحب۔“ وہ  
 شرمندہ لہجے میں بولی۔ ”اور میں نے بھی اس پر زور نہیں  
 دیا۔ میں اتنا کرتی ہوں کہ اللہ کا شکر ہے۔ ہم دونوں ماں  
 بننے کا اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔“  
 ”بچپن سال اچھی خاصی عمر ہوتی ہے نذیراں۔“  
 میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تک تو تارا کو تمہارا سہارا  
 بن جانا چاہیے تھا۔ کل کلاس جب تم اس کی شادی کرو گی تب  
 کیا ہوگا؟“

میرے سوال میں سوچنے والے دماغ کے لیے بہت  
 سامواں بھرا ہوا تھا۔ نذیراں نے میری بات کو توجہ سے سنا  
 پھر بے پروائی سے بولی۔  
 ”کل کی کل دیکھی جائے گی تھا۔ دار صاحب۔“  
 ”کل کی کل تو دیکھی ہی جائے گی نذیراں! میں نے  
 اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جتنی خیر انداز میں کہا۔“ اور  
 کل تم نے ایک اہم کام بھی کرتا ہے۔“  
 ”کون سا کام؟“ وہ ابھرنے لگا۔  
 ”تارا کو میرے پاس تھا۔ یہ سبھیجے کا کام۔“ میں نے  
 تاکید کی انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے، اس سلسلے میں تم کوئی  
 کوتاہی نہیں کرو گی۔“

”آپ اطمینان رکھیں تھا۔ دار صاحب۔“ وہ  
 بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میں آپ کو یاس نہیں کروں گی۔“  
 میں نے نذیراں کی بات پر بھروسہ کر لیا اور اس کے  
 گھر سے نکل کر خیر دین کے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔  
 میں آج صبح سے اب تک کوٹ ڈوگرہ میں دوسرے  
 دوسرے چکراتا پھر رہا تھا اور میری اب تک کی تفتیش کے نتیجے میں  
 دو مشکوک افراد سامنے آچکے تھے جن پر بجلی کی گمشدگی کے  
 حوالے سے شک کیا جاسکتا تھا یعنی خادم حسین کوچان کا بیٹا  
 اصغر اور نذیراں کا چچا تارا۔ ان دونوں بندوں میں  
 تین چیزیں مشترک تھیں۔ نمبر ایک، دونوں آوارہ گرد درجہ  
 اول تھے۔ نمبر دو، دونوں اس وقت کوٹ ڈوگرہ میں موجود  
 نہیں تھے۔ نمبر تین، دونوں کسی نہ کسی انداز میں گمشدہ بجلی کی  
 ذات میں دلچسپی رکھتے تھے۔  
 جب میں خیر دین کی گلی میں داخل ہوا تو وہاں ماسٹر  
 عنایت مجھے نظر آگیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ فوراً میرے  
 نزدیک آگیا اور دار و زار انداز میں کہنے لگا۔

”تھا۔ دار صاحب! آپ کے حکم کے مطابق میں  
 نے کام کر دیا ہے۔“  
 ”کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”رپورٹ یہ ہے جناب۔۔۔۔۔۔ وہ مختلا نظر سے دیکھ  
 یا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت گاؤں سے صرف دو  
 بندے غیر حاضر ہیں۔“  
 اس کے پر اسرار انداز نے مجھے نے جھنجھکی میں مبتلا  
 کر دیا۔ میں نے انہماکی سے اسے استفسار کیا۔ ”اور وہ دو  
 بندے کون ہیں؟“  
 اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔  
 ”اصغر اور تارا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔  
 ”مجھے لگتا ہے، انہی دو میں سے کسی ایک کا بجلی کی  
 گمشدگی میں ہاتھ ہے۔“ ماسٹر عنایت نے گہری سنجیدگی سے  
 کہا۔ ”اور یہ دونوں بجلی کے امیدوار بھی ہیں۔ میرے مختلا  
 انداز سے کے مطابق گاؤں کا اور کوئی وسیلہ بجلی میں اتنی  
 گہری دلچسپی نہیں رکھتا تھا کہ اسے ہنگامہ کر لے جائے۔ اگر  
 آپ ان دونوں پر تھوڑی سختی کریں گے تو ان کی زبانیں بچ  
 اٹھنے پر مجبور ہو جائیں گی۔“  
 ”آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں ماسٹر جی۔“ میں نے  
 سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں بھی کچھ ایسا ہی  
 محسوس کر رہا ہوں۔ میں اصغر اور تارا کو تفتیش کی بجلی میں ایسا  
 پیسوں گا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔  
 بہر حال، آپ کے تعاون کا شکریہ ماسٹر جی۔“  
 ”شرمندہ نہ کریں تھا۔ دار صاحب۔“ وہ بڑے  
 انکسار سے بولا۔ ”تو میرا فرض تھا۔ میری خواہش ہے کہ  
 آپ جلد از جلد بجلی کو بازیاب کرنے میں کامیاب  
 ہو جائیں۔ اس سلسلے میں آپ کو جب بھی میرے تعاون کی  
 ضرورت ہوگی، میں حاضر ہوں جناب۔“  
 میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے سلام  
 کر کے رخصت ہو گیا۔  
 خیر دین کے لیے میرے پاس کوئی ایسی خبر نہیں تھی  
 جسے سن کر وہ بجلی کے حوالے سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ میں نے  
 تسلی اور خوشی کے کارڈ دکھائے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”خیر دین! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔  
 بجلی کی تلاش کے سلسلے میں، میں نے ابتدائی تیاری کر لی  
 ہے۔ انشاء اللہ! کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں  
 تمہیں کوئی خوش خبری سناؤں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھا۔ دار  
 صاحب۔“ وہ جذبات سے مغلوبہ آواز میں بولا۔  
 ”حاصلہ رکھو خیر دین۔“ میں نے اس کا کا ندھا۔۔۔۔۔۔  
 ”میں نے اس کا کا ندھا۔۔۔۔۔۔“  
 ”امید کا دامن مضبوطی سے تھا۔ رکھنے والوں ہی کو  
 کامیابی ملتی ہے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بجلی کو اور وہ  
 اس کے ساتھ لے کر اس بندے کو بہت جلد تمہارے سامنے  
 لا کر آ کر دوں گا۔“  
 خیر دین اور اس کی بیوی بقیس جمولی بھر بھر کر مجھے  
 دعا میں دینے لگے۔ میں شام سے تھوڑی دیر پہلے واپس  
 گھر آ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے اسے ایس آئی سلیمان شاہ کو زبیدہ  
 کی بڑی بہن صفیہ کا ایڈریس سمجھا کر پنڈی بھٹیاں روانہ  
 کر دیا تاکہ وہ اصغر کے بارے میں مستند معلومات حاصل  
 کر سکے۔ میں نے اسے ایس آئی کو تاکید کر دی تھی کہ جو  
 بھی صورت ہو، اصغر کو ساتھ لے کر آئے اور اگر بجلی اسی  
 کے ساتھ ہے تو دونوں کو فوراً سے پشتر لائن حاضر کرنا ہے۔  
 میری اب تک کی تفتیش کی روشنی میں اصغر کے بجلی کو  
 ہنگامہ لگانے کے لیے ایک کامیاب راستہ ابھرنے لگا تھا۔  
 ”میں نے اسے ایک کامیاب راستہ دکھایا تھا۔“

دوسرا مشکوک بندہ ستار عرف تارا تھا۔ نذیراں  
 ماچن نے مجھ سے جس اعتماد کے ساتھ مشکوک تھی اس سے یہ  
 امید کی جاسکتی تھی کہ تارا جیسے ہی مندرجہ بالا سے لوٹے گا،  
 نذیراں اسے میرے پاس بھیج دے گی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو  
 پھر میں نے تارا کی تلاش اور واپسی کے لیے اپنا بندہ دوڑا دینا  
 تھا۔ وہ کوٹ ڈوگرہ میں ہوتا یا مندرجہ بالا میں، مجھ سے  
 بچ نہیں سکتا تھا۔

مشکوک افراد کی فہرست میں کسی حد تک بابا جلال بھی  
 شامل تھا اس لیے میں نے کوٹ ڈوگرہ سے واپسی سے  
 پہلے اس سے ایک بھر ملاقات کی تھی اور اس کے گھر کے  
 اندر دلی جیسے کو بھی چیک کر لیا تھا لیکن بابا جلال شک کے  
 دائرے سے باہر نکلا تھا۔ بابا جلال کی عمر ساتھ سے متاثر تھی  
 اور دو سوچ وقت نمازی ایک پر ہی گزار دیتا تھا۔ اسے چیک  
 کرنے کا سبب یہ تھا کہ بجلی اپنے گھر کی صحت سے اس کے  
 گھر کے اندر اتنی تھی اور بابا جلال غیر شادی شدہ تھا۔ بس  
 یہی ایک نکتہ تھا جو پولیس کی تفتیش کو اس کی ذات کی طرف

موڑتا تھا کیونکہ تفتیش کی گاڑی شک کے بیڑوں سے چلتی  
 ہے اور کسی جرم کی تحقیق کے لیے بعض اوقات ہمیں اپنے بچے  
 والدین پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال، میری پوچھ بچھ  
 کے نتیجے میں بابا جلال بجلی کی گمشدگی کے معاملے میں ملوث  
 نہیں پایا گیا تھا۔

میں تھا۔ میں بیٹا بجلی کے بارے میں سوچ رہا تھا  
 کہ آسان پر بجلی چکی اور بارش شروع ہوئی۔ ساون کے مہینے  
 کا یہی طراز ہوتا ہے۔ پچھلے کئی روز سے برسات کا سلسلہ  
 جاری تھا اور اسی برسات نے بجلی کی تلاش کی راہ میں سب  
 سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ اگر مطلع صاف اور موسم  
 خشک ہوتا تو میں کھرا کال کر بجلی کا سراغ لگ سکتا تھا۔ بجلی جس  
 رات گھر سے غائب ہوئی تھی اس رات وقفے وقفے سے  
 بارش ہوئی رہی تھی لہذا اس کے پاؤں کے نشانات کا ملنا ممکن  
 نہیں رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کاشمیل باسٹ بھی میرے پاس  
 آ بیٹھا۔ گزشتہ روز وہ میرے ساتھ رہا تھا اور میں نے بجلی کی  
 تلاش کے سلسلے میں جو بھی قانونی کارروائی کی تھی اس سے وہ  
 اچھی طرح واقف تھا۔

”ملک صاحب! اس بارش نے ہمارے کام کو بہت  
 مشکل بنا دیا ہے۔“ وہ میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر  
 جھانکتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ ہم کھرا کال کر بجلی کے فراہم  
 سم کا نہیں ہر سانی کر سکتے تھے۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں باسٹ! میں  
 نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یاس  
 نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی میں کوئی ایسا راستہ مل  
 جائے گا جو سیدھا بجلی تک پہنچا دے گا۔“

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔  
 ”لیکن فی الحال تو ہم اصغر اور تارا کی واپسی کا انتظار کرنے  
 کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”کسی حد تک میں تمہاری اس بات سے بھی اتفاق  
 کرتا ہوں۔“ میں نے رسیانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ  
 ٹھیک ہے کہ فی الحال ہم عملاً کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے  
 لیکن ہمارے سوچنے پر تو کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ جب  
 تک اصغر اور تارا ہمارے قابو میں نہیں آ جاتے ہیں بجلی کے  
 فراہم کے محرمات پر غور کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، یہ غور و فکر  
 ہمیں کسی ایسے راستے پر لے جائے جہاں بجلی سے ملاقات  
 ہو جائے۔“

”آپ کی بات میں دم ہے ملک صاحب لیکن فی



فریک ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”ملک صاحب! سادہ لباس! الہکار سے کیا کام لیتا ہے؟“

”جب تک تم خیر دین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف رہو گے اس دوران میں وہ سادہ لباس پولیس الہکار کوٹ ڈوگراں میں محکمہ پھر کر میری ضرورت کی معلومات اٹھائی کرے گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم آئیں بند کر کے ماسٹر عیادت کی باتوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اگر اس نے دانستہ کوئی غلط بیانی نہ کی کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ اس کی فراہم کردہ معلومات میں کوئی کمی روکھی ہو۔ ہو سکتا ہے، امصر اور تارا کے علاوہ کوئی اور بندہ بھی گاؤں سے غائب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور شخص کا بھلے کے ساتھ رابطہ ضبط عمل کر سائے آجائے۔ مطلب یہ کہ ہمارے اس سادہ لباس الہکار نے بجلی اور اس کے گاؤں کے معاملات کا کوئی لگانا ہے۔“

”میں اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب۔“ باسط بڑے اہتمام کے ساتھ بولا۔

”ایک بات اور.....“ میں نے پرسوز انداز میں کہا۔ ”اگر اس دوران میں تارا منڈھورا کلاں سے واپس آجائے تو تم نے اسے اپنے ساتھ تھانے لانا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!“ وہ سنبھلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں شام سے پہلے آپ کو کوئی خوش خبری سنائوں گا۔“

”شاہ باسٹ! میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔“ مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔“

”آپ کا بہت شکریہ ملک صاحب۔“ وہ ممنونیت برے لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ مجھ پر اعتماد کر کے اس مشن پر روانہ کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ! میں آپ کو چارڈلٹ دوں گا۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے باسط!“ میں نے گہری تنہائی کی سہک کہا۔

باسط کے جانے کے بعد میں بجلی کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی بارش تیز ہوتی اور کبھی ہلکی پھور تک محدود ہو کر رہ جاتی تاہم اس نے صبح سے لے کر اب تک وقفہ نہیں کیا تھا۔ بارش کو اللہ کی رحمت کہا جاتا ہے۔ ان برساتی لمحات میں، میں اپنے رب سے دعا کرتا کہ وہ اپنی رحمت اور کرم سے بجلی کی پراسرار کشیدگی والے معاملے کو میری نگاہ میں آشکار کر دے۔ اگر کبھی بات کی جائے تو حقیقت یہی تھی کہ ابھی تک میں نے بجلی کی تلاش

موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بجلی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گھر سے نکلی ہے۔

”میں تو پھر میری عجیب بات کے مطابق.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”ہو سکتا ہے، بجلی امصر یا تارا میں سے کسی ایک گدھے کو کھاس ڈالتی ہو اور وہ اسی کے ساتھ بھاگی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماسٹر عیادت کی تحقیق میں کوئی سقم موجود ہو۔ میں ممکن ہے کہ امصر اور تارا کے علاوہ بھی کوئی شخص کوٹ ڈوگراں سے غائب ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بجلی اسی تیرے گدھے کے ساتھ کی ہو۔“

”آپ کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے ملک صاحب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”دو گدھوں کا نام پتا ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ ہمیں کسی تیسرے گدھے کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔“

”بالکل!“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”اور اس مشن کی ذمہ داری میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

”آپ جو بھی حکم کریں، میں تیار ہوں۔“ وہ توانا لہجے میں بولا۔

”میرے خیال سے تمہیں ابھی اور اسی وقت کوٹ ڈوگراں روانہ ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کارٹھیل باسط کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر! اپنے ساتھ ایک سادہ لباس الہکار کو بھی لے جانا۔ چھوٹی دسے داریوں کی تفصیل سمجھ اس طرح ہے.....“ کھاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی تم سادہ لباس الہکار کو خود سے الگ کر دینا۔ کوٹ ڈوگراں میں بسنے والے لوگوں کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اس الہکار کا تعلق محکمہ پولیس سے ہے اور یہ کہ وہ تمہارے ساتھ گاؤں پہنچا ہے۔“

”میں یہ کر لوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”تم نے خیر دین کے گھر میں ڈیرا بجا کر بیٹھ جاا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے علاوہ تم خادم حسین کو چوان اور نذر راں ماچھن سے بھی بات چیت کر سکتے ہو۔ تم یونیفارم میں ہو گے لہذا انھیں ہر بندے کو یہ یقین دلانا ہے کہ بجلی کی تلاش کا سلسلہ زور و خور سے جاری ہے۔ بہت جلد بجلی کو ڈھونڈ لیا جائے گا۔ اس دوران میں جو بھی اہم بات نظر آئے اسے ذہن نشین کرتے جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے؟“

”جی!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”بالکل

الحال تو آسانی بجلی ہی ہمیں اپنی جھک دکھا رہی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”ذہنی بجلی کا تو دور دور تک نام نشان نظر نہیں آ رہا.....“

”باسط! بابوسی ایک سنگین گناہ ہے۔“ میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”ہمیشہ تاریکی کے بطن ہی سے روشنی پھوٹی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ہم اندھیرے میں کھڑے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہم ہمیشہ اندھیرے ہی میں کھڑے رہیں گے۔ تم دیکھ لیتا، ہماری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی تاریکی بھی بہت جلد چھٹ جائے گی۔“

”میں مایوس اور افسردہ نہیں ہوں ملک صاحب۔“ وہ اپنی ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم بجلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن فی الحال بجلی نے کوٹ ڈوگراں کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہنوں کو بھی بری طرح الجھا کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے بجلی کے فرار کے محرکات کی بات کی ہے نا.....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر ایک پوجمل سانس خارج کرنے کے بعد سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”بجلی کو اپنے گھر کے اندر کوئی تکلیف نہیں تھی جو یہ سوچا جائے کہ وہ گھریلو حالات سے ٹک ہو کر کہیں چلی گئی ہے۔ اب آج اگر کسی آشنا کے ساتھ فرار ہونے کا امکان ہی باقی رہ جاتا ہے لیکن ابھی تک اس کے کسی آشنا کا تعلق بھی نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں دو نام سامنے آئے ہیں اور یہ دونوں دن و سہ ٹریفک کی طرح ہیں۔ امصر اور تارا کی بجلی میں دلچسپی کا سراغ تو مل گیا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل سکا کہ بجلی بھی ان کے ساتھ خفیہ بھی یا نہیں؟“

”تمہارا تجزیہ سولہ آنے درست ہے باسط!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کہ چیزیں عموماً ہمیں جیسی نظر آتی ہیں، درحقیقت ایسی ہوتی نہیں ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں ملک صاحب۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بڑی عجیب بات کی ہے۔“

”یہ بات عجیب ضرور ہے لیکن اس کے اندر زندگی کی اصلیت کا فلسفہ چھپا ہوا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو کہ بجلی اپنی مرضی سے کوٹ ڈوگراں کے کسی بندے کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے؟“

”جی جناب! اس میں تو کوئی دو رائے نہیں ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہمارے پاس وہ تمام شہادتیں



دیر انداز میں بولا۔ ”جب پیار کیا تو ڈرتا کیا۔ بجلی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن آج تک میں نے اس کے سامنے یا اس کے پیچھے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جسے آپ گھٹایا کہہ سکیں اور جہاں تک بجلی کو بھگا کر جانے والا معاملہ ہے تو..... تو میرے لیے یہ ناممکن تھا۔“

”کیوں ناممکن تھا؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا تم نے چوڑیاں پہن رکھی یا ہاتھ مارے ہاتھ پاؤں میں ہمندی لگی ہوئی ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے تمہارے دار صاحب۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

”پھر کیا بات ہے!“ میں نے اس کی نفسیات سے کھینچے ہوئے استفہار کیا۔ ”کیا تم اتنے بزدل ہو کہ کسی کے دھمکانے سے ڈر گئے؟“

میرے آخری جملے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ابھین زدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو تو..... سب کچھ..... پتا ہے۔“

”میں اس علاقے کا تمہارے دار ہوں پتہ جی!“ میں نے اس پر نفسیاتی دباؤ برقرار رکھتے ہوئے جیسے جیسے میں کہا۔ ”جس طرح دانی سے پیٹ، ڈاکٹر سے مرض اوزوکیل سے جرم کو نہیں چھپایا جاسکتا بالکل اسی طرح کسی علاقے کا تمہارے دار..... ایک وقت دانی، ڈاکٹر اور وکیل ہوتا ہے جو اپنے علاقے کے لوگوں کے بارے میں یہاں تک بھی جان کاری رکھتا ہے کہ کس نے کس دن کیا کھا یا اور کیا پیا ہے۔“ تمہاری توقع کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لہذا مجھ سے کسی غلط بیانی یا دروغ کوئی کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خود کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تمہاری زبان سے صرف اور صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ تم چکر بازی سے کام لے رہے ہو تو باقی کی عمر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزارو گے جہاں تمہاری گمشدہ سہیلی کی صورت دکھائی دے گی اور نہ ہی اس سے بات کرنے کا کوئی موقع ہاتھ لگے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟.....؟“

”سمجھ رہا ہوں تمہارے دار صاحب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں نے ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی میرا آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ گنہگار کھری بات یہ ہے کہ میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں، نہ میرے ہاتھ پاؤں میں ہمندی لگی ہے اور نہ ہی میں کسی سے ڈرتا ہوں اگر تارا

مجھے تین چھڑا رہا تو میں جواب میں ایک آدھ منٹا تو اسے بھی رسید کر ہی دیتا۔ میں نے تارا کی دھمکی کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اس خیال سے میں نے چپ سا دل کر جب یہ معاملہ اچھے جا تو بجلی کی بدنامی ہوگی۔ میں کسی بھی قیمت پر بجلی کی رسوائی نہیں چاہتا تھا، تمہارے دار صاحب۔ میں بجلی سے بھی محبت کرتا ہوں لیکن انیسویں صدی..... وہ دہلے بولتے بولتے چاک نکال دیا۔

میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ ان لحاظ میں وہ جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے دل و جگر میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اس کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ انسان دو حالتوں میں بھی جھوٹ نہیں بولتا، اول، نئے کی حالت میں۔ دوم، جذبات کی طغیانی میں۔ ان دونوں کیفیات میں وہ دروغ کی ٹپس بلکدلی کی زبان بول رہا ہوتا ہے۔

چند لحاظ تک حذب و جذب رہنے کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ گویا ہوا۔ ”لیکن مجھے اس بات کا بڑا گہرا دکھ ہے کہ بجلی نے بھی میری محبت کی قدر نہیں کی۔ یہ پیار سے دو باتیں کر لیتا تو بہت دور کی بات ہے، اس نے تو مجھے سیدھے منہ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں بجلی کو بھگا کر نہیں لے گیا ہوں۔“

آخری جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے شاکی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے سچائی اور راست گوئی جھلکتی تھی۔ میں نے اسے ایک اور زاویے سے گھسنے کی کوشش کی تاکہ بجلی کی گمشدگی کا معاملہ کیا جاسکے۔

”اصغر!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں ایک منٹ کے لیے تمہارے بیان کو درست سمجھ کر یہ مان لیتا ہوں کہ تم بجلی سے بھی محبت کرتے ہو لیکن اس ناقدی، بددماغ لڑکی نے بھی تمہاری محبت کو لائق تو نہ نہیں جانا لیکن.....“

”بالکل یہی بات ہے تمہارے دار صاحب!“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بآواز بلند بولا۔ ”بجلی بڑی خودمختار، ہنسنی اور مغرور لڑکی ہے۔ محبت کا جواب محبت سے دینے کے بجائے اس نے ہمیشہ میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے۔“

”مجھے تم سے اور اس دنیا کے ہر سچے اور کھرے عاشق سے گہری ہمدردی ہے اسی لیے میں تمہارے بیان کو درست مان رہا ہوں لیکن پھر میرے ذہن میں ایک اہم سوال سر اٹھا رہا ہے اور اس سوال کا جواب تم پر لازم ہے۔“

”کون سا سوال تمہارے دار صاحب؟“ وہ ابھین زدہ

نظر سے مجھے ہنسنے لگا۔

”اگر بجلی نے بھی تمہیں اور تمہاری محبت کو اہمیت نہیں دی تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ بجلی کو کوئی اور اچھا لگتا تھا۔ وہ کوٹ ڈوگران کے کسی اور مرد کی محبت میں گرفتار نہی۔ کیا تم مجھے اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟.....“

”میں ایسے کسی بندے کو نہیں جانتا تمہارے دار صاحب!“ وہ دونوں انداز میں بولا۔ ”آپ کی مرضی ہے، میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔“

”میں تمہاری بات کا یقین کر رہا ہوں اسی لیے میں تم سے دوستانہ انداز میں بات چیت کر رہا ہوں ورنہ اگر میں نے تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرانی ہوتی تو اس وقت تمہارے دار پر اور تمہاری کرب میں ڈوبی ہوئی اذیت ناک چیزوں سے محفوظ ہو رہے ہوتے۔ مجھے امید ہے، تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے۔“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں بجلی کے ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں تھا اور اگر وہ کوٹ ڈوگران کے کسی اور مرد کو پسند کرتی تھی تو مجھے اس سے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے اور میری محبت کے جواب میں مجھ سے محبت سے بات کرے۔ میں نے اس نے زیادہ کی اس کی تمنا نہیں کی تمہارے دار صاحب اور اس پائل لڑکی کی سمجھ میں بھی میری یہ بات آئی ہی نہیں۔“

”یہ سوال میں اس پائل لڑکی سے ضرور کروں گا جب وہ میرے ہاتھ لگے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ کہ تارا کی کیا کہانی ہے؟“

”میں سمجھا نہیں جانتا۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تارائے جہیں دھمکی دی تھی کہ بجلی سے دور ہو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو بجلی ظاہر ہوتا ہے کہ تارا بجلی کا امیدوار تھا اور اسے اپنی جاگیر بھگتا تھا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تمہارے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تاراکا گاؤں میں اچھی شہرت نہیں ہے۔ وہ دھونس دھاندلی اور غنڈا گردی کے لیے مشہور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تارا کی بجلی پر نظر تھی۔ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔“

”اور بجلی.....؟“ میں نے نونہلے والی نظر سے اس کی

طرف دیکھا۔

وہ فوراً سے بیشتر میرے سوال کی د میں پہنچ گیا اور خانے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ تارا کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ میری معلومات کے مطابق بجلی نے بھی تارا کو گھاس نہیں ڈالی۔“

”اصغر.....!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس بات کا فیصلہ میں کل صبح کروں گا کہ تم کتنے سچے ہو اور کتنے جھوٹے۔ آج کی رات تم میرے تمہارے گئے مہمان ہو۔ اگر تمہیں کوئی ایسی بات یاد آجائے جو بجلی کی تلاش میں معاون ثابت ہو سکتی ہو تو سچ مجھے بتادینا اگر تم نے اپنے بیان میں کوئی رد و بدل کرنا ہو تو اس کے بارے میں بھی سوچ لینا۔ میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم میری اس مہربانی کو بھلی اور آخری مہلت سمجھنا۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں تمہارے دار صاحب جو آپ میرے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ جو میرا بیان اس وقت ہے، سچ بھی یہی بیان ہوگا۔“ اس نے لمبی توقف کر کے میری آنکھوں میں دیکھا اور سرسراہٹ ہوئی آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک بجلی کی تلاش کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں آپ سے یہی کہوں گا کہ تارا کو نظر میں رکھیں۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ بجلی تارا کے ساتھ بھاگی نہیں ہوگی لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بجلی کی گمشدگی میں تارا کا ہاتھ ہو۔ تارا بہت ہی کمینہ انسان ہے۔“

”تاراکا تم فکرت کرو۔ میں نے اس پر بڑی گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”انشاء اللہ! آج کی رات وہ غنڈا بھی میرے تمہارے حوالے میں بند ہوگا۔“

اصغر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے اصغر کو والدہ فضل داد کے حوالے کر دیا اور علیحدگی میں فضل داد کو سمجھا دیا کہ حوالاتی کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کرنا تاہم اس پر تفتیش کے تمام نفسیاتی حربے ضرور آزمائے جائیں۔ ہوسکتا ہے، کوئی نئی اور مفید بات سامنے آجائے۔ فضل داد نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

”آپ مطمئن ہو جائیں ملک صاحب! میں ایک طمانچہ مارے بغیر اس کے پیٹ میں چھپے سارے رازوں سے واقفیت حاصل کروں گا۔“



اور میں مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

رات نو بجے کے قریب کاشیمل باسٹکی واپسی ہوئی۔ وہ تارا کو اپنے ساتھ لایا تھا لیکن سادہ لباس اٹھار بجے اس کے ہمراہ دکھائی نہیں دیا تو میں نے کاشیمل سے پوچھا۔  
”صدا ہی کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟“

سادہ لباس پولیس اٹھار کا نام صدیق تھا اور وہ ایک ہوشیار قسم کا کاشیمل تھا۔ باسٹ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”صدیق کو میں کوٹ ڈوگراں میں چھوڑ آیا ہوں ملک صاحب۔ ابھی وہاں پر اس کی موجودگی ضروری ہے۔ صبح تک کوئی سسٹن فیئر خیر سائے آسکتی ہے۔ تارا منڈھورا کلاں سے لوٹ آیا تھا اس لیے میں اسے آپ تک پہنچانے آ گیا ہوں۔ اب میں واپس کوٹ ڈوگراں جا رہا ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے چونک کر باسٹ کی طرف دیکھا۔  
”اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی رات ادھر کوٹ ڈوگراں میں کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے؟“

”میں فی الحال واضح طور پر آپ کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ملک صاحب کیونکہ میرے ہاتھ میں کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے لیکن مجھے امید ہے، صبح تک کوئی ایسا سراخروہ میرے ہاتھ لگ جائے گا جیسے تمام کریم ٹیم تک پہنچ جائیں گے۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے یہ مشن مجھے سونپا ہے تو میرا وعدہ ہے کہ آپ کو یوں نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے باسٹ! میں تمہیں فری ونڈ دیتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی تمہاری سرخروئی کے لیے دعا گو بھی ہوں۔“

وہ ہنسنے لگا اور انداز میں بولا۔ ”شکر یہ ملک صاحب!“  
”تم نے بتایا ہے کہ صدیق کوٹ ڈوگراں کے لوگوں میں کھل مل گیا ہے۔“ میں نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔  
”تم یہ رات کہاں گزارو گے؟“

”ماسٹر عنائت کے گھر میں.....!“ اس نے معنی خیز انداز میں بتایا۔

اس کے بعد میں نے باسٹ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اسے فری ونڈ دے چکا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ اس کو سونپے گئے مشن میں مجھے کوئی مداخلت نہیں کرنا۔

باسٹ کے انداز و اطوار سے میں نے تو بھانپ لیا تھا کہ اس کیس کے حوالے سے کوئی اہم نکتہ اس کی پکڑ میں آچکا تھا اور وہ مجھے کوئی سراخروہ دینے کی خاطر اس نکتے پر کھل کر مجھ سے

بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چپ چاپ جانے کی اجازت دے دی۔

سینئر اور جونیئر کے درمیان ”استاد اور شاگرد“ کا ایک خاص رشتہ ہوتا ہے، اگر سمجھا جائے تو..... سینئر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے جونیئر پر بھروسہ کرے اور اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مواقع فراہم کرے۔ میں اگر آج تھانے دار تھا تو برسوں کی محنت کے بعد مرحلہ وار ترقی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اگر کسی مرحلے پر میرے سینئر نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہوتی یا میں خود ہی ہمت ہار کر ایک طرف ہٹتا جاتا تو پھر میں آج بھی ایک کاشیمل ہی ہوتا۔ میری ہیئت یہ کوشش رہی ہے کہ پر جوش اور ذہین جونیئر کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کاشیمل باسٹ ایک ایسا ہی باہمت اور بہادر پولیس اٹھار تھا۔

کوئی شاگرد چاہے کتنی بھی ترقی کر لے وہ وزن اور قد و قامت میں بھی استاد کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے وزن اور قامت میں اس کے استاد کا وزن اور قامت شامل ہوتے ہیں۔ سمجھداروں کے لیے یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔

میں عموماً مغرب کی اذان کے بعد تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا لیکن چھبیس جولائی کا وہ ایرالود دن میرے لیے حدِ مصروفیت کا حامل تھا اور میں رات کے دس بجے بھی اپنے گھر سے بیٹھا ہوا تھا۔ کاشیمل باسٹ کے جانے کے بعد میں نے نذیراں ماچن کے بیٹے ستار عرف تارا کو اپنے پاس بلایا۔

تارا کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس کے قریب لگا یا۔ وہ ایک دلا چلا اور دروازہ قامت شخص تھا۔ اس نے اپنی زلفوں کو کافی بڑھا رکھا تھا اور بالوں میں ص سے زیادہ سروس کا تیل بھی چڑھ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی پیشتر انگلیوں میں بڑے گینگنوں والی انگوٹھیں نظر آرہی تھیں اور ایک کلائی میں اس نے لوہے کا ایک ٹکڑا بھی پکڑ رکھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے اچھے پن کے بڑے واضح آثار دکھائی دیے۔

”کیا بات ہے تارا.....!“ میں نے اسے خشک مین نظر سے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم بڑے بڑا نظر آرہے ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے ساتھ کسی نے زور زبردستی کی ہو؟“

”تھانے دار صاحب! آپ کے سپاہی نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔“ وہ ڈھکائی لہجے میں بولا۔ ”میں منڈھورا کلاں سے واپس آیا ہی تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر

انجام دہ شد

لانے لے آیا۔ میں نے اس کی وردی کا لحاظ کیا اور نہ.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رکنا تو میں نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تم میرے کاشیمل کے دانت تو زود دیتے کیونکہ تم کوٹ ڈوگراں کے ماسے لگے ہوئے ہو..... ہیں نا؟“

میرے درشت انداز پر وہ سوچتی ہوئی نظر سے چند لمحوں کے بعد دیکھتا ہوا پھر قد رے کھینچے ہوئے لہجے میں بولا۔  
”جناب! لوگوں نے مجھے خواخواہ غنڈا اید معاش مشہور کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں غصے کا کافی تیز ہوں لیکن میں نے بھی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی۔“

”تمہارے طے اور اوکھے پن کو دیکھ کر مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ تم طبی کی طرح سیدھے اور نیوٹریل شخصے انسان ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ”اے زہر لیے لہجے میں کہا۔ ”جہاں تک میرے کاشیمل باسٹ کی بات ہے تو اس نے کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ اس نے شخص میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اگر تم اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرتے تو وہ تمہارے ہاتھ پاؤں تو درگزر میری خدمت میں پیش کر دیتا اور جہاں تک تمہاری شرافت کا تعلق ہے تو.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے گہری نظر سے اسے گھورا پھر سنسناتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شرافت کی دو مثالیں میرے تھانے کے ریکارڈ پر درج ہو چکی ہیں۔“

”مگ..... کون سی مثالیں تھانے دار صاحب؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔  
”مثال نمبر ایک.....“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خادم حسین کو چوان کے بیٹے کو دیکھ دی تھی کہ وہ بجلی سے دور ہے ورنہ تم اس کا حشر خراب کر دو گے۔ مثال نمبر دو، تم نے کوٹ ڈوگراں کے ایک معزز شخص سے متعدد بار بدتمیزی کی ہے۔“

”جناب! اصغر جس انداز میں بجلی کو رسوا کرنے کی مہم میں لگا ہوا تھا اس سے مجھے بڑی تکلیف پہنچی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے شخص اسے ڈرانے کے لیے ایسی بات کی تھی ورنہ اصغر سے میرا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا۔“

”بجلی کی رسوائی سے تمہیں تکلیف کیوں پہنچی تھی؟“ میں نے خاصے صبحیے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہارا بجلی کے ساتھ ایسا کون سا رشتہ تھا؟“  
”رشتہ تو کوئی نہیں تھا مگر.....“ وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بس، جناب! اسے میرے دل کا معاملہ سمجھ لیں، بجلی

مجھے بہت اچھی لگی تھی۔“  
”جو چیز تمہیں پسند آجائے وہ تمہاری ملکیت تو نہیں ہو سکتی نا۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، بجلی نے کبھی تم سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اس کے باوجود بھی تم اپنی جاگیر کچھ کر اس کی چوکیداری میں لگے رہتے تھے.....؟“

”میرا دل کہتا تھا کہ بجلی کو ایک دن میری محبت کا احساس ہو جائے گا۔“ وہ کسی مجبور عاشق کے مانند بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تمہارا دل ضرور ایسا دلدادہ ہوگا لیکن زمینی حقائق اس کے برعکس تھے۔“ میں نے تارا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہوا میں ایک حیر چلایا۔ ”کافی عرصے سے انتظار کے بعد جب تمہیں یقین ہو گیا کہ بجلی کسی بھی صورت تمہاری نہیں ہو سکتی تو تم نے اسے کوٹ ڈوگراں سے غائب کر دیا۔“

”یہ بھوت ہے..... مجھ پر الزام ہے.....“ وہ جھجھکے سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”آپ کے سپاہی نے بھی کئی بار مجھ سے یہی بات کی ہے لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بجلی کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”آواز چینی.....“ میں نے اسے دیکھا مارا۔ ”یہ تھانے دار صاحب، تمہاری بے جا تنویر نہیں کہ تم اپنی بد معاشی کے زور پر سچ چلا کر خود کو چاٹا ثابت کر لو گے۔“

”معافی چاہتا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ فوراً نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں کہ بجلی کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں..... مجھے تو منڈھورا کلاں سے واپسی پر پتا چلا ہے کہ بجلی ایک دن سے غائب ہے۔“

”اگر بجلی کی گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر وہ مٹی کہاں؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سمجھ انداز میں سوال کیا۔ ”میں نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے مٹی ہے۔ اب صرف یہ پتا چلانا باقی ہے کہ وہ مٹی کس کے ساتھ ہے.....“

”آپ نے بجلی کے عاشق سے پوچھنا چاہی.....؟“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”مجھے یقین ہے، وہ بجلی کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔“

”ہاں.....“ میں نے بھی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”اس وقت میں بجلی کے ایک عاشق خوار ہی سے پوچھ کچھ کر رہا ہوں۔“

”میں اپنی نہیں، اصغر کی بات کر رہا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔



”اصغر، بجلی کی گمشدگی سے بارہ گھنٹے پہلے کوٹ ڈوگراں سے پنڈی بھلیاں روانہ ہو گیا تھا۔ وہ بجلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جیسا کہ تم بجلی کی رودوشی کے معاملے سے لاعلم ہو کیونکہ تمہیں تو منظر اور اکلاں سے واپس آنے پر پتا چلا ہے کہ بجلی کہیں چلی گئی ہے۔“

”جناب! ہو سکتا ہے، اصغر نے آپ کو کوئی پکڑ دیا ہو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اس پر تھوڑی سختی کریں گے تو وہ زبان کھول دے گا۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اصغر اس وقت میرے تھانے کی حالات میں بند ہے اور اب میں نہیں بھی حوالدار کے سپرد کرنے والا ہوں۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک نئی کر کے زبان کھولانے کا معاملہ ہے تو میں آج کی رات تم دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔ تم دونوں کی درمیں ڈوبی ہوئی کرب ناک چٹیں رسول پور تارڈ سے کوٹ ڈوگراں نہیں پہنچیں تو میرا نام بھی ملک صفدر حیات نہیں۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”آپ ہم دونوں کو کوڑی تفتیش کی بجلی میں نہیں کرہمارے ساتھ بڑی زیادتی کرنے والے ہیں جبکہ آپ کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ میری اور اصغر کی پسندیدگی کیلئے ہمیں بجلی نے بھی ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی جبکہ۔“

”کیا جبکہ۔۔۔!“ میں نے اضطرابی لہجے میں استدعا کر لیا۔ ”تم رک کیوں گئے؟“

”جبکہ یہ کہ۔۔۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”آپ کو چاہیے کہ اس شخص کو بھی شامل تفتیش کریں، بجلی جس میں دلچسپی لے رہی تھی۔“

ان لحاظ تک مجھے جو معلومات حاصل تھیں ان کی روشنی میں اصغر اور تارا کے سو کوٹ ڈوگراں کے کسی سرو کا نام بجلی کے ساتھ بڑا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ اسی تناظر میں تارا کی بات نے میرے دماغ میں الجھن مچا دی تھی۔ میں نے تارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں استدعا کر لیا۔

”بجلی کس شخص میں دلچسپی لے رہی تھی؟“

اس نے سرسراہٹ بولی انداز میں جواب دیا۔ ”تعلیم بالائے“

☆☆☆

ساتیس جولائی کی صبح میرے تھانے میں جشن کا سماں تھا کیونکہ اس روز ہمیں ایک بڑی کامیابی ملی تھی۔ جب میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو باسط کو وہاں دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ گزشتہ رات تارا سے پوچھتا چھ کے اختتام پر بجلی کی گمشدگی کے حوالے سے ایک ایسا نام سامنے آیا تھا جس نے میرے دماغ میں پوشیدہ صورت حال کو یکدم اجاگر کر دیا تھا۔ ان لحاظ میں مجھے یاد آیا کہ باسط نے تھانے سے روانہ ہوتے وقت بڑے سختی خیز انداز میں کہا تھا کہ وہ آج کی رات ماسٹر عنایت کے گھر پر گزارے گا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اسے ماسٹر جی کے حوالے سے سن گن مل چکی تھی۔

تارا کا رھیان مل طور پر بجلی میں لگا رہتا تھا، اس لیے وہ بجلی اور ماسٹر عنایت کے بیچ رابطے کو سمجھ چکا تھا۔ وہ ماسٹر سے حسد بلکہ نفرت کرنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے دو چار بار ماسٹر عنایت سے بدتمیزی بھی کی تھی۔

”ملک صاحب! میں ایک بات کے لیے آپ سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔“ باسط نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”امید ہے، آپ میری کوتاہی کو دور گرد فرمائیں گے۔“

”باسط! تم نے بجلی کو باز باب اور ماسٹر عنایت کو گرفتار کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے پیش نظر میں تمہارا بڑے سے بڑا قصور بھی معاف کر دیا ہوں۔“ میں نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بولو، کیا بات ہے؟“

”مجھے کل ہی اس بات کا پتا چل چکا تھا کہ بجلی، ماسٹر عنایت کے گھر میں چھپی ہوئی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”مراہ لہاس الہکار نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ آج علی الصبح بجلی اور ماسٹر کوٹ ڈوگراں سے نکل جائیں گے۔ ماسٹر صرف اس انتظار میں تھا کہ پولیس کی تفتیش کا رخ کسی اور طرف مڑ جائے۔ اس کے بعد وہ گاؤں سے روانہ ہوئے۔ رات بھر اس کے گھر کی کڑی نگرانی کی اور پھر ان دونوں کو رہتے ہاتھوں پکڑ لیا۔“

”مجھے بھی گزشتہ رات ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کس نوعیت کی کارروائی کرنے والے ہو۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے مشن میں اس لیے مداخلت نہیں کی تاکہ اس کامیابی کا سہرا تمہارے سر بندھے۔ صرف تمہارے سرا۔“

وہ ایک تک حقیقت بھری نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)



زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے جب کوئی دمک چھڑکنے لگے تو ایک بڑی اذیت انسان کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے مگر جب زخم لگانے والے رشتہ مرہم بن جائیں تو زندگی انسان اور خوشگوار ہو جاتی ہے اس کا احساس اسے بھی ایک دن ہو گیا۔

نرالیس  
محمد الیاس

پدر کرداری کی دلدل میں دھنکی جانے والی ایک نرس کی روداد

کے عملے نے مل کر کینی ڈالی اور بجلی اس کو روے دی۔ بھلائی نئی ملازمت والے پر کون اعتبار کرتا ہے۔ بس یہ کہ لڑکی جوان ہے اور خوبصورت ہے۔ سیدھی سی بات ہے مگر حق بنے کو قتل نہیں آ رہی۔ روتہ میں چھوٹے بھائی اور اس کی اولاد کا دشمن نہیں ہوں۔ بہو سے میری انجلی نسل پیدا ہوگی۔ بیٹے کے دماغ پر سوار عشق کا بھوت اتر ہی نہیں رہا کہ حوالے سال ڈاکٹر بن جائے گا۔ ایک سے ایک بڑے گھرانے کی حسین لڑکی شادی کرنے کے لیے سری جاری ہوگی۔ یہی بہترین موقع ہے اوچی اڑان بھرے گا۔ بھلا کسی دیو تاپ بول یا فوجی افسر کو سسر بناؤ۔ تاکہ ہماری بھی شان بنے۔ کل کو سید تان کے کسی سے بات کر سیں کہ فلاں گمشدہ یا جزل ہمارا سوسہ ہے۔ سید بختیار احمد نے ابھی سے بڑھ کر بھل گئے ہونا شروع کر دیا ہے۔ اچھا بھلا صنعت کار ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ جب اتفاقاً مجھ سے

رات بھر ماں باپ اور بیٹے کے درمیان بحث ہوتی رہی تھی۔ آخر طے پا گیا کہ زبیدہ کے پاس جا کر حقیقت معلوم کی جائے۔ اس وقت وہ تینوں زبیدہ کے گھر آئے بیٹھے تھے لیکن وہ ابھی اسپتال سے واپس نہیں آئی تھی۔ حسن کو تعین تھا کہ اس کے چچا اصغر اور ان کی بیٹی جو کہہ رہی ہے، وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ چچی چچا اور ان کی تینوں بیٹیاں باکرہ دار ہیں۔ بس یہ کہ بد روز گاری نے چچا کو بری طرح مفرط کر دیا اور بڑی بیٹی نے باپ کا ساتھ دینے کی غرض سے نرسنگ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ حسن کا باپ اکبر شاہ بیٹھا۔ بس اندر ہی اندر کھول رہا کہ جتنی نے نرس بن کر سادات خاندان کی ناک کٹوا دی اور پھر ملازمت کے دوسرے مہینے میں ہی اتنی رقم کہاں سے لے آئی۔ پیاس ہزار تارے کے اوپر تھریا جیسے ہزار روپے دکانوں کا قرض بھی چکا دیا۔ وہ غلط بیانی کرتی ہے کہ اسپتال



# قطعه کہانی

منظر سراما

بات سے بات چل نکلے تو داستان ترتیب دی جاسکتی ہے۔ زیر نظر کہانی بھی ایک قطعہ کے گرد اپنا جال بنتے ہوئے نہ صرف مکمل ہوئی بلکہ کتنے ہی نئے رنگوں سے بھی متعارف کرا گئی۔

بکے پکے اعداد میں زندگی کی حقیقت کو سمجھائی ایک پراثر تحریر



آتا۔ شام کے وقت دوستوں کے پاس چلا جاتا۔ وہ میٹرک کا طالب علم تھا اور اس کے چھٹے نتائج کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ میٹرک میں کامیابی حاصل کر لے گا اور وہ بھی شاندار نمبروں سے۔

نعمان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ خدا کا خواست وہ ایسا کوئی خاص بیمار نہیں تھا جس کے لیے یہ کہا جائے کہ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وقت پر اسکول جایا کرتا، وقت پر واپس

تھا۔ ہر کوئی پہلی یا دوسری کمیٹی لینے پر اصرار کرتے لگتا۔ لہذا بات نہیں بنتی۔۔۔۔۔

میاں بیوی کے چہرے کھل اٹھے جبکہ بیٹے پر اس کا مہی۔ اس کا ذہن دل کی گواہی تسلیم کر رہا تھا کہ ارم غلط نہیں ہو سکتی۔ ماں کو آس بھری نظروں سے دیکھا۔ صبح مندی کا احساس غالب آنے پر خاتون پر جوش ہوئی بیٹھی تھی۔ بیٹے سے لگا ہیں ملتے ہی بے صبری ہو گئی اور بول پڑی۔ ”کوئی ادودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔۔۔۔۔“ حسن کو سخت صدمہ پہنچا اور ارم سے قریبی رشتے داری کے حوالے سے راز داری قائم رکھنے کی تجویز بیکسر نظر انداز کر دی۔ محلِ بچن کے ماں سے مخاطب ہوا۔

”دودھ پھٹ کر بس گیا ہے، جیسے معدے نے الٹ دیا ہو۔ بات صاف ہوئی چاہیے۔۔۔۔۔“ ذرا توقف کر کے زبیدہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”سسٹر! آپ کی بیٹی کو لپک آئی ہے، دو ماہ پہلے۔ ارم نام کی۔ وہ اس ماہ کی خواہ کے علاوہ تقریباً ہی ہزار روپے کہاں سے لے گئی۔۔۔۔۔ کہتی ہے سکھنی ڈالی گئی۔۔۔۔۔“

ارم کا نام سنتے ہی زبیدہ نے ہونٹ سکڑ لیے اور ”اوہ“ کے سے انداز میں لمبی سانس خارج کر کے بول اٹھی۔ ”بہت اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔۔ کچھ زیادہ ہی نیک اور فرماں بردار بیٹی ہے۔ باپ کے لیے سخت پریشان تھی۔ مجھے اعتماد میں لیا۔ میں نے ہی ڈاکٹر پر دیر سے بات کی۔ انسانی جسموری کا سبب ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے لڑکی کی بیماری بتائی تو مان گئے۔ انہوں نے خود ہی ایک مال دار جیملی سے معاملہ طے کر دیا کہ ارم کو لاکھ روپے دلا دیا۔۔۔۔۔“

حسن نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ باپ کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔ ”چل ادودھ جی (چلو جی) اور پوچھو۔۔۔۔۔“ حسن پھٹ پڑا۔ ”سسٹر! بات گھیر ہوئی چاہیے۔ کس بات کا لاکھ روپے؟“

زبیدہ کو گویا ہوش آ گیا اور وہ چونک اٹھی۔ مہمانوں کو ایک نظر دیکھا اور حسن سے مخاطب ہوئی۔ ”کس بات کے دینے تھے۔ امیر عورت کا کڈنی فرانسسٹ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر پرویز، مرلیضوں کے لواحقین کو اپنا اپنا ڈور لانا لے کا کہتے ہیں۔ خود اس معاملے میں شامل ہونا پسند نہیں کرتے۔“

زبیدہ کو جیسے اچانک کوئی خیال آ گیا اور حسن کو بخور دیکھ کر بولی۔ ”مہل بات کیا ہے۔۔۔۔۔ ارم کو آپ لوگ کیسے جانتے ہیں؟ مجھے اس نے یہی کہا تھا کہ وہ گھر والوں کو اپنا گھر وہ ڈونٹ کرنے کے بارے میں بالکل نہیں بتائے گی، ورنہ انہیں بہت دکھ ہوگا۔۔۔۔۔“

معلوم ہوا کہ میرا بیٹا مینیکل کے آخری سال میں ہے تو زبیدہ دوستانہ ہو گیا۔ ورنہ پہلے بھی لفت نہ کرائی۔ واجبی سی علیک سلیک کیا کرتا تھا۔

ماں بیٹے کے مابین جاری گفتگو قدرے بلند آہنگ ہونے پر اکبر کی سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حسن ماں سے مخاطب ہوا۔ ”امی! نس کا پیشہ بہت مقدس ہے، اتنا ہی جتنا ڈاکٹر کا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ زبیدہ بھی اسٹاف نرس ہے۔ اس کو اتنا ہی سگی بیٹی کی ہی عزت کیوں دے رکھی ہے۔۔۔۔۔؟“ اکبر شاہ نے ہاتھ جھلا کر بیٹے کو آواز دہشی رکھنے کا اشارہ دیا اور بولا۔ ”بچن میں اس کی ماں ہی رہی ہوگی۔ زبیدہ واقعی میری بیٹی ہے۔ اس نے بیماری میں جس طرح میری خدمت کی، وہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔ ایسی نیک عورت اس شے میں خال خال ہی ہوگی۔ ورنہ یہ پیشہ پول ہی بدنام نہ ہوتا۔۔۔۔۔ اور تم ہوش کے ناخن لو۔ سلف خاص کے تحت تم پر پوری بھر کے نوٹ خرچ کیے ہیں۔ ہمارے اربانوں کا خون نہ کرو۔“

بیوی نے مہاں کو ٹوکے ہوئے راز دارانہ لہجے میں کہا۔ ”ہم آپس میں غلطی نہ کریں۔ زبیدہ آنے والی ہے۔ اس کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ارم سے ہماری قریبی رشتے داری ہے۔ اس سے صرف اتنا پوچھیں کہ محلے نے مل کر جو کمیٹی ڈال رکھی ہے، وہ اس ماہ کس کوئی۔۔۔۔۔ بس، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

حسن کے چہرے پر سخت مایوسی اور بے زاری کا تاثر ابھرا۔ اسی لمحے زبیدہ آن پہنچی۔ مہمانوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ گرم جوش سے خیر مقدمی کلمات کہے۔ میاں بیوی نے شفقت سے سر پر ہاتھ بھیرا۔ اتنے میں بچن سے بڑھی خاتون ٹرے میں چائے اور لوازمات کے برتن سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

تقریباً دس منٹ تک عام نوعیت کی گفتگو ہوئی ہوگی کہ اکبر نے بات ٹھہرا کر سو جوہ حالات، مہنگائی اور سفید پوش طبقے کے مسائل پر یوں شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ ”مینی زبیدہ! ہم اچھے بھلے کاروباری لوگوں نے بھی بازار میں کمیٹیاں ڈال رکھی ہیں۔ یکساں بات ہے، اس کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ مٹا ہے آپ کا خواہ دار بقیدہ ہی اسی طرح کمیٹیاں ڈال کر موٹے موٹے خرچے پورے کرتا ہے۔“

زبیدہ دھک دھک بھر خاموش رہ کر بولی۔ ”انگل! مشورے ہی ہوتے رہتے ہیں زیادہ تر۔۔۔۔۔ بے چاروں کی پوری نہیں پڑتی، اس لیے ہر مرتبہ کمیٹی ڈالنے کا پروگرام آئندہ پر مال دیتے



ان ساری باتوں کے باوجود کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جیسے کوئی کمی یا رہ گئی تھی۔ ایسی کمی جس کا احساس صرف والدین ہی کر سکتے ہیں اور خاص طور پر ماں۔ اس لیے رابعہ نے اس طرف میری توجہ دلائی تھی۔

”ذرا نعمان کو تو دیکھیں۔۔۔ کیا ہوا ہے اس کو۔“

”کیوں۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”آپ باپ ہیں نا اس لیے آپ کو زیادہ نہیں معلوم۔ میں ماں ہوں اس لیے اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں کیونکہ آپ زیادہ تر باہر رہتے ہیں اور میں گھر پر ہوتی ہوں اور وہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔“

”خدا کی بندی۔۔۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا ہے اس کو؟“

”وہ کچھ کچھ یا سادہ پریشان سا رہتا ہے۔“ رابعہ نے بتایا۔ ”میں نے ایک دو بار پوچھا بھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر میں خود آج برو کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ خدا کے لیے کچھ کریں۔ لڑکا ہے۔ اس کو آگے بڑھتا ہے، ترقی کرتی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔“

رابعہ نے خود مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ تھا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی تو بہت خطرناک تھی۔ ابھی تو اس کو آگے بڑھنا تھا۔ اس نے زندگی کو دیکھا ہی کہاں تھا۔ رابعہ کے کہنے پر میں نے اس طرح نعمان کی نگرانی شروع کر دی کہ اس کو احساس نہ ہوا کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے۔ دفتر سے جلدی گھر واپس آ جاتا اور اسے نہ کمرے کے دروازے کو ٹھوڑا سا کھول کر نعمان کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھا کرتا۔

رابعہ کا کہنا درست تھا۔ وہ واقعی بہت بدل چکا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت چڑچڑا ہوا گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر شورو کرنے لگتا۔ برتن توڑ دیتا۔ اس جیسے فرماں بردار اور سنبھلے ہوئے لڑکے کی یہ حرکات باعث حیرت تھیں۔

وہ ایسا تو نہیں تھا۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ وہ بہت خفا ہوا دکھائی دیتا۔ جیسے کہیں سے بہت زیادہ محنت کر کے آیا ہو۔ حالانکہ وہ ایک پھر تپا اور جوشیلا لڑکا تھا جس کو عام الفاظ میں اسارت کہتے ہیں۔ وہ واقعی بہت اسارت تھا۔ پورے خاندان میں اس کی مثال دی جاتی کہ اولاد ہو تو

نعمان جیسی۔ اب اسی نعمان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ کہیں سے آتے ہی بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔

اور تیسری بات تھی اس کی اداسی۔ ہر دم ہنسنے ہنسانے والے لڑکے کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ ہنسا ہی بھول گیا جیسے اس پر رکھوں گا پڑا کر پڑا ہو۔

یہ ایک خطرناک اور تشویشناک صورت حال تھی۔ میں باپ تھا اس لیے میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے ایک جاننے والے نیم صاحب یاد آ گئے۔ وہ ہرفن مولانا قسم کے انسان تھے۔ مشورے دینے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پورا خاندان، دوست، پڑوسی سب ہی ان سے مشورے لیا کرتے۔ کبھی کبھی ان کے مشورے بہت کام کے بھی ثابت ہوتے اور ہر کامیاب مشورے کے بعد ان کی ساتھ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نعمان کی حالت کے پیش نظر ان کے پاس پہنچ گیا اور جیسے ہی میں نے انہیں نعمان کی طبیعت بتائی وہ اچھل پڑے۔

”اوہ۔۔۔ خدا۔۔۔ یہ تو مجھے چھلا د کا کیس ہے۔“

نیم صاحب نے کہا۔

”مجھے چھلا د۔۔۔ یہ کیا چیز ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے بھائی! یہ ایک شیطانی قوت ہے۔“ نیم صاحب نے بتایا۔ ”عام طور پر نو جوان لڑکوں کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، وہ رات میں سوتا بھی نہیں ہوگا؟“

”جی ہاں۔ میں نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہے، وہ رات بھر بے چین رہتا ہے۔“

”میاں! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔۔۔ مجھے چھلا د کی کارستانی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، نیم صاحب لیکن اب اس کا علاج کیا ہے؟“

”مجھے چھلا دے کا علاج میرے مرشد بخاری صاحب کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ نیم صاحب نے بتایا۔

”اور یہ بخاری صاحب کہاں ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو، میں ابھی ملادیتا ہوں۔ ایسے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”فوراً چلیں نیم صاحب۔۔۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”ارے میاں! اس میں مہربانی کیسی۔۔۔ یہ تو اپنے ہی گھر کا کیس ہے۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ مجھے چھلا د تمہارے بیٹے پر حاوی ہو جائے۔“

بہر حال ہم دونوں بخاری صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ایک منزلہ چھوڑا سا مکان تھا۔ دسک کے جواب میں کسی عورت نے دروازہ کھول کر بتایا۔ ”بخاری صاحب تو کئی دنوں سے بخار میں پڑے ہیں۔“

”کہیں وہ اس لیے تو بخار میں نہیں ہیں کہ انہیں بخاری کہا جاتا ہے۔“ میں دھڑکے سے پولا۔

اس پر نیم صاحب نے حیرت آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر دروازہ کھولنے والی عورت سے مخاطب ہوئے۔ ”جائیں۔ انہیں بتادیں کہ نیم ان کی عیادت کے لیے آیا ہے۔“

اس وقت پتا چلا کہ وہ خاتون بخاری صاحب کی بیوی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ بخاری صاحب اپنے بستر پر لیٹے ہوئے دور رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کسی طرح اٹھ بیٹھے۔ وہ چالیس اور چونتالیس کے درمیان کے تھے۔ فریاد نام۔

نیم نے بڑی عقیدت سے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام کر لیا۔ ”بوسہ دیا۔“ مجبوراً مجھے بھی ان کی تقلید کرنی پڑی۔ اس پر بخاری صاحب کے بخار زدہ چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”حضرت! یہ ہارون ہیں میرے دوست۔“ نیم صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے ساتھ ایک پرائیم ہو گئی ہے۔“

”خدا خیر کرے۔ کیا ہو گیا ہے؟“ بخاری صاحب نے پوچھا۔

”قلید! پھر کبھی حاضر ہو کر عرض کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت آپ کی طبیعت تازہ ہے۔“

”نہیں میاں! یہ تو ثواب کا کام ہوگا اور میں اس وقت پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

”حضرت! ان کے صاحبزادے کے ساتھ مجھے چھلا دے کا چکر ہو گیا ہے۔“ میرے بجائے نیم صاحب نے بتا دیا۔

”اوہ۔“ بخاری صاحب اب پوری طرح سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”ہاں میاں۔“ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”ذرا تفصیل سے بتائی، کیا کیفیت ہے تمہارے صاحبزادے کی اور کیا عمر ہوگی اس کی؟“

## لعنت

ہوٹل کے استقبال کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک صاحب نے پوچھا۔ ”آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟“

”بہترین جناب۔“ استقبال کلرک نے فخر سے کہا۔ ”آپ یہاں قیام کریں گے تو بالکل یہی محسوس کریں گے جیسے اپنے گھر میں ہیں۔“

”میں لخت بھیجتا ہوں ایسے ہوٹل پر۔“ مہمان نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

انتخاب۔ آفتاب خان تولی، مانسہرہ

اے میرے پیارے پاکستان

وہ آہستہ آہستہ مجھ سے الگ ہوا۔ اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تمام کر اپنے قریب کر لیا اور کہا۔ ”میری آنکھوں میں دیکھو بی بی میں نے دیکھا تو اس نے کہا۔ جذبات سے لگلو۔“

میں مر نہیں چلا لیکن حقیقت، حقیقت ہی ہوتی ہے۔ سپاہی اور موت کا بڑا گہرا یار نہ ہے۔

ہوسکتا ہے، میں تمہیں نڈل سکوں۔ میری موت کا پیغام لے اور ہو سکتا ہے، میں اپنا مشن پورا کر کے ہنسا کھیتا تمہارے پاس آ جاؤں۔ لیکن

میں یہ تمہیں صاف الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان نے مجھ سے جان مانگی تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ میں یہ نہیں سوچوں گا کہ ذہنی

میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں نہ مروں۔۔۔ اگر درمیان میں پاکستان کا نام نہ آ جاتا تو میں اسے نہ جانے دیتی۔ مجھے پاکستان سے پیار تھا۔۔۔

میں تو اپنی جذباتی کیفیت میں پاکستان کو ذہن سے اتار بیٹھی تھی۔ مجھے اسی نے یاد دلایا تھا کہ

پاکستان ہمارا ملک ہے۔ ہندو ہمارا دشمن ہے اور ہم نے خون کے دریاؤں کی قربانی دے کر یہ خطہ حاصل کیا ہے۔

معروف ادیب عنایت اللہ مرحوم کی مشہور کتاب ”میں کسی کی بیٹی نہیں“ سے

انتخاب

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال



”سولہ برس کی ہے جناب۔“ میں نے بتایا۔  
”تیسڑک کا طالب علم ہے۔“  
”اور ہوا کیا ہے اس کے ساتھ؟“  
میں نے انہیں نعمان کی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”مبارک ہو۔“ بخاری صاحب نسیم صاحب سے مخاطب ہوئے۔  
”قبلہ امیری سمجھ میں نہیں آیا۔“ میں بھنا کر بولا۔  
”میرے بیٹے کے ساتھ ایسی صورت حال ہے اور آپ نسیم صاحب کو مبارکباد دے رہے ہیں۔“

”میاں! یہ تم نہیں سمجھو گے۔“ بخاری صاحب مسکرا دیے۔ ”یہ سولہ اور معرفت کی باتیں ہیں۔ میں نسیم کو اس بات کی مبارکباد دے رہا ہوں کہ اس کی شخصیت کامیاب جا رہی ہے۔ اس نے جو بتایا ہے وہ بالکل درست ہے۔“  
”مختصر! یہ سب آپ کی نگاہ کرم کا فیض ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔

”میاں! ہو جائے گا تمہارا کام۔“ بخاری صاحب نے فرمایا۔ ”وہ مجھ جیلا دار چلا جائے گا۔ میں اسے کسی بار پہلے بھی بھگا چکا ہوں۔“  
”فرمایا حضور! مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے ادب سے پوچھا۔

”میں ایک چھری پر دم کر کے دوں گا۔“ بخاری صاحب نے کہا۔ ”اس چھری سے دس عدد مرغیاں ذبح کرنی ہیں اور ان کا خون ایک بائلی میں جمع کرتا ہے پھر اس خون سے بچے کو ہلانا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں یہ سن کر ہی ہلک گیا تھا۔ ”قبلہ: وہ تو کبھی خون سے نہانے پر راضی نہیں ہوگا۔“

”یہ تو کرنا ہوگا۔ شفا کے لیے کڑوی دوا تو اپنی پڑتی ہے۔“ بخاری صاحب نے کہا۔ ”اور وہ خالص خون بھی نہیں ہوگا۔ اس میں تھوڑا سا پانی ملا دیتا۔“

”لیکن جناب! وہ تو پھر بھی پتا چل جائے گا کہ یہ کیسا پانی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ علاج تو یہی ہے۔“ بخاری صاحب کا لہجہ خشک ہونے لگا تھا۔ ”اگر ڈاکٹر پر اعتبار نہ ہو تو پھر علاج کے لیے اس کے پاس نہ آیا کریں۔“

”اچھا جناب۔ پلیز ناراض نہ ہوں، آپ مجھے چھری دم کر کے دے دیں۔“

”بخاری صاحب نے گھر کے اندر سے ایک پرانی سی

چھری منگوائی اور اس پر دم کر کے چھری میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ لومیاں لے جاؤ اس کو۔ تمہارا کام ہو گیا۔“  
پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ نعمان اس بائلی کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ ”آپ لوگوں نے مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔ میرا دماغ ٹھیک خراب جو اس خون سے نہاؤں۔“

”بیٹا! یہ تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔“ میں نے پیار سے سمجھایا۔  
”بابا! کسی بھلائی۔ آخر مجھے ہوا کیا ہے؟ میں ٹھیک تو ہوں۔“

”بیٹا! تم ٹھیک نہیں ہو۔“ رابعہ نے کہا۔  
”شاباش..... نہا لو اس سے۔ بس آنکھیں بند کر کے دو چار چپک پانی اپنے اوپر ڈال لو۔“

”لیکن کیوں..... میں ایسا کیوں کروں؟“  
”میں نے کہا نا کہ یہ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔“ میں نے اپنی بات دہرائی۔ ”تمہارے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔“

”پلیز بابا! وہ تقریباً رو نے لگا تھا۔“ آپ لوگ مجھے کس چکر میں ڈال رہے ہیں۔“

لیکن جب میں نے سختی کی اور اس بے چارے پر زور دیا تو اس نے اس پانی سے نہانا شروع کر دیا۔

اس وقت اس کا حلیہ دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ سر نے پاؤں تک مرنے کے خون میں گھسنا ہوا۔ بدبودار خون کی وجہ سے اس کا پورا بدن بدبودار ہو گیا تھا۔ وہ روتا جاتا اور نہاتا جاتا۔

خدا خدا کر کے مرنے کے خون اور پانی والی بائلی ختم ہوئی تو اسے صاف پانی سے نہانے کی اجازت مل گئی۔

وہ بے چارہ اس دوران زور زور سے ابکائیاں لیتا رہا تھا۔ نہا کر اس نے صاف کپڑے پہنے اور ناراض ہو کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

اس کی یہ کیفیت دو چار دنوں تک رہی تھی لیکن اس عمل کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ویسا ہی رہا، جیسے پہلے تھا۔ وہی چڑچڑاہن، وہی ہر وقت کی ٹھنک، وہی اداسی۔

اب کیا کیا جائے؟ ایک علاج تو کر کے دیکھ چکے۔ اب کون سا علاج کر سکتے تھے۔ اس وقت نسیم صاحب پھر یاد آگئے کیونکہ ہم ان کے علاوہ کسی اور سے مشورہ لینے ہی نہیں تھے۔

میں نے نسیم صاحب سے کہا۔ ”نسیم صاحب! بیٹے کو بخاری صاحب کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دویا کا

دیا ہی ہے۔“  
”اوہ..... پھر تو معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔  
”اس بے چارے کو تو خوار خواہ خون سے نہانا پڑا۔“  
”ارے بھائی۔ اس قسم کے علاج میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔“

”لیکن فائدہ تو کچھ بھی نہیں۔ وہ تو دویا کا دیا ہی ہے۔“  
”ہاں، یہ بات قابل غور ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔ ”اب تم ایک اور کام کرو۔“

”چلو، وہ بھی بتاؤ کیا کیا کروں۔“  
”تم اپنے بیٹے کی شادی کرو۔“

”شادی کروں؟“ اس بار تو میں چیخ ہی اٹھا تھا۔  
”کیا کہہ رہے ہیں نسیم صاحب۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس عمر میں شادی کا خیال اسی طرح پریشان کرتا ہے۔“

”رہنے دیں آپ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔“  
”صرف سولہ سال کا ہے۔“

”اس سولہ سال کی عمر میں چند رگت سور یہ کو تین بچے ہو گئے تھے۔“

”ہو گئے ہوں لیکن میرا بیٹا چند رگت سور یہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ صرف نعمان ہے، سیدھا سادہ نعمان۔“

”تو پھر ایسا کرو، اسے لے کر کہیں چلے جاؤ۔“  
”کہاں چلا جاؤں؟“

”کہیں بھی..... اسلام آباد، لاہور، مری وغیرہ کہیں بھی لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے اس پر کوئی اچھا اثر پڑ جائے۔“

”ہاں۔ آپ نے یہ مشورہ ڈھنگ کا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آب و ہوا بدلنے سے شاید کچھ بہتری آجائے۔“

”بس میاں دیر نہ کرو۔ لے جاؤ اس کو۔“  
نسیم صاحب کا یہ مشورہ بہت مقبول تھا۔ میں نے گھر آ کر جب رابعہ سے ذکر کیا تو بات اس کی بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ”ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“

بلکہ یہاں تک ہوا کہ خود نعمان بھی یہ سن کر خوش ہوا کہ گھر والے آؤنگ کے پروگرام بن رہے ہیں۔ اس نے اس پروگرام میں بھرپور دلچسپی لی تھی۔

”ٹھیک ہے ابو۔“ اس نے کہا۔ ”مزہ آئے گا۔ ہم باہر گئے بھی نہیں ہیں۔ لاہور گھومیں گے۔ شادی قلعہ دیکھیں

گے۔ بادشاہی مسجد جائیں گے۔“  
”بیٹا۔ لاہور میں اور بھی بہت کچھ ہے دیکھنے کے لیے۔“ میں پر جوش ہو کر بولا۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ نعمان زندگی کی طرف واپس آ رہا ہے۔“

پھر ہم تینوں لاہور آ گئے۔ نعمان بہت خوش تھا۔ وہ خوب تفریح کرتا۔ ہنستا، بولتا، بالکل پہلے والا نعمان ہو گیا تھا۔ یعنی نسیم صاحب کا یہ مشورہ بالکل درست تھا کہ نعمان کو شہر سے باہر لے جاؤں۔ آؤنگ کے بعد وہ سنبھل جائے گا۔

لاہور میں تو وہ سنبھل گیا تھا لیکن جب ہم ایک ہفتے بعد کراچی لوٹ کر آئے تو پھر وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ یعنی اداس، چڑچڑاہن اور ٹھکان۔

میں پھر نسیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔  
”چلو۔ وہاں جا کر تو ٹھیک ہو گیا تھا۔“ نسیم صاحب نے کہا۔

”نسیم صاحب! اب میں ہمیشہ کے لیے تولا ہو رہی نہیں رہ سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”واپس آنے کے بعد اس کی پھر وہی کڑیٹن ہو گئی ہے بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔“  
”تو پھر ایسا کرو اسے کہ اپنے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“  
”ڈاکٹر کے پاس کیا مطلب؟ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے یا بیمار ہے؟“

”نہیں میاں! ایک تیسری کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔“  
”اور وہ کیا ہے؟“

”میں نہیں ایک قلعہ لکھ کر دے رہا ہوں۔ اسے اچھی طرح یاد کر کے ڈاکٹر کو ستا دیتا۔“

”نسیم صاحب! میرے بیٹے کی ایسی کڑیٹن ہے اور آپ کو شاعری کی سوچ رہی ہے۔“

”دیکھو، جو قلعہ ہے نا، یہ تمہارے بیٹے کی بیماری کا راز ہے۔ تم کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔“

”جیسا سنا میں کیا قلعہ ہے۔“  
ہر دم اداس چڑچڑاہن ہے چھن سے چور

سولہ برس میں کیا مقدر ہے دیکھئے  
گھبرائے اس کو لائے ہیں شخص کے لیے  
بیٹے کو میرے عشق کی شوگر ہے دیکھئے  
ویسے تو یہ قلعہ نسیم صاحب نے میرے بیٹے کے لیے لکھا تھا لیکن آپ بھی اپنے صاحبزادے پر نظر رکھیں۔



## مہفل شہر وسخن

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال  
انسان کو لازم ہے رہے دور ریا سے  
یہ چیز جدا کر لی ہے بندے کو خدا سے  
✽ عبدالرزاق.....  
ستارے چپ ہیں مگر کچھ پتا تو دیتے ہیں  
کوئی بھی ست سہی راست تو دیتے ہیں  
تسلیم اتنی شناسائی بھی عنیت ہے  
سگی کے لوگ مرا گھر بنا تو دیتے ہیں  
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی  
تلقین وفا کی کرتا تھا برمحل وہ شیریں سخن  
جب اس پر وفا کی شرط کی تو عشق سے وہ غافل لگا



✽ راہیل احمد..... رحیم یار خان  
موسم بھی لیا کوئی آیا ہی نہیں ہے  
دہن میں کسی چیز کے سایہ ہی نہیں ہے  
جس پر ستم ایجاد تجھے کہہ سکیں ہم بھی  
کم طرف تجھے وہ ستم آیا ہی نہیں ہے  
✽ محمد شاہد نواز..... عبدالکیم شلیخ خانیوال  
دل کشادہ ہے برا گاؤں کے آگن جیسا  
تک سوچیں ہیں بڑی شہر کی گلیوں جیسی  
✽ کہکشاں..... میر پور خاص  
میں لاکھ محترم ہوتی پر دھوڑتی رہی  
لذت جو تیرے شہر کی رسوائیوں میں ہے  
✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف  
شاخ سے کٹنے کا غم ان کو بہت تھا لیکن  
پھول مجبور تھے ہتے رہے، گل دانوں میں  
✽ محمد آریز ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
اگر نشان سفر تک کہیں نہیں، نہ کسی  
میں ریک ریک کے یہ شب نہیں گزاروں گا  
گلست سے مرا اخلاق ابھی ہے ندیم  
سحر لے نہ لے، رات سے نہ ہاروں گا



✽ ہادیہ ایمان، ماہ ایمان..... فورٹ عباس  
خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے  
دل تپش کو آتش بیجا نہ چاہیے  
✽ محمد اکبر..... اسلام آباد  
اک نہ اک دن ہجر کا موسم گزر رہی جائے گا  
روک سکا ہے کب کوئی وقت کی رفتار کو  
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی  
کس قدر قحط وفا ہے میری دنیا میں ندیم  
جو ذرا ہنس کے لے اس کو مسیحا سمجھوں  
✽ گلگت بانو..... ملتان  
پس دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند  
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں  
یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصیلیں، یہ حصار  
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

✽ عبدالجبار روی انصاری..... پورے والا  
موج مستی بھری ہو زندگی خوش رنگ ہو  
دل کو اچھا لگے کوئی پیار کا رنگ بھرنے والا  
✽ زرین نیازی..... پشاور  
جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی  
وہی سفاک برے دیش کا ہدم کیوں ہو  
✽ امتیاز احمد..... منٹری بہاول الدین  
دشمنیں مجھ میں جڑ پکڑنے لگیں  
اس قدر دشمنوں کی بات ہوئی  
پہلے سارے دیے بجھائے گئے  
اور پھر آندھوں کی بات ہوئی  
✽ نعمان..... دراوہ پٹنڈی  
تری یادیں بھرنی جاری ہیں  
کس مجھ میں، شر بڑھتا جا رہا ہے  
مسکمل ہو رہی ہے نوحہ خوانی  
برے اندر کوئی ماتم سرا ہے  
✽ محمد اقبال..... کراچی  
نبیوں نے چمک سے فریب کھایا ہے  
خدا میں چند ستارے ابھی سیاہ بھی ہیں  
✽ درود ملک..... کراچی  
بس یہ گھنٹا اداس ہے موسم  
دکھ کے باروں کا ذکر مت کرنا  
اس سے کہنا دعا کیوں روشن ہیں  
شب گزروں کا ذکر مت کرنا  
✽ ندیم احمد..... انک  
سنا ہے روشنی وہ باؤلی سی  
اندھروں سے محبت کر رہی ہے  
خطوں میں بھیج کر وہ خشک پتے  
چرائی کی وضاحت کر رہی ہے  
✽ خالد انصاری..... حیدرآباد  
سائے کشیں گے کہ ظلمت پہ کوئی آج نہ آئے  
تیرگی چاہے گی، لیکن نہ اماں پائے گی  
✽ جہانزیب..... لاہور  
ہو کا عالم ہے کسی شہر قموشاں کی طرح  
اس خرابے میں اڑاں دینے کو جی چاہتا ہے

✽ نور الدین..... سرگودھا  
یہ مہریاں سی لگا ہیں سپردگی کی دید  
میں جانتا ہوں یہ اس کی ادا دہا ہے سب  
✽ عامر خان..... چنیوٹ  
شام ہے دل اداس بھی ہے بہت  
اداسی کہ راس بھی ہے بہت  
تم مجھے درد دینے آئے ہو؟  
درد تو میرے پاس بھی ہے بہت  
✽ محمد عمران..... وہاڑی  
ضبط کا حوصلہ نہ پوچھ ابھی  
وقت کیسے کٹا، نہ پوچھ ابھی  
پہلے یہ تھلیاں اٹھانے دے  
گیا ہوا سانچہ نہ پوچھ ابھی  
✽ ارم اور لیس..... گھنگی  
جس میں رہی تھی زندگی کی گلن  
اب نہ اس گھر نہ اس سگی کا پتا  
جس کے بس میں نہیں رہا کچھ بھی  
تم کو کیا اس کی بے بسی کا پتا  
✽ عابد علی..... کوئٹہ  
وہ دن گئے کہ کوئی کہیں بولتا نہ تھا  
اب چپ رہیں گے شہر میں دیوار و در کہاں  
✽ مدحت..... کراچی  
ایک دن دیکھتا ہوں جا میں گے منظر سارے  
خواب رہ جائیں گے تسکین نظر کی خاطر  
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
زیست میں جاں سے گزرتا بھی پڑا تو سن لے  
خود سے پہلے تو گزرتے نہیں دیں گے تجھ کو  
✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی  
خود کو مشکل میں ڈالتا ہے ابھی  
اس کو دل سے نکالتا ہے ابھی  
ایک صحرا کی خاک چھائی ہے  
اک سمندر کھگلتا ہے ابھی  
✽ محمد عامر..... میانوالی  
وہ آنکھیں دیواریں کھتی رہتی ہیں  
ان آنکھوں میں جیسے کوئی قصہ ہے



## بددعا

محمد طارق انجم

عمروں کے تضاد کو فراموش کر کے بے اختیار چاہنے والے اس عاشق نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وقت نہ صرف آنکھیں بلکہ کان بھی رکھتا ہے اور جب ان مشکل لمحوں میں کسی کی زبان سے بددعا نکلی تو قبولیت کی اس گھڑی میں اس عاشق کے دل سے بھی ایک انوکھی دعا نکل گئی... اور پھر اُنے والے اس وقت نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ اس نے سنا اور قبولیت کی بساط میں لپیٹ کر جب وہ منظر ان دونوں کے سامنے لا کھڑا کیا تو دیکھنے والے ان لڑخیز لمحات میں ششدر رہ گئے۔

کچھ خاص لمحوں کی گرفت میں قید ہونے

والے لفظوں کا ماحیرا



قیس اور چھاتی گاڑی لال علی پر رک گئی اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اجماع تاج احمد نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی مل وقت دیکھا اور اپنے موبائل فون کی اسکرین روشن کرنے کے بعد ایک لمبے کے لیے کچھ سوچا اور پھر موبائل فون ایک طرف رکھ دیا۔

تاج احمد کی عمر ساٹھ سال سے زائد تھی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن چہرے پر بڑھاپا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک کامیاب کاروباری

نزدہیب احمد ملک... گلستان جوہر کراچی لوگ کانٹھوں پہ غبار اپنا لیے پھرتے ہیں تم خدا کے لیے ایسی نہ مسافت کرنا محمد طلحہ... کراچی وہ اور ہوں گے جو ہوں گے ترے قریبوں میں بری تو خیر سے دلہیز تک رسائی ہے زینب... فیصل آباد تلاش منزل شوق و طلب میں نکلے تھے ظلم ہوش رہا ہو گیا سفر کیسے طارق احمد... راولپنڈی شہر کو کیا ہو گیا ہے دوست دشمن ہیں کہاں ماسوا اپنے کوئی اپنا تماشائی نہیں کوکب خواجہ... میرپور خاص اس طرح ٹوٹ کے بڑسا ہے دکھوں کا بادل بخو حیرت ہے مرے ساتھ شریک غم بھی شازیہ... کراچی لوگوں کو جس نے دی تھیں دعائیں تمام عمر لوگوں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا رضیہ غیر... سکس اک دھڑے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں سلیمان احمد... گوجرانوالہ شہر دل میں جم گئی آوارہ سناٹوں کی گرد ایک مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں افشین نیازی... پشاور پوچھ گچھ ہیں اس نے کیسے نظر کی پہیلیاں وہ شخص تو بلا کا نظر ناشناس تھا رضوان احمد... جھنگ شہر ہوئی اور جھنگل کرتے تاروں کا اک اک کر کے سارا لشکر لوٹ گیا

نام: \_\_\_\_\_

پتا: \_\_\_\_\_

کوین

ستمبر

2018



مفتض تھا۔ دولت کی ریل جیل تھی۔ وہ اپنی آسودہ زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس کی بیوی اس کی بھترین دوست تھی اور اس کی اولاد اس کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو چکی تھی۔ رات کو اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں محفل جم جاتی اور پھر بھر پور آسودہ غیند کے لیے وہ اپنے بیڈ پر چلا جاتا۔

تاج احمد کے دن رات بہت مزے میں مگڑ رہے تھے۔ دولت کا انبار بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک تاج احمد کی گاڑی کا شیشہ کسی نے اپنی انگلی سے بھجایا تو اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ باہر اجڑے پال، بڑھی ہوئی شیعہ اور میلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا اور جو بھی تاج احمد نے اس آدمی کی طرف دیکھا باہر کھڑے آدمی کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم جی گئیں۔ تاج احمد پہلے تو اس شخص کی طرف ایسے ہی دیکھتا رہا پھر اسے لگا وہ چہرہ آشنا ہے، اس نے غور سے دیکھا تو اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں، وہ حیرت سے چونک پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔ دونوں کے چہرے حیرت زدہ تھے۔ اچانک باہر کھڑے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے بتانے کی کوشش کی کہ وہ ان ہی سڑکوں پر ہوتا ہے، یہی یہاں، یہی وہاں اور یہی اس جگہ سے کچھ دور۔ لیکن اس کا ٹھکانا یہی سڑکیں ہیں۔ پھر اس نے اپنے میلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جیسے وہ تیار ہا ہو کر دیکھ لو ہیرا کیا حال ہے۔

لال جی بند ہوئی اور سبز پتی روشن ہوئی۔ تاج احمد کی گاڑی کو اس کے ڈرائیور نے آگے بڑھا دیا۔

”ایک طرف گاڑی روکو۔“ تاج احمد نے جلدی سے کہا۔ ڈرائیور نے چوک عبور کیا اور گاڑی سڑک کی ایک طرف روک دی۔ شدید گرمی اور جس میں تاج احمد اپنی ٹھنڈی کار سے باہر نکلا اور تیزی سے اس طرف بھاگا جہاں اس نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ اس کی منگھائی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں لیکن وہ شخص کہیں دکھائی نہیں دیا۔

تاج احمد اسی جگہ پہنچ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ چاروں طرف گھوم رہا تھا مگر وہ شخص ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے وہ اس جگہ دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ تاج احمد بے قراری سے تلاش کرتا رہا۔

☆☆☆

تاج احمد کی گاڑی اس کے پچھلے کے وسیع گیراج میں کھڑی ہوئی تو وہ مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکلا۔ حسب معمول اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی جسم میں وہ چستی تھی جو ہر ایک کو دیکھنے والی تھی۔ وہ اندر گیا تو اس کی بیوی فرزانہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ تاج احمد کو دیکھ کر وہ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج آپ نے دیر کر دی۔ کہیں رک گئے تھے کیا؟“

تاج احمد اس کی طرف دیکھ کر چونکا اور بولا۔ ”نہیں! بس رات سے بی بی آتے ہوئے دیر ہو گئی۔“

فرزانہ نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”مجھے آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“

”نہیں! کسی کوئی بات نہیں ہے۔“ تاج احمد نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تاکہ معمول کے مطابق اس کی بیوی کو گلے کر اس کے شوہر کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے اور نہ ہی پندرہ سال کے بعد اچانک اس شخص کو دیکھ کر اس کے اندر کی جو کیفیت ہے وہ اس کی بیوی پر عیاں ہو سکے۔

”آج ڈنر سمرقند کی طرف ہے، آپ کو یاد ہے؟“

فرزانہ نے یاد دلایا۔

”مجھے یاد ہے۔ فی الحال مجھے اچھی سی چائے بنا دو۔“ ایک بار پھر تاج احمد نے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حالانکہ اس وقت اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنے اندر کی کیفیت کو چھپانے کے لیے اسے چائے کا کپڑا پڑا۔

فرزانہ کے سامنے تاج احمد نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنے اندر کی کیفیت کو اس کے سامنے عیاں نہ ہونے دے لیکن فرزانہ بھانپ گئی تھی کہ تاج احمد کو کوئی پریشانی ہے۔ فی الحال اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اور ملازم کو آواز دے کر چائے بنانے کا کہہ دیا تھا۔

کمرے میں جا کر تاج احمد نے اپنی ٹائی کھول کر بیڈ پر ایک طرف اچھال دی۔ تاج احمد کا یہ بھی معمول تھا کہ وہ جب بھی کپڑے بدلے۔۔۔ الماری میں پتنگ کر دیتا تھا۔ اس نے بھی ٹائی، یا اپنی شرٹ اس طرح سے بیڈ پر نہیں پھینکی تھی۔ یہ اس کے اندر کی پریشانی تھی جس نے اسے ارد گرد سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کی سوچیں ایک حصار میں قید

ہوئی تھیں۔

پندرہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ پندرہ سال کے بعد وہ اچانک اسے سڑک پر بھکاری کی حالت میں ملا تھا۔ اسے ایک بھکاری کی شکل میں دیکھ کر تاج احمد کی روح کانپ گئی تھی۔ اسے اور بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ بہت سی باتیں اس کے دماغ میں سمجھوڑے کی طرح برسنے لگی تھیں اور اس کا جسم پسینے میں جھپک گیا تھا۔ وہ ان باتوں کو سوچ کر اور بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اپنی سائنس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، اسے لگا جیسے وہ ابھی بے جان ہو کر گر جائے گا۔

تاج احمد ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو ڈرائیور بھاگ کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ تاج احمد نے اس سے گاڑی کی چابی لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی پچھلے سے باہر نکل اور چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ فرزانہ ایک طرف کھڑی تاج احمد کو اس جگہ میں جاتا ہوا حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک بار تاج احمد کی گاڑی اسی سڑک پر ایک طرف کھڑی ہوئی اور وہ کسی لوہانے کی طرح منگھائی نگاہوں سے اس بھکاری کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ بھاگ کر بھی ایک طرف تو بھی دوسری طرف چلا جاتا تھا۔ ہر لمحہ اس کی پریشانی اور بے قراری دو چند ہوتی جا رہی تھی۔

تاج احمد کا جسم گرمی کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک اور بھکاری پر پڑی جو سڑک کے ایک طرف کھڑا تھا۔ تاج احمد نے اس کی طرف جاتے ہوئے اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کے پاس چلا گیا۔ تاج احمد نے ایک بار اس کی نگاہوں کے سامنے پانچ سو کا نوٹ لہرایا اور پوچھا۔

”یہاں ایک بھکاری تھا۔۔۔ اس نے جینز کی پرانی اور پچنی پینٹ پہنی ہوئی تھی اور اس طرح کی لال شرٹ اس کے بدن پر تھی۔۔۔“

”ہیرو کا پوچھ رہے ہو صاحب!“ اس بھکاری کی لڑائی لگاں تاج احمد کے ہاتھ میں پکڑے پانچ سو کے نوٹ پر تھیں۔

”اسے ہیرو کہتے ہو تم لوگ؟“

”وہ ہیرو ہی ہے۔ ہیرو کے نام سے ہی اسے جانتے تھے۔ کہتا ہے کہ وہ بڑا امیر کبیر تھا۔“ بھکاری کہتے ہوئے

ہٹا۔ ”بہت خوشگیا کرتا ہے، ایک سے بڑی ایک گپ سنا رہا ہے۔“

”وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟“ تاج احمد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

بھکاری نے زبان کھولنے سے قبل پانچ سو کے نوٹ پر اپنی نظریں جمادیں۔ تاج احمد اس کا ارادہ بھانپ کر بولا۔

”یہ نوٹ تمہیں ہی ملے گا، بتاؤ وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔“

”اس وقت اس کا پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہوگا، لیکن شام ہوتے ہی وہ سائیکل دو بار کے پیچھے جو نہر ہے اس نہر کے ساتھ بھی جائے گا ہوں ہوتا تھا جو اب بند ہو چکا ہے اور وہاں ڈھانچا کھڑا ہے وہ اسی جگہ ملے گا۔ وہ اس کا پکا ٹھکانا ہے۔“

”تم مجھے سچ بتا رہے ہو؟“ تاج احمد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے صاحب۔“ وہ مسکرایا۔ تاج احمد نے پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بھکاری نوٹ پکڑتے ہی اس جگہ سے ایسے نوڈو دگیا کہ ہوا گو یا اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ یا اسے ڈر ہو کہ کہیں وہ آدمی اس سے نوٹ واپس چھین نہ لے۔

تاج احمد نے اپنی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ وہ چلتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس پہنچا اور اندر بیٹھتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

جب تاج احمد اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس وقت فرزانہ لان میں بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں تاج احمد پر مرکوز تھیں۔ تاج احمد او اس اور سوچوں کی فکری میں الجھنے لگا تھا اندر کی طرف بڑھا تو اچانک اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا اور اس کے قدم رک گئے۔ وہ فرزانہ کے پاس چلا گیا۔

”مجھے چائے کا کہہ کر آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ایک کام یاد آ گیا تھا۔“

”بہت اہم کام تھا؟“

”ہاں بہت اہم کام تھا۔“

”مجھے نہیں بتائیں گے کیا کام تھا؟ آپ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔“ فرزانہ کی نگاہیں اپنے شوہر کا جائزہ



بھی لے رہی تھیں۔

تاج احمد نے سوچا اور پھر بولا۔ ”بتاؤں گا۔۔۔ لیکن ابھی نہیں۔“ تاج احمد نے کہتے ہی جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ فرزانہ کی نگاہوں میں تشویش تھی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی تاج احمد جب اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو فرزانہ نے عقب سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”ایک کام سے جا رہا ہوں۔“

”ایسا کونسا کام ہے جو مجھے بھی نہیں بتایا جا رہا ہے؟“ فرزانہ نے کہا۔ ”میں پریشان ہوں۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی مجھے جانا ہے۔“ تاج احمد اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

”مجھے پریشانی ہو رہی ہے، مجھے بتائیں کیا بات ہے، آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ فرزانہ تیزی سے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ تاج احمد نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”مجھے کسی سے ملنا ہے، وہ دل جائے تو پھر سب کچھ بتا دوں گا۔ تم گھر نہ کرو۔“ تاج احمد یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ فرزانہ اسی جگہ کھڑی رہ گئی۔

تاج احمد کی گاڑی جانے کے اس دیر ان کھوکھے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کھوکھے کے اندر فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور وہی بھکاری لیٹا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اور پھر تاج احمد کو دیکھ لیا تھا۔

تاج احمد اس کے پاس چلا گیا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر ایک دم سے وہ بھکاری اپنی جگہ سے اٹھا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔

”میرے اس گھر میں آپ کو بھانے کے لیے کوئی کرسی نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو یہاں بٹھائیں سکا۔“ ”میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔“ تاج احمد کے چہرے پر حیرت تھی۔

”ظاہر ہے ایک امیر کبیر آدمی ایک بھکاری کے پاس بیٹھنے کے لیے تو نہیں آسکا، اسے تو کوئی اور ہی مطلب ہوگا۔ کوئی ایسی فکر ہوگی جس نے اسے بے چین کر دیا ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

”تم ان باتوں کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔“ تاج احمد ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

”مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ اس نے بدستور

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔“

”میں اپنے اس گھر میں خوش ہوں۔ تم نے مجھے دیکھ لیا اور اب مل بھی لیا ہے۔ ہم دونوں کی ایک ایک بات پوری ہو چکی ہے، اور آگئی بات میرا خیال ہے کہ جلد ہی پوری ہو جائے گی اور پھر۔۔۔ ہم دونوں کے گھر ہم سے خالی ہو جائیں گے۔“ اس کے لہجے میں کرب تھا جو وہ دونوں ہی محسوس کر سکتے تھے۔

”تم میرے ساتھ چلو، ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو معاف کر دینے سے شاید دوسری بات پوری نہ ہو۔“ تاج احمد نے جلدی سے کہا۔

”اب کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی بیت چکی ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے زندہ تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے اور اب موت ہم کو دیوچ لے گی۔“

”دیکھو مظہر حسین۔۔۔“ تاج احمد نے ابھی اس کا نام لیا ہی تھا کہ وہ ایک دم سے چونکا اور بولا۔

”کئی سالوں کے بعد میرا نام کسی نے لیا ہے۔ میں تو اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔ سب مجھے بھرا کہتے ہیں۔ آج اپنے سالوں کے بعد اپنا نام سن کر مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ کیا واقعی میں مظہر حسین ہوں؟“

”تم مظہر حسین ہو، میرے دوست ہو، آؤ میرے ساتھ چلو ہم گھر چلتے ہیں۔“ تاج احمد نے تڑپ کر کہا۔

”دوستی تو بہت سال پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اب محض جان پہچان ہے۔ تم تاج احمد ہو اور میں مظہر حسین ہوں۔ میری اس دنیا میں تجھے کوئی نہیں جانتا اور میری دنیا میں میری حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہیں ہے۔“ مظہر کی آنکھیں جھپک جھپک تھیں۔ ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

”مظہر تم میرے ساتھ چلو ہم بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں میں پھر اسی دنیا میں لوٹا دوں گا جس دنیا کا تم حصہ تھے۔“ تاج احمد نے کہا۔

”اب یہی میری دنیا ہے اور میں اس دنیا کا حصہ ہوں۔ اب میں لوٹ کر کیا کروں گا، اب تو موت کسی بھی وقت ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر ہرنا ماتم کر دے گی۔“

تاج احمد تڑپا۔ ”تم ایسی باتیں مت کرو۔“ ”یہی حقیقت ہے تاج احمد۔۔۔ تم نہیں جانتے تم نے

مجھے کیا کہا تھا اور اپنے کہے کی حقیقت کو تم دیکھ رہے ہو اور میں نے کیا کہا تھا؟ تم کو نہیں لگتا کہ ہم عقرب ایک اور حقیقت کا سامنا کرنے والے ہیں۔“ مظہر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تاج احمد کو محسوس ہو بیٹھے کہ جسم میں بیڑیاں رہ گئے تھیں۔

”تم ابھی میرے ساتھ چلو اور ان باتوں کو چھوڑ دو۔“ تاج احمد کو پریشانی ہونے لگی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم جاؤ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کے پاس وقت کم ہے۔ ہم آئندہ جب جاؤ مجھے یہاں لٹے اور دیکھنے کے لیے آسکتے ہو، ہم دونوں کا سامنا شاید بہت اذیت ناک ہو۔“ مظہر یہ کہہ کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اس کے سامنے تاج احمد ناچار کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ اس کے اندر کا کرب اور بے چینی اسے بے حال کر رہی تھی۔ مظہر نے اس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

تاج احمد اور فرزانہ کو رات کے کھانے پر جانا تھا لیکن دونوں ہی تیار ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ تاج احمد کا چہرہ اداس اور پریشان تھا۔ جبکہ فرزانہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ تاج احمد نے خود فرزانہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا اور اب فرزانہ اس انتظار میں تھی کہ وہ کیا بات کرتا ہے۔ مزید کچھ توقف کے بعد تاج احمد نے اداس لہجے میں کہا۔

”تم میرے دوست مظہر حسین کو جانتی ہو۔۔۔“ ”ہاں جانتی ہوں۔“ اس کا نام سن کر فرزانہ بھی ایک دم سے چونکی۔ ”کیا وہ ملا آپ کو؟“

”ہاں۔“ ”کہاں اور کس حال میں؟“ فرزانہ نے تیزی سے پوچھا۔ یہ سن کر فرزانہ کے جسم میں بھی بے چینی دوڑنے لگی تھی۔

”میں نے اسے اسی حال میں دیکھا ہے جس حال کی میں نے اسے بدعادی تھی۔“ تاج احمد نے بتایا تو خوف سے فرزانہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کی آنکھیں کھلی کھلی رہ گئیں۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ خوفزدہ لہجے میں فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگتا ہے۔“ تاج احمد کی بات سن کر فرزانہ کی سانس رگ رہی تھی اور چہرے پر خوف مترشح تھا۔

دونوں پندرہ سال پہلے چھپے چھپے گئے۔ دونوں کو وہ ساری باتیں یاد آئے تھیں، اور وہ حالات ان کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

پندرہ سال پہلے۔۔۔ تاج احمد اور مظہر حسین بہت گھرے اور بے تکلف دوست تھے۔ مظہر حسین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے باپ کا۔۔۔ بڑا کاروبار تھا اور اس لیے مظہر کو کامیاب کاروبار کی کرسی پر بیٹھنے ہی دولت کمانے کی کوئی گھڑی نہیں کرتا پڑی تھی۔

تاج احمد اپنا کاروبار ریٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت حد تک اپنے کاروبار میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دونوں کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی، وہ ایک ساتھ گپ شپ لگاتے تھے، ایک ساتھ گھومتے تھے اور اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے نہیں چھپاتے تھے۔

تاج احمد کی شادی ہو چکی تھی جبکہ مظہر ابھی شادی کرنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ تاج احمد کی ایک چھوٹی بہن تھی۔ تاج احمد اس کی شادی کی فکر میں تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کی شادی اچھی جگہ کرے۔ اس کے لیے وہ کوشش بھی کر رہا تھا۔

ایک دن اس نے اس بات کا تذکرہ مظہر سے کر دیا۔ مظہر چونکہ اس کی بہن کو دیکھ چکا تھا اور دل ہی دل میں پسند بھی کرتا تھا لیکن اس نے اس لیے اٹکھار نہیں کیا تھا کہ دونوں میں عموں کا کافی فرق تھا اور پھر تاج احمد اس کا دوست تھا۔ جب وہ اس کے گھر جاتا تھا تو تاج احمد کی بہن مظہر کو اٹکھار کھتی تھی۔ وہ یہ لفظ سن تو لیتا تھا لیکن اس سے برداشت کرنا مشکل ہوتا تھا۔

مظہر کی بارسوج چکا تھا کہ وہ کیسے تاج احمد سے بات کرے۔ اس کے اندر ہمت بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں تاج احمد نے اپنی بہن کا رشتہ ایک بہت اچھے گھرانے میں طے کر دیا۔ وہ گھرانہ ایسا تھا جیسا تاج احمد چاہتا تھا۔

مظہر کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ نہیں اور ہو گیا ہے۔ اس کے دل پر مائنس لوٹنے لگے تھے۔ وہ مضطرب ہو گیا اور چاہتا تھا اس سے قبل کہ تاج احمد کی بہن کی شادی ہو جائے تو تاج احمد سے بات کر کے اس رشتے کو ختم کرا کے اس سے خود



شادی کر لے۔

بات بھر اسی جگہ رک جاتی تھی کہ وہ بات کہے کرے؟ ایک دن اچانک مظہر کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو تاج احمد کی بہن کے منگیت کا بہنوئی تھا اور اس سے مظہر کی اچھی جان پہچان تھی۔

اس ملاقات کے بعد مظہر کے دماغ میں بات آئی کہ وہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ ختم کر دے اور جب ایسا بار بار ہونے لگے تو تاج احمد تھک جائے اور وہ مایوس ہو جائے تو وہ اپنی بات کر لے، تاج احمد کیونکہ مایوس ہوگا اس طرح وہ اس سے اپنی بہن کی شادی کرنے پر رضا مند ہو جائے گا۔

اس شیطانی سوچ نے مظہر کو ایک اور ایسے شخص سے ملوایا جو لوگوں کے رشتے کرانا تھا اور وہ چرب زبان بھی تھا۔ مظہر نے سوچا وہ اس شخص کے ذریعے سے تاج احمد کی بہن کا رشتہ آسانی سے ختم کر دیا کرے گا، جہاں بات چلے گی وہاں وہ اس آدمی کو پہنچ دیا کرے گا اور یوں بات چلنے سے پہلے ہی ختم ہو جایا کرے گی۔

تاج احمد کی بہن کا اب جہاں رشتہ ہوا تھا اس جگہ اس کا اپنا تعلق تھا، اس لیے وہ خود ہی اس رشتے کو ختم کر سکتا تھا۔ ایک دن وہ پھر لڑکے کے بہنوئی سے ملا اور اسے کھانے پر باہر لے گیا۔ باتوں باتوں میں مظہر نے تاج احمد کا ذکر کر دیا اور جھجکتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کہوں..... رشتہ طے کرنے سے پہلے آپ نے تاج احمد کے بارے میں چھان بین کر لی تھی کیا؟“

”آپ کھل کر بات کریں کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ الیاس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ سے بھی پرانی جان پہچان ہے اور تاج احمد بھی میرا پرانا دوست ہے۔ چپ رہوں تو ایک کی بچت ہوتی ہے اور دوسرا خاندان..... خیر چھوڑیں بہتری کی دعا کرتے ہیں۔“ مظہر نے جان بوجھ کر اپنی بات کو دھوڑا چھوڑ دیا تھا۔

الیاس کے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا اور وہ اب جاننا چاہتا تھا کہ تاج احمد کے خاندان میں ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس سے اس گھرانے میں رشتہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

”اب آپ کو کھل کر بات کرنا ہی پڑے گی۔ مجھے بتائیں اصل حقیقت کیا ہے۔“

”میں تو سچ میں نہیں کیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ دوستی کا ساتھ دوں، یا آپ کا بھل کو کوئی بات نکل سکتی تو میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گا۔“ مظہر نے اپنے آپ کو تحفظ دینا چاہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔“ الیاس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”بات یہ ہے کہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ کہیں ہوتا نہیں ہے۔ چنانچہ کیا بات ہے، جہاں اس کی بہن کا رشتہ طے ہو جاتا ہے ایک دو ماہ کے بعد وہ گھرانا مختلف مسائل میں گھر جاتا ہے اور لڑکی کو جواب دے دیا جاتا ہے، ایسا تم بار ہو چکا ہے۔“ مظہر نے جھوٹ کا سیدھ الیاس کے کان میں انڈر لایا۔

اس نے حیرت سے مظہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ پہلے بھی تین جگہ سے اسے جواب مل چکا ہے؟“

”جی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔“ مظہر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اے تین جگہ سے جواب مل چکا ہے۔“

”یہ بات تو تاج احمد نے ہمیں بتائی نہیں تھی۔“ الیاس نے تشویش بھری آواز میں کہا۔

”تاج احمد اگر یہ بات بتاتے تو کیا اس کی بہن کا رشتہ کہیں ہوگا؟ اس لیے وہ چپ ہے۔“ مظہر نے کہا۔

”شادی کے لیے تو ہم کو بھی زور دے رہا ہے۔“

”اسی لیے زور دے رہا ہے تاکہ کچھ ہونے سے پہلے اس کی شادی ہو جائے۔“ مظہر بولا۔

”تمہیں اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔“ الیاس گردن ہلاتے ہوئے پر تشویش لگے میں بولا۔

”دیکھیں الیاس صاحب! اب میرا نام کہیں نہ آئے۔ دراصل سچ میں اپنے اندر دباؤ نہیں سکتا۔ یہ تو آپ مجھے اچانک مل گئے اور بات تاج احمد تک چلی گئی اور مجھے جانا پڑا۔ اگر آپ نہ ملتے اور میری آپ سے جان پہچان نہ ہوتی تو میں ایسی بات نہ توڑی کرتا۔“

”آپ کی مہربانی ہے آپ نے مجھے یہ اہم بات بتائی۔ آپ بے فکر رہیں آپ کا نام نہیں آئے گا۔“ الیاس نے کہا۔

”آپ کبھی یہ بھی ظاہر نہیں کریں گے کہ میری آپ کی پرانی جان پہچان ہے۔“ مظہر نے تاکید کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا نا آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، سمجھ لیں کہ آپ نے مجھ سے کوئی

بات کی ہی نہیں ہے۔“ الیاس نے اطمینان دلایا اور ساری بات لڑکے کے والدین سے کر دی۔ وہ سب سن کر تشویش میں مبتلا ہو گئے اور سوچنے لگے کہ وہ اب کیا کریں؟

تاج احمد چاہتا تھا کہ بہن کی شادی جلدی ہو جائے اور اس سلسلے میں جب اس نے دوبارہ رابطہ کیا تو لڑکے کے باپ نے رشتے سے انکار کر دیا۔ یہ سن کر تاج احمد کے حیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا جو آپ نے رشتہ ہی ختم کر دیا ہے؟“ تاج احمد نے خیر ہو کر پوچھا۔

لڑکے کا باپ صاف گوانسان تھا۔ اسے بات سمجھا کر کرنے کی عادت نہیں کی لہذا اس نے تمام صورت حال سچ سچ بیان کر دی اور بات عمل کرنے کے بعد کہا۔ ”آپ نے ہم سے جھوٹ بولا ہے اور حقیقت کو چھپایا ہے۔ اس لیے ہم رشتے داری نہیں کر سکتے۔“

ایسی کوئی حقیقت نہیں تھی اس لیے سب کچھ سننے کے بعد تاج احمد دم بخود ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا جھوٹ اور بہتان کس نے باندھا ہوگا۔ تاج احمد نے کوشش کی کہ وہ اس جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر سکے لیکن لڑکے کا باپ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا اور اب اس کی کوشش تھی کہ تاج احمد اٹھ کر چلا جائے۔

جب تاج احمد نے بار بار سچ کہنے کی کوشش کی اور لڑکے کے باپ نے اس کی بات کو شروع ہونے سے قبل ہی ٹوکنا شروع کر دیا تو تاج احمد کو بھی غصہ آ گیا اور وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”آپ کا داماد بہت بڑا جھوٹا ہے جس نے جان بوجھ کر ایسا جھوٹ بولا ہے، یقیناً وہ اس رشتے پر خوش نہیں ہے۔“

”آپ ہمارے داماد کو جھوٹا مت کہیں، اس نے سچ بات کی ہے۔“ لڑکے کے باپ نے جلدی سے کہا۔

”یہ سچ نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور اپنے داماد صاحب کو بلا کر پوچھیں کہ ان کے دل میں ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اس رشتے کو ختم کرانے کے لیے ایسی بکواس کی ہے۔“

”آپ زبان سنبھال کر بات کریں۔“ لڑکے کے باپ کو بھی غصہ آ گیا۔

”میرے سامنے آپ کا داماد اس بات کا ثبوت لائے کہ ہم نے اپنی بہن کی پہلی بھی نہیں کی تھی، اگر وہ

## واہیوں کا سنگم - گلگت

پاکستان کے شمالی علاقہ جات کا جب ذکر ہوگا تو سب سے پہلے گلگت کا نام لب پر آئے گا۔ گلگت ایسا مرکزی مقام ہے جہاں سے نہ صرف کشمیر، اسکرو، شیندر، چترال اور ہنزہ کے لیے راستے نکلتے ہیں بلکہ چین جانے کے لیے بھی یہاں قیام کرنا ضروری ہے۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو اور دیو سالی کے پھولوں پھرے دلدلی میدان کو عبور کرنے والے سارچ بھی گلگت سے ہی تازہ دم ہو کر چلتے ہیں۔ دنیا کی حسین ترین چوٹی راکا پوچی جسے سلیپنگ بیوٹی (Sleeping Beauty) بھی کہا جاتا ہے اور وادی نگر میں واقع ہونے کے باوجود ہنزہ کا چہرہ تصور ہوتی ہے، اس کا نظارہ کرنے کے لیے بھی گلگت پہنچنا لازمی ہے۔ بعض من چلے..... ٹانگہ پر بت جانے کے لیے بھی پہلے گلگت آتے ہیں اور وہاں سے تازہ معلومات کے کرخت سبز باندھتے ہیں۔ واہ..... واہ! کیا کہتے قدرت کے ان حسین نظاروں کے..... اب حکومت کا فرض ہے کہ یہاں پر زیادہ سے زیادہ سہولتیں سیاحوں کو مہیا کریں تاکہ ایک قابل قدر آمدنی اور زرمبادلہ حاصل ہو سکے۔

ڈاکٹر منیر مرزا کے سفر نامے پر بتوں کا شیندر سے اقتباس  
مرسلہ: ریاض، ہٹ، حسن ابدال

ایسا نہ کر سکتے تو اسے اپنے گھر سے دور کر دیں ورنہ وہ آپ کو اور بھی نقصان پہنچائے گا۔“ تاج احمد نے غصے میں یہ بات کہہ دی اور وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد لڑکے کے باپ نے الیاس کو فون کیا اور وہ سب بتا دیا جو تاج احمد نے اس کے بارے میں کہا تھا، حالانکہ اسے چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یہ باتیں الیاس تک نہ پہنچاتا۔ الیاس نے سنا تو وہ ایک دم سچ پا ہو گیا اور بولا۔

”اے ثبوت چاہیے تو میں اسے ابھی ثبوت دیتا



ہوں۔“

الیاس نے..... غصے اور جذبات میں آکر... تاج احمد کو فون کیا اور بتا دیا کہ اس کو یہ باتیں کس نے بتائی تھیں۔

تاج احمد سن کر شہر رو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ باتیں اس کا دوست مظہر کر سکتا ہے، وہ اسی وقت مظہر کے پاس پہنچ گیا، اس کے ساتھ فرزانہ بھی تھی۔

تاج احمد اور فرزانہ کو دیکھ کر مظہر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج تو آپ دونوں نے میرے اس غریب خانے میں آکر کھٹکھٹاں بکھیر دی ہے۔“

”سنا تھا جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی دوسروں کو دیتا ہے، ہمارے پاس کھٹکھٹاں ہے اور ہم نے تمہیں وہ دے دی، تمہارے پاس جھوٹ اور کاٹنے کی تم وہی کچھ بانٹ رہے ہو۔“ تاج احمد نے اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مظہر نے دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہم نے تمہارا کیا رنگاڑا تھا۔ میری بہن کا کیا تصور تھا کہ تم نے جھوٹ بول کر میری بہن کا رشتہ ختم کر دیا؟“ تاج احمد کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں غصہ لاوا بہن کر دوڑ رہا تھا۔

مظہر فوراً سمجھ گیا کہ ان کو حقیقت کا پتا چل گیا ہے۔ حالانکہ اس نے اسے پابند بھی کیا تھا کہ وہ اس کا نام نہیں لے گا۔

”میں تمہاری بہن کا رشتہ کیوں ختم کراؤں گا؟ تم کو شاید کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ مظہر نے فوراً اقرار کرنے کے بجائے اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

تاج احمد نے وہ ساری باتیں مظہر کو بتا دیں جو لڑکے کے باپ نے بتائی تھیں اور پھر الیاس کا بھی تذکرہ ہو گیا۔ اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ مظہر نے سوچا کہ وہ بجائے اس بات کو انکار کی دلدل میں دھکیل کر گئی میں ہی سر ہلاتا رہے، بہتر ہے کہ بتا دے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

”میں مانتا ہوں کہ مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں مجبور تھا۔“ مظہر بولا۔

”تمہیں ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم نے میری بہن کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا۔“ تاج احمد کا غصہ ابھی تک اسی

طرح قائم تھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہاری بہن کو پسند کرتا ہوں۔“ مظہر نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

یہ سنتے ہی تاج احمد نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور چٹا۔ ”تیس یہ بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ تم نے اپنی اور میری بہن کی عمر دیکھی ہے۔ تم نے یہ دیکھا کہ تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے اور میری بہن تمہیں چاہتی ہے۔“

”وہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن میں تمہاری بہن کو پسند کرتا ہوں۔“ مظہر نے کہا۔

”میں تمہیں جان سے مار دوں گا تم نے ایسا سوچا بھی کبھی۔“ تاج احمد کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت مظہر کے گلے پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مظہر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔ فرزانہ بھی آگے بڑھی اور کوشش کرنے لگی کہ وہ تاج احمد کی گرفت سے مظہر کو چھڑا سکے لیکن جنون اور غصہ ایسی طاقت بن چکا تھا کہ تاج احمد کی گرفت ڈھیلی نہیں ہو رہی تھی۔

مظہر کی آنکھیں اٹلی رہی تھیں اس نے پوری قوت ایک جگہ جمع کی اور ایک جھٹکے سے تاج احمد کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ تاج احمد ایک طرف گر گیا اور مظہر اپنی سانسیں ٹھیک کرنے لگا۔

جو بھی مظہر کی سانسیں ٹھیک ہوئیں اس نے بولا شروع کر دیا۔ ”کسی سے بھی محبت ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ محبت عمروں کا فرق نہیں دیکھتی، محبت بس ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی تمہاری بہن سے محبت ہو گئی ہے۔ میں اسے اپنا چاہتا ہوں۔“

”اپنی بواں بند کرو۔“ تاج احمد ایک بار پھر چٹا۔

”بہتر ہے کہ تم اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دو۔“ مظہر نے بہت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”ورنہ تم کیا کر دے؟“ تاج احمد نے اسے گھورا۔

”ورنہ میں اس کی شادی نہیں نہیں ہونے دوں گا۔“ مظہر نے ہنسنے لگے۔

”ہے۔“ مظہر نے کہا۔

تاج احمد کرب بھری آواز اور غصے کے لاوے میں بہ کر بولا۔ ”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے، تم نے میری بہن کا گھر بسنے سے پہلے اجاڑا ہے۔ تم گندی سوچ کے مالک ہو، تم نے مجھے شدید تکلیف دی ہے، میری بددعا ہے کہ تم اس شہر کی گلیوں میں بھکاری بن کر لوگوں سے بھیک مانگتے پھر دو۔ تمہارا بھی گھر آباد نہ ہو.....“ یہ کہتے ہوئے تاج احمد کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔

فرزانہ آگے بڑھی۔ ”آپ چلیں میرے ساتھ..... اب آپ کچھ نہیں بولیں گے۔“

تاج احمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھاتی ہوئی جب فرزانہ دروازے کی طرف بڑھی تو عقب سے مظہر نے کہا۔ ”اگر تمہاری یہ بددعا پوری ہو جائے تو میری بھی... بددعا ہے کہ تم مجھے اس حال میں دیکھنے تک زندہ رہو اور جب مجھے دیکھ لو تو پھر میرے سامنے تمہیں موت آئے، میرے پردوں میں.....“

تاج احمد پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فرزانہ نے اسے روک لیا اور وہ اسے زبردستی باہر لے گئی۔

اس کے بعد تاج احمد اور مظہر کے درمیان دوپٹی ختم ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چند ماہ کے بعد تاج احمد نے چپکے سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔

چند ماہ اور گزرے تو مظہر کو مسلسل نقصان ہونے لگا اور کچھتے ہی دیکھتے اس کا سب کچھ ختم ہوتا گیا۔ تاج احمد کا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا، اس لیے وہ اس کے حالات سے بے خبر تھا۔

تاج احمد اپنے کاروبار اور اپنی دنیا میں اتنا مصروف ہو گیا کہ وہ مظہر کو بالکل بھول ہی گیا کہ وہ بھی کبھی اس کا دوست تھا۔

تاج احمد دن بدن دولت کمار رہا تھا۔ آسودگی اس کی لائیک کی کوئی بن گئی تھی۔ اس کے پیچھے بھی جوان ہو گئے تھے اور وہ بھی کاروبار میں شامل ہو گئے تھے۔ تاج احمد اپنی دنیا میں مکن سب کچھ بھول چکا تھا کہ اچانک اس کا راز ہے پر چند سال بعد مظہر سے ملاقات ہو گئی وہ بھی اس حالت میں کہ تاج احمد اپنی دی ہوئی بددعا کی قبولیت کچھ رہا تھا۔ وہی الفاظ حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑے

استاد۔ ”بتاؤ کتنے کی جمع کیا ہے؟“

شاگرد جلدی سے کھڑا ہو کر۔

”مجاڑو۔“

☆☆☆

تھے جو اس نے مظہر سے کہے تھے۔

مظہر نے بھی تاج احمد کو پہچان لیا تھا اور اسے ایک دم سے مظہر کے وہ سارے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ اس نے مسکرا کر تاج کو بتا دیا تھا کہ وہ ان ہی سڑکوں پر ہوتا ہے، ان ہی سڑکوں پر وہ بھیک مانگتا ہے اور اس کی بددعا پوری ہو چکی ہے۔

مظہر کو اس حال میں دیکھ کر تاج احمد کے دل پر جو گزری وہ تو گزری ہی تھی، اسے مظہر کے بھی الفاظ یاد آ گئے تھے، جب اس نے کہا تھا کہ وہ اسے اس حال میں دیکھنے تک زندہ رہے اور پھر وہ اس کے سامنے موت کو گلے سے لگائے۔

تاج احمد کو جہاں اپنی دی ہوئی بددعا کے پورے ہونے کا دکھ تھا جو اس نے غصے میں دی تھی..... اسے اب یہ غم بھی کھانے لگا تھا کہ وہ اسی لیے زندہ تھا کہ وہ مظہر کو اس حالت میں دیکھے اور پھر مرے.....

اپنی موت کے بارے میں سوچ کر اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔ اسے یہ خیال پریشان کرنے لگا تھا کہ اب مظہر کی بددعا پوری ہونے کا وقت ہے۔

☆☆☆

فرزانہ اور تاج احمد ایک دوسرے کے سامنے براہِ جان راضی کے ایک ایک صفحے کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ فرزانہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ زیادہ پریشان اس بات کی تھی کہ اب تاج احمد کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ دونوں نے ایک دوسرے کو بددعا دی تھی۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ فرزانہ نے مر جھائے لہجے میں پوچھا۔

”اب یہی ارادہ ہے کہ مظہر کو مٹا کر اس گھر میں لے آؤں تاکہ اس سے معافی مانگ سکوں، اسے پھر سے کاروبار کی دنیا میں کھڑا کر دوں اور وہ راضی ہو جائے، مجھے معاف کر دے تاکہ اس کی بددعا پوری نہ ہو۔“

”آپ نے بات کی کبھی اس سے؟“

”میں نے اسے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے



گھر چلے، لیکن وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“  
 ”آپ مجھے اس کے پاس لے کر چلیں، میں اس کی منت کرتی ہوں۔ جو اس کا کھوپکا ہے وہ ہم دے دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے لے۔“  
 ”ہاں..... یہ ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔“ تاج احمد اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

تاج احمد اور فرزانہ اسی وقت مظہر کے پاس چلے گئے۔ وہ ایک طرف لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ فرزانہ نے پاس جا کر سلام کیا لیکن مظہر نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کے سامنے ساکت کھڑا رہا، جیسے وہ پتھر کی مورتی ہو۔  
 فرزانہ نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے اور بولی۔ ”بھائی صاحب! ماضی کو بھول جائیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔ جو کہا سنا تھا وہ ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔“

”اب معافی کا وقت گزر چکا ہے۔ ایک کی بددعا پوری ہو چکی ہے اور مجھے اپنی بددعا کے پورا ہونے کا انتظار نہیں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے تقدیر ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لے آئی ہے۔“ مظہر نے متانت سے کہا۔

”ہم آپ کا سارا نقصان پورا کر دیتے ہیں۔“ فرزانہ بولی۔  
 مظہر تسخیرانہ سی ہنسی ہنسا۔ ”مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔“

”میرا ایک گارمنٹس کا یونٹ ہے، تم وہ لے لو، وہاں اپنا کاروبار کرو۔ میں تم کو پیسا بھی دوں گا۔ بس اپنے الفاظ واپس لے لو۔“ تاج احمد نے کرب ناک لہجے میں کہا۔  
 مظہر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اتنا ڈر گئے ہو؟ دیکھو تمہاری بددعا کی تصویر تمہارے سامنے کھڑی ہے اور تم اپنے اوپر وہ حالات آنے سے پہلے ہی ڈر گئے ہو، جو ابھی آئے نہیں ہیں۔ تم دونوں چلے جاؤ۔“

فرزانہ آگے بڑھی۔ ”مظہر بھائی..... آپ وہ یونٹ اور بہت سا پیسا لے لیں..... ہم آپ کو رہنے کے لیے ایک اچھا گھر اور گاڑی بھی دیں گے۔ ہم آپ کو اس معاشرے میں پھر سے باعزت کر دیں گے۔“  
 ”مگر اب مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ مظہر نے یہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

”بھائی صاحب! آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”تب آپ نے اسے کیوں نہیں سمجھایا تھا جب یہ ضد میں آ کر بہت کچھ بول گیا تھا؟ میں نے اس کی بہن کو پسند ہی تو کیا تھا اور یہ کوئی ایسا جرم بھی تو نہیں تھا کہ یہ مجھے ایسے الفاظ سے نواز دیتا جس کا ہار میں اپنے گلے میں ڈالے آج ان سڑکوں پر بھکاری بنا ہوا ہوں۔ آج آگ اس کی طرف آرہی ہے تو آپ دونوں کی جان پر بن گئی ہے۔“

”وہ جو کچھ بھی ہوا تھا غصے میں ہوا تھا۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں اور نہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔“ تاج احمد رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھ پر اس ذرا سی محبت کی سزا میں جو کچھ گزرنا تھا گزر چکا..... اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اب اس وقت کا انتظار کرو تاج احمد..... میری بددعا میں اثر ہوا تو تم کو میرے سامنے موت آ جائے گی اور اگر میرے وہ الفاظ کھوکھلے ثابت ہوئے تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مظہر یہ کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”آپ معاف کر دیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فرزانہ نے ایک بار پھر استدعا کی۔  
 ”ان سڑکوں پر میں نے بھیک مانگی ہے۔ اس کی بددعا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں اب معاف کر دوں؟“ مظہر کے لہجے میں تلخی تھی۔

”اس معافی کے بدلے میں ہم آپ کو بہت کچھ دے رہے ہیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”مجھے وہ سب نہیں چاہیے جس کی مجھے ضرورت نہ کبھی تھی۔ نہ کبھی ہوگی۔ مجھے اب..... اس شخص کی موت چاہیے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی موت ہو اور میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مظہر کا لہجہ درشت ہو گیا اور فرزانہ خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ تاج احمد کا جسم کانپ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو، وہ ابھی گر جائے گا۔ اسے اپنے جسم میں طاقت ختم ہوتی محسوس ہونے لگی۔

مظہر اپنی بات پر قائم تھا۔ دونوں کی منت سماجت اور پیشکش بھی مظہر کا ارادہ نہ بدل سکی۔ دونوں مایوس اور مرجھائے قدموں کے ساتھ اپنی قیمتی گاڑی کی طرف



بڑھے۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تھے لیکن تاج احمد بھول گیا تھا کہ گاڑی کو اسٹارٹ بھی کرنا ہے۔ وہ اپنے خیالوں اور پریشانی میں گاڑی کا کنٹرول کر اسے چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ فرزانہ نے دیکھا تو اسے بتایا جب تاج احمد نے کار اسٹارٹ کی۔

☆☆☆

دونوں میاں بیوی بہت پریشان تھے۔ دونوں کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چمکان اڑ گیا تھا۔ ان کے اداس چہروں کو دیکھ کر ان کے بچے بھی سوال کرنے لگے تھے لیکن دونوں کسی کو کوئی جواب نہیں دے سکے اور اب گھر کے افراد میں ابہام جنم لینے لگا تھا۔ تب میاں بیوی نے مشورہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو بھی اس بات میں شامل کر لیں، ہوسکتا ہے کوئی حل نکل آئے۔

رات کے کھانے کے بعد انہوں نے اپنے بچوں کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کے سامنے ساری بات گوش گزار کر دی۔ سب بچے چپ چاپ سنتے رہے۔ اصل حقیقت جاننے کے بعد ان کے بڑے بیٹے عدیل نے کہا۔

”اس میں فکر مند کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”فکر مند کی کیسے بات نہیں ہے؟ بددعا پتھر بھاڑ کر نکل جاتی ہے۔ میری بددعا کا نتیجہ سامنے ہے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس کے کبے الفاظ کب پورے ہو جائیں اس کا ہمیں پتا نہیں ہے۔“

”ڈیڈ..... اس نے کہا تھا کہ آپ کی موت اس کے سامنے ہو۔“ عدیل بولا۔

”ہاں اس نے ایسا ہی کہا تھا۔“ تاج احمد کا لہجہ مضطرب اور پریشان تھا۔

”ہم اس کے سامنے جا سکتے ہیں نہ..... بھول جائیں کہ کوئی منظر بھی ہے۔ اس کا سامنا ہی نہ کریں..... جب آپ اس کے سامنے نہیں جائیں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔“ عدیل نے کہا تو سب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ عدیل کی بات سے باقی بچوں نے بھی اتفاق کیا۔ سب نے کہا کہ وہ منظر کو بھول جائیں اور آئندہ اس کے سامنے جانے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فرزانہ بولی۔ ”عدیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے آپ کے سامنے اپنی بددعا کی تھی۔ اب ہم اس کے پاس نہیں جائیں گے۔“

”یہ شجر ہے۔ میں بیویں مرتبہ گاڑی میں آتا جا ہوں۔ کہیں نہ کہیں اس سے سامنا ہو جائے گا۔“ تاج احمد کے دل میں بیجا خوف اسے مضطرب کر رہا تھا۔

”اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔“ عدیل نے کہا۔ ”وہ کیا.....؟“ بیک وقت سب نے عدیل کی طرف دیکھا۔

”آپ اسلام آباد والے آفس میں چلے جائیں۔ وہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔ آپ وہاں رہیں، اسلام آباد والے آفس کو تاجر دیکھتا ہے، اسے ہم واپس بلا لیتے ہیں۔“

پہلی بار فرزانہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ”یہ تجویز بھی اچھی ہے۔ اس طرح ہم اس سے بالکل دور ہو جائیں گے۔“

”تم تاجر کو بھی فون کر دو کہ وہ واپس آ جائے، ہم صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔“ تاج احمد نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا اور اس کے دل کو مطمئن بھی ہوا۔ چنانچہ اسی وقت تاجر جو کہ تاج احمد کا بیٹا تھا اسے کال کی اور اسے واپس آنے کا کہہ دیا۔ تاج احمد اور فرزانہ نے اسلام آباد جانے کی تیاری شروع کر دی۔

صبح ہوتے ہی دونوں میاں بیوی اپنے ڈرائیور کے ساتھ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

تاج احمد نے اسلام آباد جاتے ہی اپنا آفس سنبھال لیا، وہاں ان کے بہت سے عزیز رشتے دار اور دوست رہتے تھے، اس لیے انہیں کسی طرح کی بوریت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے اور دونوں میاں بیوی اس بات کو بھولنے لگے تھے۔ ان کی زندگی پھر سے معمول پر آنے لگی تھی۔ وہی دوستوں کی حفلیں اور پارٹیاں رنگ جمانے لگی تھیں اور ان کے قہقہوں اور بے فکرگی کی باتوں میں منظر کہیں دھن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ بیت گئے تھے۔

شہر میں بھکاریوں کو پکڑنے کی مہم شروع ہوئی تو کئی بھکاری واپس بائیں ہو گئے۔ جو بھکاری بھی نہیں دکھائی دیتا اسے پکڑ کر وہ گاڑی میں ڈالتے اور اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

منظر پر بھی نظر پڑی تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ریلوے اسٹیشن میں چلا گیا۔ وہاں ایک ٹرین کھڑی تھی وہ اس کے ایک ڈبے میں

سوار ہو گیا اور ایک سیٹ پر لیٹ گیا، کچھ دیر بعد اسے نیند نے آلیا اور وہ گہری نیند سو گیا۔

اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب کسی نے اسے ٹھوکر مار کر چپکایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ دائیں بائیں رش ہے اور مسافر ٹرین میں سوار ہو رہے ہیں۔ منظر اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف جانے لگا تو مسافر تیزی سے سوار ہو رہے تھے اور اس رش میں اس کے لیے دروازے تک جانا مشکل ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ واپس جائے گا تو پھر ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ جھگڑے کو جب بھی یاد آتا تو وہ بھکاریوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اس کے بعد پھر اس میں اور سکون ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹرین میں بیٹھ کر نکلے گا۔ دوسرے شہر ہی چلا جائے گا۔ چند دن کے بعد پھر واپس آ جائے گا۔

منظر ایک طرف فرش پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد مسافر بیٹھ گئے۔ ٹرین چلنے لگی اور پھر ٹرین نے رفتار بڑھ لی۔ منظر نے سوچا کہ وہ اٹھ کر ٹرین میں ایک پکڑ لگے لیکن دو پولیس اہلکاروں کو دیکھ کر وہ بھی جگمگایا۔

ٹرین کا سفر جاری رہا اور وہ راولپنڈی پہنچ گئی۔ منظر ریلوے اسٹیشن پر اتر آیا تو اسے پتا چلا وہ اپنے شہر سے بہت دور آ گیا ہے۔

جب خوشحالی کے دن تھے تو وہ اس شہر میں متعدد بار آچکا تھا۔ منظر ماضی کی یادوں کو یاد کرتا ہوا اس شہر کے بازاروں میں گھومنے لگا۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا، اس کی آنکھیں جھپک جھپک اور وہ چلا رہا۔ جانے اس نے کتنا پیدل سفر طے کر لیا۔

وہ ایک جگہ ٹھک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور ایک وین کی طرف چلا گیا۔

”یہ وین کہاں جائے گی؟“ اس نے وین کے ڈرائیور سے پوچھا۔

”جہے کہاں جانا ہے؟“ ڈرائیور نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اسلام آباد جانا ہے۔“

”یہ وین اسی جگہ جارہی ہے لیکن کرایہ لگے گا۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”جتنا یا ہو کرایہ لے لیتا۔“ منظر نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالے جس میں ہزار، پانچ سو والے نوٹ بھی تھے۔

”ہم سے زیادہ تو بھکاریوں کے پاس پیسا ہے۔“ ڈرائیور نے جپٹے ہوئے کہا۔

”یہ کام چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“ تاج احمد پاس بھی پیسا آجائے گا۔“ منظر نے اسی وقت اسے پیشکش کر دی۔

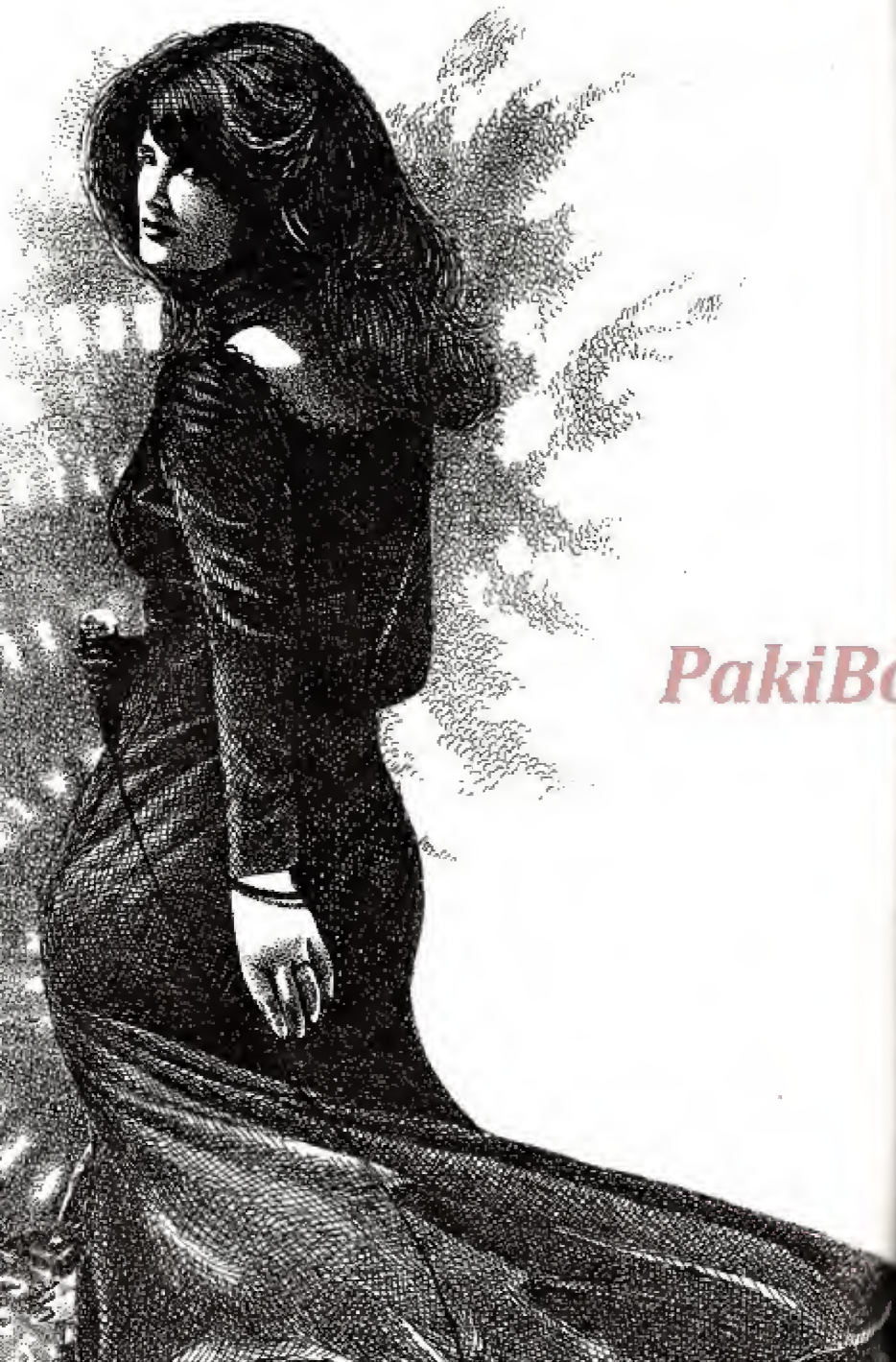
”حق حلال کی کما کر کھاتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ بیٹھے۔“ ڈرائیور نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ منظر بیٹھے بیٹھے گیا۔

وین نے اسے اسلام آباد میں اتار دیا۔ جب اس نے اس شہر میں قدم رکھا اور وہ ایک معروف سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا تو اسے لگا جیسے اس کی گاڑی اس شہر میں داخل ہوئی ہے اور وہ میوزک سنتا ہوا ہوئی کی طرف جارہا ہے۔ اس نے بہترین لباس زیب تن کیا ہوا ہے، اس کی آنکھوں پر قیمتی چشمہ ہے، پچھرے پر مسکراہٹ ہے، کوٹ کی اندرونی جیب میں اس کا پرس ٹوٹوں اور مختلف کارڈز سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی فکر نہیں ہے۔

منظر کو ماضی کی اس یاد نے تڑپا دیا اور وہ رو دیا۔ اس کا دل کرب سے تڑپنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سچے سچ کراٹن سر پر اٹھالے۔ اسے لگا ماضی کی یاد اس کا دل ریزہ ریزہ کر دے گی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسی اثنا میں تاج احمد زہرا کراٹنگ پر سے گزرتے ہوئے سڑک عبور کر رہا تھا۔ لال جتی روشن تھی اور ایک سائڈ کی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ اچانک ایک تیز رفتار سے گاؤ فرماری ٹریفک کے رش میں سے نکلی اور... مختلف گاڑیوں سے ٹکرائی ہوئی، تاج احمد سے ایسے ٹکرائی کہ وہ فضا میں بلند ہوا اور پھر تیزی سے اڑتا ہوا بیچ آ یا اور منظر کے قدموں میں آ کر۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تاج احمد کی آنکھیں بند ہوئے گی تھیں اور منظر اس منظر کو دیکھ کر بری طرح کانپ گیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ کاش وہ اسے معاف کر دیتا اور اپنے کبے الفاظ کی خدا سے معافی مانگ لیتا۔ منظر کا جسم بری طرح سے کانپنے لگا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور پھر منظر بھی اس جگہ گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بہت سے لوگ دونوں کے بے جان جسموں کے ارد گرد گھڑے تھے۔ سچ ہے قبولیت کی گھڑی کب آ جائے کسی کو کچھ خبر نہیں.....





قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور

نہ سی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر  
سانے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

قسط نمبر: 17

## وقت

خام ہر

نوت کے کٹوں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گرگی بازی گری

سنہنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در با طویل داستان

میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں  
کسی کز بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین

کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن  
اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور

موسم کی شرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان  
اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی

سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی  
محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور

کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں  
گھائی ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام

نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں  
کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا

نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دیو بند  
پانی تک نہیں ملتا اور اتنا ہی ایمان بھی ہے کہ جس پر

اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں  
سے بھی دم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شراوت سے پلٹ کر ان کی

طرف ہیم دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی  
مہربان ہے۔ کاسیر تھا ... جسے یہ تک خیر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے

واستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان بڑی  
میں چاہے والوں کی کسی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین

امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو ہر سوں یاد رہے گا۔

PakiBooks.Site





اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی عہدداشت میں پایا۔ علی سلطان نیکو اس (اسر کا) ایک مستیز کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مکمل چھریک بھردور کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹائرمنٹ لین سے علی کے ہونے لگی تھی۔ وقت رخصت رہا اپنی اکلوتی بیٹی علی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ علی سلطان نے اپنی اولیٰ کی دیکھ کر کہہ لیے ایک کل وقتی ملازمہ مقرر ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھاتے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد و ایسا رہتا کرتا تھا جو اسے اکل بہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی جمل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے چچن و مرنائی اکل سے دیکھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر ہمارے شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ علی کی کوشش کے عکس کو ہوا دیتی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نیکو اس کے علاوے اسطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے ساکنالوجی میں پختہ دگری حاصل کر لی تو تین سے بڑے ہنگامے اس کے مقابلہ میں لگ گئے۔ ایک درود و مکتب لڑکے کی حیثیت سے علی نے "سرکل اسے" میں شمولیت کی۔ علی ایک اسٹور پر جو موجودہ پٹرولین ٹھکانہ کوشت کر گئے۔ پولیس نے ایک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے نہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں مکتب لڑکوں نے ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے گھرا کر لیا۔ علی کا کالج ایک ریٹائرمنٹ میں اس کا آجانا لگا رہتا تھا۔ "دلی لاؤنج" نامی ایک ریٹائرمنٹ میں ہسپانوی و شیزہ شادو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دلی ٹیم میں مدینہ علی کے درون پر دیکھ دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات دلی لاؤنج میں جب لیونارڈو نے ایک مکتب لڑکے اور اسی کے خوارچوں نے شادو سے بدچیز کی کوشش کی تو علی نے کچھ میں کود پڑا۔ اس بار باری کو ایک امیر و کیرا پیش لیدی ڈیٹیلیا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈوٹنگ کرکھٹا کر رکھتا ہوئی۔ اس واقعے کے بعد لیونارڈو نے علی کی جسمی کا باقاعدہ آغا ز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے فٹنڈوں میں گپے بگپے مدد بھیج رہی تھی۔ لیونارڈو نے اپنی بزمیت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو تارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ دلی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادو کی ریٹائرمنٹ والی جاب چھوڑ دیا۔ اسے اکل سلطان کی خدمت کے لیے مقرر ہو کر رکھا گیا تھا۔ ایک روز جب شادو اپنے اسٹور سے گھر واپس آ رہی تھی تو لیونارڈو نے اسے آغا ز کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں صحت نہ باری اور شادو کو ڈھونڈنا ہالہا خرابا کر دیا۔ رات لیونارڈو کا ایک طرحی سامی چلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خوش معرکہ ہوا مگر چلو اور شادو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے فٹنٹس کے عالم میں بار بار کر چلو کو آدھ کر دیا۔ آدھ روز چلو کے کٹ کی خبر تک۔ جسٹس اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ ایک جینٹس سے پولیس فٹنٹس کی تلاش میں تھی۔ ایک جینٹس میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک جینٹس سے پولیس فٹنٹس کی تلاش میں تھی۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹیلیا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹیلیا نے علی کی گھما سنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر ٹھکانے کا باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ ٹھکانے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر ٹھکانوں میں ہر مل علی پر چرتوں کا ایک نیاروا ہوتا رہا۔ ڈیٹیلیا بہت ادنیٰ پہنچ کی مالک ایک پر اسرار لیدی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو چلو مڈرکس سے اس طرح نکال لیا جیسے ٹھکانے سے ہال۔ علاوہ ازیں ڈیٹیلیا نے ٹھکانے کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شادو کو آغا ز کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادو کو مصیبت فر دیتی ہے جنہم میں مجھ کو کچھ ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹیلیا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر ٹھکانے پر سے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو کچھ سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹیلیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ یقین بالوالہ اس وقت کے ڈیٹیلیا کی سنگت میں مگر نہ آنے والے وہ حکم ہوئی رہا بہتر ٹھکانے پر سے ہونے، ٹھکانے، رومان پر وراور نا قابل یقین تھے۔ ڈیٹیلیا کی شخصیت کسی معنی سے کم نہ تھی۔ اس پر ستر اور ڈیٹیلیا نے اپنے ہی ایسی دو پر اسرار شخصیات رہی ان کے نزدیک بالورڈ لاؤڈا وایا ایلیا نام سے علی کی ملاقات بھی کر وادی۔ جب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکٹر اور بہت طاقتور موسما کی "اسکل اینڈ بوز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے انہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیٹیلیا کی تھنا کی کر علی ان کی شرائط پر مصادرتے ہوئے "اسکل اینڈ بوز" کی ریتیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیٹیلیا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹیلیا سے بے علی اپنے اکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی صورت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سرایت راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی

ہے۔ انہیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر لیں۔ جس کو کچھلے چند ماہ سے اجاک کراچی ہے۔ یہ رقم آج بھد ہوئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی مصیبت کی راز ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو کوئی انور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے ہاں سے مزید یاد و معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی غرضی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو اپنے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یقین سے کراچی آ گیا۔ علی کی والدین نامی نوجوان سے ہوئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی والدین اپنی ماں سے ہوئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی کے شک کے پر پڑے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ اکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا لے جانے کے لیے دھت و بڑا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نامعلوم افراد نے علی کے لیے علی کی والدہ کو لے کر دیا۔ علی نے اپنی کراچی کے ماں کے ہاتھوں کو کھینچ کر رکھا۔ علی نے تمام حقیقت چنا کو بھی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور مرزا بن گئی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے بچے پر ایک خطا جس میں اس کی ماں کے لکے کا اعتراض کیا گیا تھا۔ علی نے نادرشاہ کو چپک کر لے کر آدھ اور علی نے عظیم کے ساتھ مل کر مشغور بنایا کہ نادرشاہ کو آغا ز کر کے اس سے بچا لیا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادرشاہ کو امریکا لے آ یا۔ اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدھوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادرشاہ اور آغا ز کنندگان اس کی جو بی بی بی بی گئے تھے۔ علی نے غوری طور پر بچا چھوڑ دیا اور بیٹا کے ہمراہ اس کے قلیت پر آ گیا۔ علی نے بچے پر جوشہ کو چھوڑا تھا اور اس نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو برس سنہ فزوی کی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے دور پردہ ڈیٹیلیا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پولیس کو بچے کا دیا تھا جو بڑی شدت سے علی کی تلاش میں سرگراں تھی۔ علی نے نادرشاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کر لیا اور بدترین تشدد کر کے اسے جاتی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے شک کو بڑا کر آتش کر دیا۔ علی کو ایک صورت کی مدد سے پولیس کر لیا گیا اور نامعلوم مگر پرہیزگار کیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ اس آئی لیٹ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارے ہیں۔ علی وہاں تھا تھا کہ اجاک اسے کچھ جانوروں کی غراہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اسے کی تلاش میں اسٹوروم کی طرف بڑھ گیا۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

وہ کرب میں ڈوبی ہوئی ماتی، دردناک آواز برقانی آوازوں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے مسلسل میری سماعت پر اشتناک دیکھ دے رہی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ایک سے زیادہ جانوروں کی اجتماعی آواز ہے جیسے جانوروں کا کوئی جھٹکا جماعت کو اس کے انداز میں حزیہ گیت گارہا ہو۔ بھڑپے عموماً اس نوعیت کی آوازیں کسی آواز کے جواب میں رد عمل کے طور پر نکال کرتے ہیں جیسے لڑین دمل، فائز بریکنگ اور پولیس کار یا ایسی پولیس کار کے سائرن کے جواب میں لیکن میں جانتا تھا کہ بکر جھج جھج جی قلیت جنوبی پر بھڑپوں کا جو دھنیں یا جاتا تھا۔ اس صورت حال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ نسل کر میرے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں مجھے کراں قدر معلومات حاصل ہوئی تھیں اسی لیے میرے ذہن نے بے اختیار اسکو، وانڈرنگ، ایلٹ راس، اور کا (کلرڈ بیل) سائن شاداک، ایلٹیلٹ سیل اور ڈسکی ڈولین جیسے خطرناک قلیت جانوروں کے نام دہرائے تھے لیکن یہی بات تو یہ ہے کہ میں فی الحال ان جانوروں کے نام ہی سے واقف تھا، ان میں سے کسی کی آواز سے ہرگز آشنا نہیں تھا لہذا میں نہیں

جانتا تھا کہ یہ "آووو..... ہاووو..... ہووو....." کس جانور یا جانوروں کے قلیت سے خارج ہو رہی تھی۔ اسٹوروم کا میں پہلے ہی معائنہ کر چکا تھا۔ سردست میری تلاش کا مرکز آتشیں اسلحہ تھا۔ انسان کی تلاش اور جھج کا تعلق اس کی ضرورت سے ہوتا ہے اور میری غوری ضرورت کوئی بھی ایسا جھج نہیں جسے میں اپنے خوف کے لیے بے دریغ استعمال کر سکتا۔ مجھے ایسا کوئی دھوئی نہیں کہ میں ایک تجربہ کار شوٹر ہوں لیکن میں بہر حال، وقت پڑنے پر مختلف قسم کے جھجیاں چلانا جانتا تھا اور قلب جنوبی کے اس ٹھنڈے شمار جزیرہ راس میں مجھ پر بڑا اثر اوقت آن پڑا تھا۔ اسٹوروم کے ایک حصے میں ہینگ راکٹز کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ ہینگ راکٹز (شکاری راکٹس) دنیا کے معروف اور مانے ہوئے برانڈ تھے۔ روگر، براؤنگ، مونٹانا، نوزلر، ریمکسٹن، ویڈرلی اور موس برگ کے علاوہ ہینگ کولٹ ایٹا کوئٹا راجہ اور بھی وہاں رکھا تھا۔ ان گھو کے راؤنڈز کا بھی وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ میں نے اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک نوزلر M48 راکٹ اور ہینگ 44 راکٹ اور کا انتخاب









عید الفطر کی شگفتہ جملاتی رعنائیاں لیے جولائی 2018ء کا گلدستہ

# پاکیزہ

ماہنامہ

رفعت سراج اور شیریں حیدر کے خوب صورت ناول..... اختتامی مراحل کی طرف گامزن

حیا بخاری کے ماہرانہ قلم کا شاہکار ناول..... محبت لفظ ہے لیکن، سنسنی خیز موز پر

معروف رائٹر دردانہ نوشین خان کے پختہ خیالات اور پُر فکر جملوں سے آراستہ نئی ناول..... صفہ..... پاکیزہ قارئین کے لیے خصوصی عید تحفہ

نامور فنکارہ لیلیٰ زبیری سے دلچسپ گفتگو

شائستہ زبیر کے رواں قلم کی بدولت پڑھے

پاکیزہ کے مہمان میں

سینئر رائٹر..... ناہید سلطانیہ اختر، شمیم فضل خالق و شگفتہ بھٹی کی خصوصی تحریریں



طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، صبا آصف، غزالہ جلیل راؤ،

فوزیہ سرور، ہاجرہ ریحان کی پُر تنوع کہانیاں.....

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ، معلوماتی، تفریحی اور اصلاحی مستقل سلسلے اور بہت بہت کچھ..... صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کرام کے لیے

ضرورت ہے۔  
"نیکس!" وہ نمونیت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔  
میں نے کافی کام کیا اور کوئیز والی پلیٹ اس کے سامنے بٹھ کر رکھتے ہوئے بڑی رمان سے کہا۔ "اگرچہ جسم کو گرماش پہنچانے کے حوالے سے یہ اس مشروب کا پائیک بھی نہیں ہے لیکن میرے پاس جو تھا وہ میں نے پیش کر دیا۔"  
"اکہین تھیک ہو۔" وہ شائستگی سے بولی پھر بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مستغفر ہوئی۔ "یو لائیک دس؟"  
"ہیو!" میں نے پوری قطعیت سے کہا پھر کافی کا گلاس اس کے سامنے کر کے رکھ دیا۔  
"یہ وہی کرسی تھی جہاں چند گھنٹے پہلے نیشنل کریمر بیٹھا مجھے اس آئی لینڈ کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ میرے جواب پر اس عورت نے حیرت بھری بے یقینی سے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں، محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔ میں نے پوچھا۔  
"تم کون ہو اور اس سرد خانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

اس کے پہناوے سے میں یہ اندازہ تو قائم کر چکا تھا کہ وہ کوئی کم عمر ہے لیکن میں اس کی زبان سے بہت کچھ سننا چاہتا تھا۔  
"میرا نام کیا ہے۔" اس نے بتایا۔  
"کایا کلب یا کایا پلٹ؟" ہے ساتھ میرے منہ سے نکلا۔  
"نہیں، نہیں۔" وہ جلدی سے گردن کوٹنی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "میں کایا آتھمن ہوں۔ میرا تعلق نیوزی لینڈ سے ہے۔"  
"وہ کلب اور پلٹ؟" کویتینا کوئی نام سمجھی تھی اس لیے فوراً اس نے اپنا پورا نام بتا دیا تھا۔ میں نے بھی اپنی بات کی وضاحت کر ضروری نہ جانا اور سوال کیا۔  
"کایا آتھمن! تم نیوزی لینڈ سے یہاں کیا کرنے آئی ہو اور مجھے تفصیل سے بتاؤ، ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کون سا کلبین واقعہ پیش آیا ہے؟"  
کایا ایک پست قامت اور بھرے بھرے بدن کی مالک بادی آٹھنوں والی انتہائی پُرکشش نیوزی لینڈرہی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس سے بائیس کے درمیان لگایا۔ اس کی رنگت صاف، جلد شفاف اور سر کے بال

سے کایا کی طرف دیکھا۔  
"میں پیچھے کے اعتبار سے ایک نرس ہوں۔" اس نے بتانے لگی۔ "کراؤسٹ برج کے "ہل مورن" اسپتال سے میرا تعلق ہے۔ میں کراؤسٹ برج میں واقع کسنٹر بری ایر وکلب کی ممبر بھی ہوں۔ مجھے ہم جوئی بہت پسند ہے۔ اسپتال میں میری دن رات پیشگی تھیں تو میں نے انٹارکٹیکا کے ایکسپلور کرنے کی ٹھانی اور ایک ٹیم کے ساتھ کراؤسٹ برج سے یونٹک C-17 گلوب ماسٹر جہاز پر سوار ہو کر انٹارکٹیکا کے "کراؤسٹ ٹیم" پر پہنچ گئی۔ "گلوب ماسٹر" نامی یہ یونٹک طیارہ امریکی ایئر فورس کے تعاون سے چلا ہے۔ میں چونکہ کسنٹر بری ایر وکلب کی ممبر ہوں اس لیے مجھے اس طیارے سے سفر کرنے کا موقع مل گیا۔ ہم لوگ پندرہ دن کے مہمائی سفر پر پندرہ جولائی کو اسکاٹ ٹیم کے ایئر پورٹ پر اترے تھے۔ پانچ گھنٹے کی ٹارنل غلامت میں ہمارے دس ساڑھے دس گھنٹے لگ گئے کیونکہ خراب موسم کے سبب گلوب ماسٹر کو خوف ناک کیٹا پینک (Katabatic) سے گزرنا پڑا تھا۔"

"کیٹا پینک..... مطلب؟" میں نے اس کی کہانی میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"  
"کیٹا پینک دن رات یعنی خطرناک برقی آندھی! اور







”مالک..... تمہارا مالک کون ہے؟“

”جو تمہارا بھی مالک ہے۔“

”پہیلیاں نہیں بھجواؤ۔“ وہ اپنے ریلے فریج کٹ پر کشش ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ ”اگر نہیں بتانا چاہتے تو صاف منع کر دو۔ میں ضد نہیں کروں گی۔“

میرے مخصوصات ان لحاظ میں حد سے زیادہ فعال ہو گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کایا نے ہسکی ڈاگز سے میری توجہ ہٹانے کے لیے ٹانگ بٹا دیا تھا۔ کایا کے بالائی ہونٹ کے گوشے سے مسود کی رنگت اور اسی سائز کا ایک مسابھی تھا جو اس کے چہرے کی دلکشی میں بے بہا اضافہ کرتا تھا۔ میں نے بد دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کی ہے۔ جو میرا مالک ہے، وہی تمہارا بھی مالک ہے۔ تم اسے جیو دو اور گاؤ کہتی ہو اور میں اسے اللہ اور رب کہتا ہوں۔“

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”تم تو مجھے کوئی سینٹ لگتے ہو۔“

”میں تو بس ایک گناہ گار انسان ہوں۔“ میں نے کانی کا آخری ٹھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر پٹری بدلتے ہوئے بولی۔ ”میں کافی دیر سے محسوس کر رہی ہوں کہ دقتے دقتے سے تمہارے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی براہم ہے؟“

”نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں ایک پیشہ ور نرس ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”میری آنکھیں اور میرا دماغ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تم اپنے جسم میں کبھی نہ کبھی درد محسوس کر رہے ہو اور اس درد کو دبا رہے، اسے برداشت کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، کیا مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے، میں تمہاری مدد کر دوں۔“

یقیناً کایا ایک ذہین اور تجربہ کار نرس تھی۔ اس کا مشاہدہ بلا کا تھا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات کو بہ آسانی پڑھ لیا تھا۔ میں نے ایک فرضی چوٹ کے کدمحوں پر بندوق رکھ کر اسے ایک جھوٹی کچی کہانی سنا دی۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

”کیا میں تمہارے زخم کا معائنہ کر سکتی ہوں؟ میرے بیگ میں میڈیکل کٹ موجود ہے۔ اگر تمہیں فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہوگی تو میں تمہارے کام آسکتی ہوں۔“ کایا کی پیشکش میں مجھے کوئی قباحت یا حرج نظر نہیں آیا لہذا میں نے بیڈ پر لیٹ کر اس سے اپنے پیٹ کے زیریں حصے کا معائنہ کرایا۔ اس نے بیڈنچ بٹا کر میرے زخم کا جائزہ لیا پھر غصے سے بولنے لگی۔

”تمہارا زخم تو بالکل ٹھیک ہے۔ کھال کے اندر جذب ہو جانے والے ٹانگے لگائے گئے ہیں۔ دو چار روز میں تمہارا آگھاؤ بھر جائے گا۔ میں نئی بیڈنچ کر دیتی ہوں اور کھانے کے لیے تمہیں چین کٹر میڈیسن بھی مہیا کرتی ہوں۔ میری میڈیکل کٹ میں یہ سب موجود ہے۔“

آئندہ دس سے پندرہ منٹ میں اس نے یہ کام نمٹا دیا۔ اس دوران میں ہمارے پیچھے گنگلو کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”تمہارا میں کب اسکاٹ میں پرے ہوں گا؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے، یہ ہٹ اسکاٹ میں سے کتنے فاصلے پر ہوگا؟“ میں نے کرید کے والے انداز میں پوچھا۔

”میں بالکل درست اندازہ تو نہیں لگا سکتی۔“ وہ مجھے چین کٹر کھلاتے ہوئے بولی۔ ”البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں سے اسکاٹ میں پانچ یا چھ یا زیادہ سے زیادہ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ پیدل تین گھنٹے کی مسافت؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... کم و بیش اتنا ہی۔“ وہ بے نیازی سے اپنے بیگ تک پہنچی پھر میڈیکل کٹ کو بیگ کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر درست سمت کا علم ہو تو ورنہ بے سمت انسان تو..... اس برف زار میں ساری زندگی گھسٹتا اور بھٹکتا رہے گا۔“

میں اچھ کر چٹھ گیا اور کہا۔ ”اس وقت تو تم بھی بے سمت ہو چکی ہو مگر تمہارے چہرے سے پریشانی نہیں چھلکتی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اسکاٹ میں تک بہ آسانی پہنچو گی؟“

”خود پر تو نہیں مگر مجھے ان پر بھروسہ ہے۔“ ”کن پر؟“ میں نے سرسری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اپنے ساتھیوں پر۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

وقت

”آسکر، اویلیور اور آئینا جلد یا بدیر مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور وہ بھی آئینس جولاٹی سے پہلے۔“

”کیوں..... آئینس جولاٹی کو کیا ہونے والا ہے؟“ ”انکچوئل کے مطابق، آئینس جولاٹی کو ہمیں اسکاٹ میں سے یونگ C-17 ٹکوب ماسٹر پر سوار ہو کر اسکاٹ چرچ کے لیے پرواز کرنا ہے۔“ کایا نے جواب دیا۔ ”اوہ.....“ میں ایک پوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

وہ اچانک بٹنی اور مجھے بیڈ سے اترتا دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ”ارے..... یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارے آرام کے لیے بستر خالی کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے رگوں میں لہو جم کر دیئے والے کھلے ماحول میں کبھی کھٹنے کڑا رہے ہیں اور اس دوران میں تم نے سائبرین بریڈ ہسکی ڈاگز سے ابھی خاصی نبرد آزما کی بھی کی ہے۔ اب تمہیں ایک طویل نیند لینا چاہیے تاکہ تمہاری تمام تر تھکن اڑن چھو ہو جائے اور اس مقصد کے لیے بستر سے اچھی اور کوئی جگہ نہیں ملتی۔“

”اور تم؟“ اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ”میں تمہارے سلیپنگ بیگ میں سو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”مگر تم زخمی ہو۔ تمہیں بیڈ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

”ہم پاکستانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔“ میں نے اس کے بالائی ہونٹ کے گہبان مسوری سے کو تھتے ہوئے کہا۔ ”ان لحاظ میں تم میری مہمان ہو لہذا مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ اس بیڈ پر تم آرام کر دو گی۔“

وہ چند لحاظ تک گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر کندھے اچکاتے ہوئے غور لیجے میں بولی۔ ”تمہیں تمہاری خواہش۔ ویسے اس بیڈ پر اتنی گنجائش ہے کہ ہم دونوں... بہ آسانی سو سکتے ہیں.....“

یہ کایا کی تجویز تھی یا دعوت، فی الحال اس حوالے سے سوچ کر میں اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تجویز ناشابہری کی پیشکش کے جواب میں، میں نے کہا۔

”اگر سلیپنگ بیگ کے اندر مجھے نیند نہ آئی تو پھر میں تمہارے پر کشش مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔“ وہ ایک طویل جمائی لیتے ہوئے ہوشربا لہجے میں بولی۔ ”میری تو آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ تمہارا جہاں دل

چاہے، سو جانا۔ میں تو چلی۔“

کایا نے ”میں تو چلی“ اس انداز میں کہا تھا جیسے وہ میرے ہٹ سے رخصت ہونے کا عندیہ دے رہی ہوتا ہم میں بھولی بکھر رہا تھا کہ وہ پٹانہ لڑکی کس گہری کی سیر کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ مشروب کی اتنی مقدار اپنے معدے میں اتار چکی تھی کہ اب اسے ایک طویل مدہوشی بھری نیند لینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں کایا کو اس کے حال پر چھوڑ کر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

☆☆☆

سلیپنگ بیگ کی تین چار اقسام ہوتی ہیں جن میں ہر کوئی کے ٹیکڑل جاتے ہیں۔ کایا والا سلیپنگ بیگ اعلیٰ درجے کا تھا۔ یہ ڈبل لائینگ والا تھا اور ٹوپائی فیبرک سے تیار کیا گیا تھا۔ جسم کو گرمائش پہنچانے کے لیے سلیپنگ بیگ کے اندر کوئی ہیٹر وغیرہ نصب نہیں کیا ہوتا بلکہ یہ تھریل انولیشن نظام کے تحت کام کرتا ہے۔ انسانی جسم میں پلازیم کے سبب مسلسل حرارت خارج کرتا رہتا ہے۔ سلیپنگ بیگ کی لائینگ کے اندر ایسے حرارتی ریٹے لگائے جاتے ہیں جو اس حرارت کو بیگ سے باہر نہیں جانے دیتے۔ یہ حرارت بیگ کے اندر مقید ہو کر رہ جاتی ہے۔

میں کایا والے سلیپنگ بیگ کے اندر کافی آرام وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس پر سگون ماحول میں میرا ذہن مسلسل کایا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی اسٹوری میں بعض ایسے مقامات آئے تھے جن سے میرا ذہن مطمئن نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی کچی ایک باتیں میرے دماغ میں غار کے مانند ٹھنک رہی تھیں اور مجھے اس کی ذات کے حوالے سے شک زدہ انداز میں سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ ٹیل کر میر کو رخصت ہوئے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ کایا ڈرامائی انداز میں میرے ہٹ تک آ پہنچی تھی۔ میں بڑی باریک بینی سے اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ باتیں جو کسی بھی قیمت پر مجھے ہضم نہیں ہو پاری تھیں۔

کایا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یو ایس ایئر فورس کے یونگ C-17 پر کرائسٹ چرچ سے اسکاٹ میں تک پہنچی تھی۔ انٹارکٹیکا کی جانب آنے والے ہم جو افراد کے لیے بہت سی ایئر لائنز کی فلائٹس مل جاتی ہیں جن میں یونگ 757 اور ایئر بس A319 کے طیارے سرفہرست ہیں پھر یو ایس ایئر فورس کا طیارہ کیوں؟ یہ سوال اپنے یطین سے متعدد سوالات کو جنم دیتا تھا جیسے، کیا کایا کا کسی بھی حوالے سے یو



ایس انفرورس سے کوئی تعلق تھا؟ میں نے چند گھنٹے پہلے ڈیپلیٹا کومندرن لیکس آئی ٹی آر نیلی کا پڑاڑاٹے دیکھا تھا۔ کا یا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کنفر بری ایر وکلب کی یا قاعدہ ممبر بھی ہے۔ تو کیا وہ امریکیوں کے پینل پر تھی؟ یا کسی حوالے سے اس کا تعلق "اسٹل اینڈ یونز" سے تھا؟ کہیں اسے کسی خاص منصوبہ بندی کے تحت مجھ پر گہری نظر رکھنے کے لیے تو اس آئی لینڈ پر نہیں بھیجا گیا تھا؟

علاوہ ازیں کا یا نے مجھے ہٹ سے اسکاٹ میں تنگ کے فاصلے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، وہ بھی میرے لیے حیرت کا باعث تھیں۔ وہ اس برف دار میں اپنی ٹیم سے پچھڑ چکی تھی اور موسم کی سختیوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنا پڑ مصائب سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ اپنے ڈارے سے پچھڑی ہوئی ایک بے سمت اور بے یار و مددگار کوچ تھی اور خوفناک سکتے اس کی چر پھاڑ کی خواہش لیے اس کے تعاقب میں تھے۔ ان نامساعد حالات میں بھی وہ جانتی تھی کہ میرا ہٹ، اسکاٹ میں سے کم و بیش کتنے فاصلے پر ہے۔

ہسکی ڈاگز والی اسٹوری تو سرے سے مجھے ہضم ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جو نامی آوازیں اور فضیلی غراہیں سماعت کی تھیں، وہ بھیڑیے کی طرف بڑا واضح اشارہ کرتی تھیں اور پورا انکار لیکنا بھیڑیوں کے وجود سے خالی تھا۔ دنیا میں پانچ جانور ایسے ہیں جو اپنے مخصوص ماحول کے سوا دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائے جاتے۔ کیوی نیوزی لینڈ میں، کینیگر و آسٹریلیا میں، پانڈا چین میں، جینگوئن ساوتھ پول انڈونیشیا میں اور پولریٹر تاجھ پول آرکٹک میں۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی جگہ گھر میں پائے جاتے ہوں۔ معلومہ تاریخ کے مطابق جینگوئن اور پولریٹر آج تک ایک دوسرے سے نہیں ملے۔

ان تمام نکات پر غور و فکر کرتے ہوئے میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے کسی بھی قیمت پر کا یا پر آنکھ بند کر کے پھر واپس کرنا۔ میں آنکھ بند کیے کا یا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک کھردری آواز نے میرے تخیل میں خلل ڈال دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کا یا کے خراٹوں کی آواز تھی۔ کا یا دیکھنے میں جتنی دلکش و دل نہیں تھی، اس کے خراٹے اتنے ہی بے ہنگم اور ہیا نک تھے۔ وہ یقیناً اس وقت گہری نیند میں تھی۔

کا یا کی گہری نیند کے خیال نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی خیز مہمانی لہر دوڑادی۔ اس کی بے خبری میں، میں اس کا بیگ چپک کر کے اپنے تمام غدشات کی تصدیق

کر سکتا تھا۔ کا یا کی اصلیت تک رسائی حاصل کرنے کا یہ ایک بہترین موقع تھا۔

میں بڑھتی سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا اور ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر خط قدموں سے چلتے ہوئے بیگ کے نزدیک پہنچی گیا۔ چند لمحات تک میں چپ چاپ کھڑا کا یا کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بے خبری کی گہری نیند میں تھی۔ اس کا خوابیدہ حسن، بے ترتیب ذرخیز بدن کے ساتھ مل کر دیکھنے والی آنکھ کو مسحور اور سوچنے والے دماغ کو متغیر کر رہا تھا۔ یہ نظارہ ظلم و ہوشربا سے کم نہیں تھا لیکن اس کے خوف ناک خراٹے اس رومینٹک ماحول کا کباڑا کر رہے تھے۔ وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ کا یا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اس کے سفری بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

اس کارروائی کے دوران میں یہ خیال بھی مسلسل دامن گیر رہا کہ میں ایک غیر اخلاقی اور مجرمانہ فعل کا ارتکاب کر رہا ہوں لیکن ایسا کرنا حالات کا تقاضا تھا۔ میرا ذہن کا یا کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اطمینان قلب کی خاطر مجھے اس کے سامان کی مکمل تلاش لینا تھی اور یہ سامان اس سفری بیگ پر ہی مشتمل تھا لہذا میں نے صبر و تحمل سے بیگ کو کھولا اور اس کے اندرون کا تھیلی جائزہ لیتے گا۔

بیگ کے اندر بھی کچھ ہی اہم جو کی ضرورت کا تمام ضروری سامان موجود تھا۔ کا یا کا پاسپورٹ اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ وہ کراست چرچ، نیوزی لینڈ ہی کی ایک معزز شہری تھی جو پندرہ جولائی کو اسکاٹ میں سے اتر پورٹ پر اتر رہی تھی۔ دیگر کاغذات بھی ان حقائق کی تصدیق کرتے تھے۔ بیگ کے اندر میڈیکل کٹ کے علاوہ مجھے خواتین کے استعمال کی بعض مخصوص چیزیں بھی دکھائی دیں۔ میں نے کم و بیش دس منٹ کی تلاش کے بعد بالآخر ایک کام کی شے ڈھونڈ لی۔

یہ ایک نئی کیسٹ پلیئر تھا اور اس کے اندر ایک کیسٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ اس نئی کیسٹ کو پلے کر کے دیکھنا چاہیے۔ یہ خیال اچانک ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ مذکورہ کیسٹ پلیئر اس وقت ایسی حالت میں تھا کہ اس کے اندر لگی ہوئی کیسٹ پوری طرح پلے ہو چکی تھی۔ اس کیسٹ کی ریکارڈنگ کو سننے کے لیے مجھے کیسٹ کو ریو اینڈ کرنا تھا اور یہ کام بند روم کے اندر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے کا یا کے سفری بیگ کو واپس غنیمت خاک کر کے بند کر دیا اور اسے اس کے سامان مقام پر رکھنے کے بعد میں بند روم سے نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے میں ہٹ

وقت

سے باہر تھا۔ اگر میں یہاں پر اس کیسٹ کو سننا تو اس کی آواز کا یا کی سماعت تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ ایک تودہ اٹھائیلی نیند میں تھی، دوسرے بند روم سے باہر آتے وقت میں اس کا چوٹی دردناک بند کر آیا تھا اور اب میں ہٹ سے بھی باہر تھا۔ میں نے یہ اٹھلی کیسٹ کو ریو اینڈ کیا۔ اس کے بعد پلے کا جن پریس کر دیا۔

چند سیکنڈ تک کیسٹ خالی چلتی رہی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا کہ میری محنت اکارت تھی ہے، اس کیسٹ میں سرے سے کچھ ریکارڈ کیا ہی نہیں گیا۔ مبین ممکن تھا کہ مزید کچھ وقت کے بعد میں واپس ہو جاؤں تاکہ میری مراد برآئی۔ کیسٹ کی ریکارڈنگ جتنا شروع ہوئی تھی۔ میرے کانوں نے جو کچھ سنا، وہ میرے فک کو تھیں میں بدلنے کے لیے کھینچ رہا تھا۔ میں نے وایوم کو دھماکہ کر کیسٹ پلیئر سے ابھرنے والی آوازیں پر توجہ مرکوز کر دی۔

"آووو..... ہاووو..... ہووو....." کا بین مسلسل میری سماعت پر دستک دینے لگا۔ کچھ دیر کے بعد یہ کرب ناک آواز "اوو، اوو، اوو، اوو" کی خطرناک غراہیوں میں بدل گئی۔ یہ سانس دھکنے کے جاری رہا پھر ان غراہیوں میں آسانی پھیلنے لگی ہوئی تھی۔

یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں تھی جسے سمجھنے کے لیے مجھے نامساعد والوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں۔ ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔ کا یا نے برف دار میں اس کیسٹ کو پلے کر کے اس کی آواز مجھ تک پہنچائی تھی تاکہ جب وہ بعد میں مجھے خوں خوار کتوں کی اسٹوری سناے تو میں آنکھیں بند کر کے اس کی بات پر ایمان لے آؤں اور وہ پٹاٹھ لڑکی کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہی تھی۔

میں نے کیسٹ کو نکل فارورڈ کر کے اسے اس کی پہلے والی حالت میں پہنچایا تاکہ جب یہ کیسٹ پلیئر کا یا کی نظر سے گزرے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ پھر میں دس قدموں بند روم میں پہنچا اور کا یا کا تحقیر کا جائزہ لیا۔ وہ ہنوز بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے کیسٹ پلیئر کو واپس کا یا کے بیگ میں رکھا اور ایک مرتبہ پھر اسے سوتا چھوڑ کر بند روم سے باہر نکل آیا۔ ان لمحات میں مجھے ہلکی ہلکی ہموک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے رست واضح میں وقت دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ یہ لگ جھگ ٹاٹھتے کا وقت تھا۔ اگر میں دنیا کے کسی اور ملک میں ہوتا تو تین جولائی کی اس صبح اب تک چہار سو ملل اچالا پھیل چکا ہوتا لیکن یہ انارکلیکا کا جزیرہ اس تھا جہاں جولائی



”یہ ہٹ میرا کیس ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔  
 ”مکڑی“

ہزاروں کلومیٹر دور اس سرورخانے کے ایک ٹھنڈے ٹھارہٹ

”یہ مذاق ہے اور نہ ہی جوک۔“ میں نے ایک ایک لفظ مرزور دیتے ہوئے کہا۔ ”سچ ہے کہ میں اس ہٹ کے

ویران اور خستہ علاقے میں قیام کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے

چند لمحات تک وہ گہری ٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی

”تمہارا سینکڑوں (مرو) کون ہے؟“

”اور یہ چالیس دن کا چلہ کس سلسلے میں ہے؟“

کسی کے نتیجے میں مجھے وہ حاصل ہو جائے گا جو میری خواہش ہے۔“

”یومین..... اے کرل؟“ اس نے الجھن زدہ لہجے

”تمہارا اشارہ ملائیشین ائیر لائن کے گمشدہ جہاز کی طرف ہے؟“ کابا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

ریلیز ہوا تھا۔ کوئی نہیں چاہتا، ملائیشین ائر لائن کا یہ طیارہ

جاسکتی ہے کہ ہٹ میں کی پیش کوئی حرف پہ حرف پوری ہوگئی۔ خیر....." لکھاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری

”اوہ ہاں.....“ وہ جیڈ کے میٹر میں پر ہاتھ پھیرتے

کہا گیا ہے۔ ”وہ انکشاف انگیز لہجے میں ہوئی۔“ یعنی تھرمل

منٹ....." وہ بات ادھوری چھوڑ کر بیڈ سے نیچے اتر آئی پھر

میں وہ لے آؤں پھر تمہاری بھی سنتی ہوں۔“

مجھے پورے چالیس دن ادھر ہی گزارنا ہیں۔ آئندہ خواہ مخواہ

”کیا تم چالیس دن تک اس ہٹ پر قیام کرنا چاہتے ہو؟“

سیدنا ابوبکرؓ

اس کے لہجے کے اعتبار سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ”آئینہ“ کا لفظ استعمال کر کے وہ اس سرف مرط بل، قمار کا

ثبوت دیا ہے۔“

”فریض ہو کر آ جاؤں، پھر بتانا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں پیٹروم کے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

واپس آ جاؤ۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ میں کچن میں جا کر کچھ تیار کرتا ہوں۔“

جس میں وہ اسے ایسا نوکریا کاٹوں پر ہیڈ کوارٹر لگائے۔  
 بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گجٹ (Gadget) تھا۔

(میوزک سننے کا ایک آلہ) اس وقت اس کے پاس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سرکش بدن میں ہلکا سا

وہ بیٹہ پرتھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس

”آگیا ہوں اسی لیے تو تمہیں نظر آ رہا ہوں۔“ میں

دلی۔ ”پٹ علی کو سن رہی ہوں۔“ پھر اس نے گنجھٹ کو آف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ”اس کی تھوڑی سی بیڑی کی بجائے ہوگی

اس نے جواب دیا۔ "گیٹ اٹ اسٹارٹنگ....."

”کیا ہوا؟“ وہ سوالیہ فطرت سے مجھے بخنسنے لگی۔

میں سلیپنگ ہیگ سے باہر نکلا تو کایا کو کرسی پر بیٹھے پایا۔ وہ مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھی اور خاصی نکھری نکھری

شاید وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں بھی اس کے آگے پیچھے

ذرا سا بھی ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوا۔ بہت مزے کی نیند

سو نے کا مزہ دو بالا ہو جاتا۔ ”وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں

بھی اسے مایوس نہیں کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

میں نے یہ بات اسی خصوصیت سے پوچھی تھی کہ وہ  
گڑبڑا کر رہ گئی، اس نے ابھن زوہ انداز میں استفسار کیا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔  
 ”احسانوہ..... ڈرنک والی؟“ اس نے سوالیہ نظر سے

وہ اصرار ہی لچے میں پڑی۔ ”پھر.....؟“

”اوہ.....“ وہ ایک کھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ مذاق نہیں تھا بلکہ میری دوستانہ پیشکش تھی

اور..... لکھائی توقف کر کے اس نے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ایک آنکھ دما







”میں نے آج پورا دن نہیں پی۔“ اس نے بتایا۔  
 ”گولڈنرل!“ میں نے سر اچٹے والے انداز میں کہا۔  
 ”آئندہ بھی تیری سرورٹ پر چلو گی۔“  
 ”یہ بڑی عجیب سی شرط نہیں؟“ وہ منہ بکا ذکر بولی۔  
 ”شرط تو ایسی شرط ہی ہوتی ہے۔“ میں نے ظلفیانہ  
 انداز میں کہا۔ ”اسے عجیب اور غریب تو سمجھنے والے کا فہم  
 بناتا ہے۔ اگر تمہیں میری شرط ملاحظہ ہے تو بتاؤ ورنہ اس بحث  
 کا کوئی فائدہ نہیں۔“

میرے دونوں کنداز کے جواب میں وہ چند لمحات تک شش و پنج میں مبتلا رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔  
”مجھے منظور ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب تمہارے قریب ہوں گی تو ڈر تک نہیں کروں گی۔“  
”چلے گا۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں بستر پر آ گیا۔

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ٹانگ مجھ پر چڑھا دی اور شرارت بھرے انداز میں استدعا کیا۔ ”کیا تم میرے نزدیک آتے ہوئے اس لیے ہچکچا رہے تھے کہ تمہاری اولیو یا خفا ہو جائے گی؟“

”اولیو یا کو کچھ چلنے پھرنے کا تو خفا ہو گی نا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے، تم نے اولیو یا کو پانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“ وہ میری جانب کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔

”محبوبہ کو پانے کا ارادہ کوئی بھی کبھی ترک نہیں کرتا۔“ میں نے چٹ لیٹے لیٹے کہا۔ ”محبوب تو ہر شے میں کھائی دیتا ہے۔“

وہ میرے اوپر اپنی ٹانگ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے  
 ہوئی۔ "تو گویا اولیو یا اس وقت بھی تمہارے آس پاس  
 تمہارے پہلو میں ہے..... بالآخر تم نے اسے بالیا ہے؟"

”اپنی ٹانگ سے کہو کہ میرے زخم کا خیال رکھو۔“  
میں نے غصہ سے لہجے میں کہا۔ ”محبوب کا بھر ہوا  
صال، دونوں بہت دکھ دیتے ہیں۔“

"میں ایک تجربہ کار نرس ہوں اور میں نے تمہارے زخم کی اپنے ہاتھوں سے ڈریسنگ کی ہے۔" اس نے کہا۔  
"مگر مہذب ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا گھٹنا تمہارے زخم

وہ میرے ساتھ اس قدر جڑ کر لیتی ہوئی تھی کہ ہم دو  
 اب ایک جاں ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بدن میں کوئی  
 تشغیر مادہ بھرا ہوا تھا جس کی آج مجھے پھلانے کی کوشش

ہوئے لہجہ میں بولی۔ ”میں جڑا کر اٹھ بیٹھی اور اب یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ وہ نامراد ہو سکی اس بیڑہ روم میں گھس آئیں گے اور میری ٹکا بولی کر کے ہوا میں گئے۔“

اس میں اس کی انسانی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی اسٹوری سے متاثر کرنے کے لیے جو ٹوٹی ڈراما رچایا تھا، وہ اس کے لاشعور کا کائنات بن گیا تھا۔ آپ اسے گلٹ یا ضمیر کا جو بھی کہہ سکتے ہیں جو خواب کی صورت میں اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا اور شرفی بصرے لہجے میں کہا۔

”تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے چل شروع کرنے کے لیے اس جٹ کا حصار کھینچ لیا تھا۔ کوئی بھی خطرناک جانور، پرندہ یا حشرات الارض اس حصار کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔ تم اطمینان سے لمبی تان کر سو جاؤ۔“

”حصار..... یو مین سینٹی وال؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”یس..... آکی مین اسٹ۔“

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے لیکن پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے علی.....“ وہ امداد طلب نظر سے میری جانب دیکھنے لگی۔

”کیا تم سلیپنگ بیگ کو خیر باد کہہ کر بیڈ پر سو سکتے ہو؟“

میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم سلیپنگ بیگ میں سونا چاہتی ہو؟“

”نن..... نہیں۔“ وہ فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی ادھر ہی رہوں گی۔“

کسی بھی انسان کو معصیت میں گرفتار دیکھ کر اس کی مدد نہ کرنا سراسر غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویت ہے۔ ان نجات میں وہ غور فہم لڑکی بڑی آس اور امید بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے مودل سپورٹ دینے کا فیصلہ کر لیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔“

”یہی شرط؟“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔  
 ”تم بوتل سے مٹا توڑ لوگی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

جانتا ہے البتہ موسم گرما یعنی دسمبر جنوری میں گا ہے بہا ہے یہ  
ہنا دیدار کرو اتار ہتا ہے۔

ایک گھنٹا پہلے کا یا سونے کے لیے بستر پر چلی گئی تھی اور یہی سلیپنگ بیگ میں گھس گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک کا یا کو گہری نیند میں چلے جانا چاہیے تھا لیکن فی الحال ایسے کوئی آخر مجھے "سنائی" انہیں دے رہے تھے یعنی بیڈروم میں موت کا سکوت طاری تھا، اس کے غروں کا لایت نائٹ شو شروع نہیں ہوا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کایا کی خبر لینا چاہیے اور وہ بھی سلسلہ جنگ کے اندر لینے لیتا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے دل پر توجہ مرکوز کی اور کایا کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ تکنیک مجھے جی ایم اسمرنے سکھائی تھی۔ تب میں گاہے پر گاہے اس کا تجربہ کر رہا تھا تھا۔ بیٹا دالے بارگھنٹ میں بھی میں نے اسی عمل کے ذریعے مسلمان اور

دوبی کی آمد کو محسوس کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے کایا کے بارے میں اسٹراٹج ٹیل آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پیدل پیدل میری جانب دیکھ رہی ہے۔ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے دوڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ بس ایک لمحہ سانس نہ لے کر

یہ شب بیداری کا سبب جانے کی خواہش میرے دل میں  
اُٹھ اُڑی اور میں نے سلسلہ تنگ بیگ کے اندر سے پوچھا۔

”کایا! کیا تمہارے ساتھ کوئی پرالہم ہے۔ تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہو؟“

”اوہ.....!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔  
 ”تو تم بھی جاگ رہے ہو۔“

”میری ابھی آنکھ کھلی ہے۔“ میں نے جی بر مصحف  
 روغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا اور بیگ سے باہر منہ  
 بال کر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے تو مجھے  
 آؤ۔۔۔۔۔؟“

”مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ سر اسیہ آواز میں

”کیسا ڈر؟“ میں نے استفسار کیا۔  
”میری آنکھ لگ گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں

اس کی آواز سے خوف جھٹکتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

تم نے خواب میں ایسا کیا دیکھ لیا ہے؟“  
 ”ہسکی ڈاگز میرا تیا پانچا کر رہے تھے۔“ وہ سبے

”اسد علی۔“  
 ”وہی! اگر تم مجھے اسکاٹ میں پہنچانے کے لیے اس  
 ہٹ سے نکلے تو پھر تمہارے چلے کا کیا ہوگا۔ تم تو کسی ادویہ  
 کو پانے کے لیے اس دور دراز سرد خانے میں بیٹھے  
 ہو.....!“

اس کو کہتے ہیں ”کچھ بچہ نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔“ کو یا وہ یہ چاہتی تھی کہ میں اس ہٹ سے پرے نہ ہوں۔ وہ مجھے بینک پر متحیر کھنے اور مجھ پر خود کو مسلط کھنے کی خواہاں تھی۔ بلا واسطہ اس نے میرے تمام تر اندیشوں اور خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

”چلے کا کیا ہے۔ کبھی تمہاری منزل پر پہنچانے کے بعد دوبارہ زبردست شروع کر دوں گا۔ ویسے صبح منٹوں میں تو ابھی میں نے چلے کا آغاز ہی نہیں کیا تھا۔ آج پہلا دن تھا اور آج ہی.....“

”آج ہی میں نازل ہوئی..... ہیں نا؟“ اس نے شرارت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ”میں نے تمہارے پروگرام کو ٹریڈ کر دیا ہے نا.....!“

”تم تازل ہوئی ہو یا پکا کی گئی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے سمجھ کر انداز میں کہا۔ ”تمہیں خود کو مورد الزام ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا ہے کہ کس نے کس کو کتنا دُشرب کیا۔“

”اٹس او کے!“ وہ اپنے بوب کٹ بالوں کو بڑی ادا سے جھپکتے ہوئے بولی۔ ”لیٹس ڈیٹ اینڈی.....“

اس تمام تر گفتگو میں جو کام کی بات پہنچی، وہ یہ تھی کہ آئینہ جولائی کو یہی ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ایک چوڑے طیارہ اسکاٹ میں سے کراسٹ چرچ کی سمت پرواز کرنے والا تھا۔ اگر میں کسی بھی طرح اسکاٹ میں تک پہنچ جاتا اور کوئی بھی ترکیب آزمادہ کو وہ طیارے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس برف زار جزیرہ راس سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆  
رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد چوتیس جولائی کا سورج طلوع ہونے والا تھا اور یہ "طلوع" محض زبانی مع خراج تھا۔ درحقیقت انارکلیکا کے ونٹریزن (جون، جولائی) میں "طلوع آفتاب" کا ذکر "دل کو خوش رکھنے کے لیے غالب یہ خیال اچھا ہے" کی عملی تفسیر ہے کیونکہ موسم سرما سورج کی شکل دیکھے بغیر سب گزر



میں تھی۔ وہ قدم میں مجھ سے کافی کم تھی۔ اس کا سر میری پالیوں تک آرہا تھا۔ میں اس کی جانب کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

کایا کی آتشیں سائیس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔ میں نے مسود پلاؤ کا ڈاکٹہر کھینچنے کے لیے بے اختیار اس کے بالائی ہونٹ کے سنے کو چوم لیا۔ وہ پست قامت پاکٹ سائز نیوزی لینڈر گڑیا میرے وجود میں بیوست ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ مجرورہ چڑھی ہوئی سانسوں کے جھج بولی۔

”علی اتم بہت بد معاش ہو.....!“

”شکریہ.....“ میں نے کہا۔ ”تمہارا دیا ہوا یہ ٹائل میرے بہت کام آئے گا۔“

”میں بھی نہیں۔“ وہ اپنے چہرے کو میرے سینے میں کھساتے ہوئے بولی۔ ”تم کس کام کی بات کر رہے ہو؟“

”اس ٹائل کی بدولت میں کسی بھی وقت تم سے بد معاشی کر سکتا ہوں۔“ میں نے اس کے بوب کٹ مختصر بالوں میں اپنی اگلیوں سے لکھنسی کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تم مجھے روک نہیں سکو گی کیونکہ یہ ٹائل تم ہی نے تو دیا ہے۔“

”کیا کوئی اور بھی بد معاشی باقی ہے؟“ اس نے غمور لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ تو ابتدا ہے۔“ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو جاکل کرتے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھتی جاؤ، ہوتا ہے کیا!“

”اوں..... مجھے خند آ رہی ہے۔“ وہ مدہوشی بھرے انداز میں بولی۔

کایا کی خند اڑانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اس کے کان کی لو پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اسکل اینڈ یوز میں کب سے کام کر رہی ہو؟“

اس کے ذہن کو گیارہ ہزار دولت کا جھٹکا لگا اور اس نے خود کو مجھ سے الگ کرنے کے لیے زور مارا۔

میری گرفت اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ پچھلی پچھلی کے مانتہ پھسل کر میرے بازو کے سٹپے سے نکل جاتی۔ وہ بے بسی سے کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان سے لگا کر دوبارہ سرگوشی کی۔

”ڈیٹلیٹا نے مجھے تمہاری آمد کے بارے میں پہلے سے بتا دیا تھا اور میں نے تمہارے بیگ میں موجود کیسٹ پائیز میں لگی ہوئی کیسٹ کو پورا سنا کر کے سن لیا ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ برہمی سے بولی۔

”چھوڑ دو مجھے.....“

میں نے اسے اپنے بازو کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کہا اور میں نے چھوڑ دیا لیکن..... میں جھوٹا نہیں ہوں۔ میں نے اس کیسٹ میں ریکارڈ شدہ پائیز یوں کی آوازیں سنی ہیں جنہیں تم ہنسی ڈاکٹر کہہ رہی تھیں۔“

”میں نے جھوٹ والی بات اس کیسٹ کے حوالے سے نہیں کی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا اشارہ ڈیٹلیٹا کی طرف تھا۔“

”تو اس اشارے کے طفیل تم نے تسلیم کر لیا کہ تم ”اسکل اینڈ یوز“ کا حصہ ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میرے استفسار پر تمہیں گرفت نہیں لگنا چاہیے تھا۔“

”تم صرف بد معاش ہی نہیں، بہت چالاک بھی ہو۔“ وہ اپنے ہونٹوں کا کپڑا کرتے ہوئے بولی۔ ”ڈیٹلیٹا نے تم پر گراں مقرر کرتے ہوئے مجھے دو حیرتوں بدایات دی تھیں۔ میں ہر لحاظ سے بہت محتاط تھی۔ ایک ایک قدم چھوٹک چھوٹک کر کھڑی تھی کہ تم نے مجھے پھنسا لیا۔“

”مجھے الزام نہ دو۔ سترہ تم نے مجھے بلایا تھا۔“ میں نے اسے اپنی جانب کھینچنے کے لیے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نے جو کچھ بھی کیا وہ حالات اور وقت کا تقاضا تھا اور حالات ابھی جوں کے توں ہیں لہذا وقت کے تقاضوں کی تکمیل کا مکمل جاری و ساری رہنا چاہیے۔“

کایا نے میری کارروائی کے راستے میں کوئی مزاحمت کھڑی نہیں کی۔

☆☆☆

چوبیس جولائی کی شام ہم بیڈروم میں بیٹھے ڈرائی فروٹ اور کافی سے شغل کر رہے تھے۔ کایا آج صبح ہی سے کافی ٹھہری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں مستی بھری ہوئی تھی۔ اس نے دل آویز انداز میں مجھے دیکھا اور بڑی لگاوت سے بولی۔

”رات تم نے بڑی مہارت اور چالاک کی سے جھوٹ بول کر مجھے ایکسپوز کر دیا۔“

میں انجان بن گیا۔ ”کون سا جھوٹ؟“

”وہ جو تم نے ڈیٹلیٹا کا رٹیرنس دیا تھا۔“

”اچھا وہ.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”ڈیٹلیٹا سے تو میرا کھانا چلتا ہے۔ ہم ایک دوسرے پر ادھار چڑھاتے اور اتارے رہتے ہیں لیکن ابھی حساب

کو بے باقی نہیں کرتے کیونکہ ریکارڈ کے رجسٹر پر کھانا چلتا رہنا چاہیے اور جہاں تک تمہارے ایکسپوز ہونے کا معاملہ ہے تو میں گزشتہ روز صبح ہی یہ کام کر چکا تھا، جب تم مشروب کو اپنے معدے میں انڈیل کر بے خبری کی خیند سو رہی تھیں۔ اس دوران میں ہٹ سے باہر جا کر میں نے تمہاری سیلف پروڈکشن بجھڑیوں کی آوازوں والی کیسٹ کو پلے کر کے سن لیا تھا جس کے باعث تمہاری ذات شک کے دائرے کے اندر آ چکی تھی پھر پچھلی رات میں نے ڈیٹلیٹا کے حوالے سے ایک بلاسٹڈ چال چلی اور تم اس چال میں آ گئیں لیکن تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میں پریشان کیسے نہیں ہوں۔“ وہ متردود نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر یہ بات سوسائٹی کے لوگوں تک پہنچی کہ تم میری اصلیت جان چکے ہو تو یہ مشن کھٹائی میں پڑ جائے گا اور میری اس کوتاہی کے نتیجے میں ادھر سے مجھ پر جو عتاب نازل ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”جہاں تک سیکرٹ سوسائٹی کو اس معاملے کی خبر ہونے کی بات ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ راز ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ نہ میں کسی کو بتاؤں گا اور نہ ہی تم کسی سے اپنی غلطی کا ذکر کرنا۔ تمہیں جو ذمے داری سونپ کر یہاں بھیجا گیا ہے، تم اس کام سے لگی رہو۔ میں تم سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تمہارا مشن کیا ہے۔“

چند لمحات تک وہ مجھے ٹوکتی ہوئی نگاہ سے دیکھتی رہی پھر بے یقینی سے مستفسر ہوئی۔ ”کیا واقعی تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے؟ کیا میری یہ غلطی اسی برف زار میں دفن ہو جائے گی.....؟“

”فی الحال تو میں تمہیں زبان ہی سے یقین دلا سکتا ہوں۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”جب وقت پڑا تو اپنی بات کا مکمل ثبوت بھی پیش کر دوں گا۔“

”تم بہت اچھے ہو.....“ وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تمہیں اپنا دوست سمجھوں؟“

”فریڈ شپ تو ابھی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”کل رات تک تو ہم ایک دوسرے کے لیے آہنی (Enemy) یعنی دشمن ہی تھے۔“

”اب چھوڑنا۔“ وہ بڑی ادا سے بولی۔ ”جب دوستی ہوگئی تو پھر ان باتوں کا کیا فائدہ؟“



”لو چھوڑ دیا۔“ میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“  
وہ ابھرنے لگا۔ ”میں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔“

نے پر خیال انداز میں کہا۔  
”کون سا زانو؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔  
اس دوران میں دو تھکے تھکے سے محسوس ہونے والے ہلکے جھکوں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ میں نے کایا کے سوال کے جواب میں کہا۔

”آؤ۔۔۔۔۔ ہٹ کے اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ اگر ہم چند منٹ اور کھلے میں ٹھہرے رہے تو ہماری کٹنی جم جائے گی۔“

ہم دوبارہ بیڈروم میں پہنچے تو کایا نے اپنا سوال دہرایا۔ ”تم کس زانو کی بات کر رہے تھے؟“  
”میرا اشارہ منکر ڈاؤنٹین کی جانب تھا۔“ میں نے سمجھا کر انداز میں کہا۔ ”میں ممکن ہے، اس ریسرچ اسٹیشن پر زبر برف کسی پلانٹ میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہو یا ان لوگوں نے خود ہی کسی دور دراز علاقے میں زبر برف کوئی تجربہ کر ڈالا ہو۔ کوئی ایسی تجربہ۔ یہ لوگ یہاں پر کوئی باسکٹ بال کھیلنے تو آئے نہیں!“

”تجربہ ہی بات میں وزن ہے۔“ وہ سر اسیرہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ان لوگوں کی ریسرچ کافی حد تک خطرناک ہے۔ اس کے علاوہ وارمنگ“ بڑھ رہی ہے۔“

”صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ ہلاکت خیز کہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں پڑھی ہیں اور بعض مود پر بھی دیکھی ہیں۔ وہ تو ایسی طاقت کے استعمال کا ابتدائی تجربہ تھا۔ میرا شیشا اور ناگاساکی میں ہزاروں ہلکے لاکھوں افراد دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے اہل بن گئے تھے، لوہے کے مضبوط برج پھسل گئے تھے اور اس تباہ کاری کے نتیجے میں وہاں کی زمین کی وہ حالت ہوگئی تھی کہ آج تک اس زمین میں گھاس کا ایک ٹکڑا تک نہیں اگ سکا۔“ لکھائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو لگ بھگ ستر سال پہلے کی بات ہے جب یورپیہ اور پادشہیم کو پہلی بار تباہ کاری اور ہلاکت خیزی کے لیے ایسی ہی کم ضرورت استعمال کیا گیا تھا اور آج تو ایسی ریسرچ بہت آگے تک جا چکی ہے۔ اگر منکر ڈاؤنٹین والوں نے اپنی دیواریں میں کوئی ایسی ویسی حماقت کر دی جس کے نتیجے میں انارکٹیکا کی برف پگھلا شروع ہوگئی تو ہم خود اندازہ لگا لو کہ اس کے کتنے مہیا تک نتائج دیکھنے کو ملیں

وقت

حرارت کے ماحول میں بارش برسنے کا سوال ہی پیدا نہیں کرتا۔“  
وہ ایک جھرمجری لیتے ہوئے بولی۔ ”علی! ڈراؤ تو نہیں۔“

”میں حقیقت جان کر رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گھولیں وارمنگ نے پہلے ہی اس کرۂ ارض کی مٹی گرم کر رکھی ہے۔ اگر خدا انخواستہ کسی ایسی حماقت کے نتیجے میں انارکٹیکا کی ساری برف پھسل گئی تو سمندر کی سطح دو سو تیس فٹ یعنی ستر میٹر تک بلند ہو جائے گی۔ سمندر میں اس طغیانی کے باعث دنیا کے پچانوے چھانوے فیصد شہر زیر آب آجائیں گے۔“

”تم بہت محتاط انداز میں ”زیر آب“ کے الفاظ استعمال کر رہے ہو۔“ وہ تشویش بھرے انداز میں بولی۔ ”میرے حساب سے تو ڈیوئیڈ اور اس جیسے چند شہر ہی دنیا کے نقشے پر موجود ہیں گے۔ باقی سب پگھل فریق ہو جائے گا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”امریکی ریاست کولورڈو کا شہر ڈینور (Denver) سی لیول یعنی سطح سمندر سے لگ بھگ ایک میل بلندی پر واقع ہے۔ اگر ہاتھ پھیلے، ساؤتھ پول، گرین لینڈ، الغرض ساری دنیا کی برف ہی پھسل جائے تو جب بھی سطح سمندر اس شہر کو غرقاب نہیں کر سکتی۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر ہٹ کے باہر ایک ہولناک گڑبڑا ہٹ سنا دی۔ یہ آواز بادلوں کی ٹھن گرج سے مشابہ تھی۔ ہم دونوں نے ابھرنے لگا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں ہی کی آنکھوں میں یہ سوال تھا۔۔۔۔۔ یہ کس چیز کی آواز ہے؟

”علی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ مجھ سے چپکے ہوئے بولی۔  
میں نے اسے سینے سے لگا لیا پھر اس کی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ لگتا ہے، بارش ہونے والی ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔  
”جی، ہادل گرے ہیں تو بارش ہوگی۔۔۔۔۔ میں نے اس کی پیٹھ سہلانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کسمکائی پھر اچھا پھر میرے چہرے کے سامنے لاتے ہوئے بولی۔ ”علی! شاید ہمیں معلوم نہیں، انارکٹیکا پر بارش کا کوئی تصور نہیں۔ مٹی کوئی۔۔۔۔۔ ڈگری مٹی گریز درجہ



وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "تم نے بتائیں، میرے ساتھ کیا کروایا ہے۔"

میں نے اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کے پیش نظر قلبی آمیز انداز میں کہا۔ "کایا! تم فکر نہیں کرو۔ اگر میں نے تمہیں کمزور اور بزدل بنایا ہے تو میں ہی تمہارے اندر طاقت بھروں گا۔ تمہاری ساری کمزوری اور بزدلی جاتی رہے گی۔ تم پہلے والی کایا بن جاؤ گی۔ نڈر اور بہادر کایا!"

"تم نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن میں خود تمہیں بتاؤں گی۔" وہ میری سنی آن سی کرتے ہوئے اپنی ہی ذہن میں بولتی چلی گئی۔ "تمہیں پتا ہے، میرا مشن کیا تھا؟"

"تمہیں پتا۔۔۔۔۔" میں نے اس کا نفسیاتی فریڈٹ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم اپنی زبان سے بتاؤ، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"تم سو سناؤ گی! تمہاری نظر میں بہت اہمیت کے حامل ہو۔" وہ ہٹانے لگی۔ "انہیں تمہارا بہت خیال ہے۔ میں ایک تجربہ کار نرس ہوں۔ انہوں نے تمہاری کینسر کے لیے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ مجھے ہفتہ بھر یہاں رک کر تمہارا خیال رکھنا تھا۔ جب تمہارا دھم پوری طرح بھر جاتا تو پھر مجھے یہاں سے اچانک چلے جانا تھا جیسا کہ میں اچانک یہاں آئی ہوں۔۔۔۔۔"

"ڈونٹ وری۔ تم نے پچھلے دو دن میں میری بہت کینسر کی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہو گی۔" میں نے قطع کلای کر دے ہوئے کہا۔ "اپنی بات جاری رکھو۔ میں بہترین گوش ہوں۔" موجودہ حالات نے کایا کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو اعتدال پر لانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیا جائے اور میں اس پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

"میرا کردار ایک سہولت کار ایسا تھا۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تمہارے مکمل فٹ ہونے تک یہاں قیام کرنا تھا۔ میں نے اس ہٹ پر اپنے قیام کے لیے جو چال چلی تھی وہ تم نے بکری۔ تمہیں پتا چل گیا کہ میں نے اس سہولت کی مدد سے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔"

"گڈ سے مردے نہیں اکھاڑو۔" میں نے ایک بار پھر لہجہ دیا۔ "اب ہم دوست ہیں اور ہمیشہ اچھے دوست ہی رہیں گے۔"

"تھیک پوٹلی۔" وہ منہ دیکھتے پھرے لہجے میں بولی۔ "دوستی میں تھیک ہو، سواری اور ایلیکسیوڈی کی کنٹیکٹ نہیں ہوتی۔" میں نے دلوک انداز میں کہا۔ "اپنے مشن کا احوال بیان کرتی جاؤ۔"

"جب تم صحت یاب ہو جاتے تو انہیں جولائی سے پہلے کسی بھی دن میری نیم کے دیگر افراد آسکر، اولیور اور آئیلا مجھے تلاش کرتے ہوئے ابھر آتے۔ پھر میں ان کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جاتی۔ تمہیں یہی محسوس ہوتا کہ تمام حالات نارمل انداز میں پیش آتے ہیں اور میرا مشن مکمل ہو جاتا۔"

کایا کی باتوں نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آسکر، اولیور اور آئیلا وغیرہ ہمارے قریب ہی کبھی موجود ہیں؟"

"نہیں!" اس نے پوری قطعیت سے سر کوئی میں جھٹکا۔ "انڈارکینکس اس کراؤش کا سروسٹین حصہ ہے۔ یہ ایک برف دار ہے۔ یہاں پر موجود سیلوں مولی آئسن شیٹ، سیلوں طویل آئسن شیٹ، ٹنوں پر رکھنے والے گلیشیر اور آئسن برگ بہت خطرناک ہیں۔ اگر مکمل عام یہاں زندگی بسر کرنا ممکن ہوتا تو پھر یہ براؤن مہر آباد نہ ہوتا۔"

"تمہاری وضاحت سے میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ تمہارے ساتھی تمہیں یہاں پہنچانے کے بعد واپس چلے گئے تھے؟"

"ہاں۔ انہیں اسکاٹ میں پر ہی قیام کرنا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ لوگ آئسن جولائی کو یہاں آئے اور یہی ظاہر کرتے کہ میری کشدگی سے وہ بہت پریشان تھے۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اسکاٹ میں چلے جاتے جہاں سے ہم سب آئسن جولائی کو واپس کراؤش چرچ کے لیے پرواز کر جاتے۔"

بات ختم کر کے اس نے خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس ذریعہ بھی لڑکی پر مجھے بہت پیارا آیا۔ میں نے اس کا ذہن نکالنے کے لیے اسے اپنی باتوں میں بھرا۔ وہ خود سیردی کے انداز میں میرے بدن کا حصہ بن گئی۔ دو زندہ جسموں کے شیعرتنگ نمبر پچھنے نے مجھ پر جذباتی کی گھٹک کو کھسکتا فاش سے ہلکا کر دیا تھا۔

رات کے باقی حصے وقفے وقفے سے گھن گرج سے مشابہ گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہی۔ جب بھی یہ بہت ناک آواز ابھرتی، کایا ہم کراسر اندر نظر سے مجھے جھکتی۔ میں

وقت

رست واپج پر نگاہ ڈالی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہاں کا درجہ حرارت منفی تین ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔"

نیل کریم نے مجھے جو سٹس واپج دی تھی، وہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ صحت کا درست پتہ لگانے کی سہولت بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ صحت کا درست تعین کرنے کے لیے تھرمسٹکس یعنی قلب نما بھی نصب تھا۔ یہ گھڑی مکمل طور پر دائرہ پروف اینڈ شاٹک پروف تھی۔ ریڈیم ڈائل اس گھڑی میں، گھپ اندر سے میں بھی وقت دیکھا جاسکتا تھا۔

"میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں علی۔" وہ ابھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس برف کے پچھلے کاسب زبر برف کیا جانے والا کوئی ایسی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو بالائی برف پچھلے کے بجائے بریلی زمین میں کریک آتے۔"

"ہم نے رات بھر جو گھن گرج اور گڑگڑاہٹ کی خوف ناک آوازیں سنی ہیں، اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ گلیشیر ریزہ ریزہ اور زمین شق ہونے جا رہی ہے۔" میں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اور زمین ممکن ہے، ایسا ہوا بھی ہو مگر۔ ہمارے ہٹ سے کبھی دور۔ اس سب پر ہم بعد میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ فی الحال ہمیں اپنے علاقے کی سیر کرنا چاہیے۔"

"میر۔۔۔۔۔" اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آؤ۔۔۔۔۔" میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جب تک یہاں کا درجہ حرارت قابل برداشت ہے، ہم گھوم پھر کر گرد و نواح کا جائزہ لیتے ہیں۔"

وہ کوئی سوال کیے بغیر میرے ساتھ چل پڑی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے دھڑے دھڑے آگے بڑھنے لگے۔ ہم ہٹ سے سو گز آگے نکل آئے تو دور ایک منظر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ میں نے مذکورہ صحت میں انکی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کایا۔۔۔۔۔ دیکھو، وہ کیا ہے؟"

کایا نے میری بتائی ہوئی جانب نگاہ دوڑائی اور بولی۔ "مجھے تو یہ کوئی گلیشیر لگتا ہے۔"

"تم نے اس کی شکل پر غور کیا؟۔۔۔۔۔" میرے لہجے میں بے حد سسکی خیزی تھی۔

"کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا اس کی شکل کو؟" اس نے پوچھا۔

اس کی نگاہ کی نگار پر غور الیکٹک تھا۔ رات کے آخری پھر بری طرح نڈ حال ہو کر ہم نے گہری نیند کی آغوش میں پناہ لے لی۔ اس پناہ میں آکر ہر غم مٹ گیا اور اندیشے کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔

کہتے ہیں، نیند ایسی ظالم شے ہے کہ یہ تجھے دار پر بھی آجاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس رات ہم جس نوعیت کے غیر یقینی تا مساعد حالات میں گھرے ہوئے تھے کہ آگے نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر ہمارے اعمال کی فہرست اتنی طویل تھی کہ اس کے پوچھنے نے نیند کی راہ ہموار کر دی تھی۔ ہم تھک کر اس بری طرح پچھڑ ہو گئے تھے کہ ایسی گہری نیند آئی کہ پھر اگلی صبح ہی کی خبر لائے۔

اور یہ خبر کوئی خوشخوار نہیں تھی۔۔۔۔۔!

جب ہم نے ہٹ سے باہر جھانکا تو وہاں کی دنیا سی بدل چکی تھی۔ ماحول کے تغیر کی اس تبدیلی نے ہمیں بری طرح چونکا دیا تھا۔ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں موجود بہت سی آئسن شیٹ، آئسن شیٹ وغیرہ اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں اور بعض برفاالی تو دووں کے سائز میں حیرت انگیز طور پر کچی واقع ہو چکی تھی۔

یہ برف کیسے پچھل گئی؟۔۔۔۔۔ کایا کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے گھرائی۔

میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے تو یہ زبر برف کسی ایسی دھماکے کا شکار لگتا ہے۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ میکرو ڈائنمکس والوں کے کسی تجربے نے زبر زمین درجہ حرارت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ برف کو پچھلنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"او مانا گاش۔۔۔۔۔!" وہ متوجہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "پھر تو یہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

آج کل کی فنی پودے نے گاؤں کا گاش میں بدل دیا ہے۔ اگرچہ میں بھی اس پودا کا ایک نمائندہ ہوں لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جوان جسم میں کسی بوڑھی روح نے بسیرا کر رکھا ہو۔۔۔۔۔!

"یہ ہٹ ابھی تک محفوظ ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ آگے چل کر بھی محفوظ ہی رہے گا۔" میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "ویسے میں ایک بات محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں کی ماحول فضا کے درجہ حرارت میں قدرے کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی لیے ہم کھلے میں کھڑے بڑے آرام سے باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی



ظفر اقبال ظفر

اس کائنات کی ہر شے کو ایک نہ ایک دن بالآخر اپنے مرکز کی جانب لوٹنا ہے... یہی اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے جسے ہر کوئی باسانی نہیں مانتا جب تک کہ وقت اسے کوئی سمیق نہ سکھائے... اسے بھی وقت کی ایک بڑی ٹھوکرنے احساس دلایا کہ یہ مسلسل ایک غلط سمت میں محو سفر تھا۔

موت سے خوفزدہ ایک مریض کے اذیت ناک خیالات کا اظہار

”لو بھیجی شہاب غوری نے بھی اپنا رخت سفر باندھ لیا،  
زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔“

”کون شہاب غوری؟“

”ارے وہی شراب غوری، کارپوریشن کا چیف انجینئر،

شراب پی پی کر جگر خراب کر لیا اپنا۔“

اس نے، ٹھیکیداروں سے ہماری رشوتیں لے کر پراپرٹی بنائی یا پھر اوپر کی کمائی شراب میں بھائی۔“

یہ کہتے ہیں آگیا تھا۔ میرے پاس



”اس دیویکل کشمیری کی چوٹی کو غور سے دیکھو۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو یہ کسی ہوائی جہاز کی دم سے مشابہ لگتا ہے۔“

”شاہیہ یہ تمہارا وہم ہو۔“ اس نے میری بات کو یاد  
سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ ”افسانی ذہن کو ایسے دھوکے  
ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر گھرے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر بھی  
ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے روٹی کے ٹکڑوں سے  
دہاں مختلف شخصیات بنی ہوئی ہوں۔“

”یہ میرا دہم ہے یا لہجہ میری دھوکا۔“ میں نے پُر عزم لہجہ میں کہا۔ ”میں اس گھٹیشیر کو قریب سے دیکھنا چاہوں گا۔ کیا تم میرے ساتھ آ رہی ہو؟“

”میں ہر جنت اور ہر دوزخ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ چٹائی بچے میں بولی۔ ”تم کبھی بھی مجھے خود سے ایک قدم پیچھے نہیں مارو گے۔“

رات بھر خوف زدہ رہنے والی وہ پاکستان ساز بیوی  
 لیڈر حسین اس وقت بلا کی خود اعتماد اور مہم جو نظر آ رہی تھی۔  
 گویا میرے ٹرینٹ کے بعد وہ اپنی اپنی جوں میں آ گئی  
 تھی۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور آگے  
 بڑھنے لگا۔

وہ ننگ ساڑ برفانی تو وہ اگرچہ ہمیں قریب ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن یہ بھری قربت اس کے دیو نیل ساڑ کی بدولت تھی۔ درحقیقت وہ اس برف غمری میں ہم سے خاصے فاصلے پر ایسا وہ تھا۔ میں اور کایا آگے پیچھے اس مکشیر (برفانی توڑے) کی سمت قدم بڑھا رہے تھے۔

میری رفتار کا کیا کی بہ نسبت قدرے زیادہ تھی لہذا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارے بیچ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا تاہم میں وقفہ وقفہ سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا اور مطمئن ہونے کے بعد پھر آگے بڑھنے لگتا تھا۔

ہم نے مشکل ڈھائی تین سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کایا کی گھبراہٹ ہوئی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ”علیٰ فوراً ادھر آؤ۔۔۔۔۔ برف نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ یہاں کی برف بہت نرم ہے۔ چلیں، میری مدد کرو۔“

کایا کی مصیبت زدہ پکار نے میرے پورے بدن میں سنسنی کی دوڑ اڑی۔ میں نے فوراً سے خوشتراس کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان لحظات میں میرا ذہن صرف ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا کہ مجھے کسی بھی صورت کایا کو برف میں دھنسنے سے بچانا ہے۔

”علی..... پلیز، جلدی کرو..... میرے شوز برف کے اندر دھسن چکے ہیں۔“ کایا کی فریاد نے میرے دل پر گھونسا سید کیا۔ ”اور میں بھی اس برفانی دلدل کے اندر اتر رہی ہوں۔“

ہمارے بچہ پہ مشکل نہیں گزرا کا فاصلہ تھا لیکن اگلے  
بھی لمحے یہ فاصلہ میں صدیوں کی دوری تک پھیل گیا۔ میں  
آنکھوں اور طوفان کی رفتار سے کایا کی جانب بڑھ رہا تھا  
کہ اچانک مجھے محسوس ہوا، میں برف کی سخت سطح پر نہیں  
لوڑ رہا بلکہ کسی سوئٹنگ بول میں تیر رہا ہوں۔ سیکنڈ کے  
دوسرے حصے میں میرا جسم گردن تک بھر بھری برف کے  
اندروں میں گھس گیا۔

یہ سب کچھ آنا فائنا میں ہو گیا تھا۔ مجھے سوچنے کی بجائے موقع ملا تھا اور نہ ہی اپنا بیجاؤ کرنے کی صلت۔ میں بے رحم بڑھکری برف کے تادیبہ میں آ گیا تھا۔ میرے ساتھ پاؤں اور پورا ہڈی برف چاچکا تھا، صرف گردن باہر تھی درود بھی کسی ٹیکسیر کے مانند سلاکت کرتے ہوئے رفتہ رفتہ قلعہ دفن کی طرف بچھو تھی۔

یہ بھری زندگی کے سب سے زیادہ لاچار لمحات تھے۔ میری دوست کا یا..... چہرہ قدموں کے قاصطے پر مجھ سے زندگی کی ہلک باریک رہی تھی اور میں اس کے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غایت بھر بھری برف نے میرے پورے جسم اور میری سوچ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ نعمت سیری سماعت اور بصارت نے کام کرنا چھوڑ  
یا۔ میں مکمل طور پر زیر برف جا چکا تھا۔ میرے دماغ نے  
آخری سسٹل دیا، وہ یہ تھا۔

”اسد علی! کلمہ پڑھ لو۔ تمہارا آخری وقت آگیا ہے۔“

منہگوں حوصلوں اور آسوں کے ہیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں



شہاب غوری کے حلقہ احباب میں یہ تذکرے عام تھے اور وہ خود "لائف ہاسٹل" کے پرائیویٹ روم میں واقعی زندگی اور موت کے درمیان خوف اور ہلاکت کی چادر اوڑھے پڑا تھا۔ شہاب غوری کی سرکاری نوکری ابھی جاری تھی۔ ابھی اس کی عمر نے پچاس کا ہندسہ ہی عبور کیا تھا۔ اب تک کی سروس میں اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت کمائی تھی۔ زیادہ اولاد کا جنم نہ اس نے نہیں پایا تھا۔ دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی رباب اور چھوٹا بیٹا عبدالوہاب، رباب نے شوقیہ طور پر ڈریس ڈیزائننگ کا ڈیپلوما کیا تھا۔ شہاب غوری نے اس کی شادی اپنی بہن کے بیٹے ڈاکٹر حسن بھٹائی سے کر دی تھی۔ حسن بھٹائی نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ ایف سی بی ایس مکمل کیا اور اب وہ شہر کا ایک معروف میڈیکل اسپیشلسٹ فزیشن تھا۔ شہاب اپنے بیٹے عبدالوہاب کو پروفیشنل تعلیم دلا کر اپنی طرح کماؤ پوت بنانا چاہتا تھا لیکن عبدالوہاب اپنے باپ کے برعکس شروع سے ہی نماز روزے کا پابند اور سنجیدہ مزاج نکلا تھا۔ اس نے باپ کی منشا کے بالکل الٹ اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری حاصل کی اور سیرٹ پر پبلشر اور جرنل ہو گیا۔ ان دنوں عبدالوہاب ایک مقامی کانج میں اسلامیات کا لکچرر تھا۔ شہاب غوری اپنے معاملات کے سبب جتنا بدنام تھا، عبدالوہاب اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے اتنا ہی نیک نام ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ بعض عزیز رشتے دار تو فرعون کے گھر میں موسیٰ والی مثال دے کر باپ کے تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ابھی رینائرمنٹ تک شہاب غوری نیچے تختی دولت اور سمیٹا کر چائیک اس کا جگر جواب دے گیا اور اب شہاب غوری کی کتاب زندگی کے آخری اور اقی موت کے ہولناک اندیشوں کے درمیان پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"لائف ہاسٹل" شہر کا مہنگا ترین اسپتال تھا۔ غریب تو دور کی بات، سفید پوش لوگ بھی اس اسپتال کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ اس اسپتال کے ڈاکٹروں کی بیماری فیسوں کے علاوہ ضروری اور غیر ضروری میڈیکل ٹیسٹ اور انجیلاز کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن شہاب غوری کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کا داماد ڈاکٹر بھٹائی ابھی سرکاری ڈیوٹی کے بعد اس پرائیویٹ اسپتال کا بڑا فزیشن تھا چنانچہ آج فانا شہاب غوری کو ابتدائی طبی مرہل سے گزار کر پرائیویٹ روم میں پہنچا دیا گیا اور اسپتال کے پورے محلے کو اثر کر دیا گیا۔

☆☆☆

گزشتہ صفحے اور اتوار کی درمیانی رات تھی کہ دوستوں

نے شہاب غوری کو نصف شب کے قریب مکمل مدہوشی کی حالت میں اس کے گھر پہنچایا تھا۔ شہاب کی بیوی سائرہ فزیشن کی مرینسنگی جو ابھی دوامی کے لیے فزیری کی ٹینڈسری میں مگن رہا عبدالوہاب دیر تک مطالعہ کرنے کی عادت کے سبب جاگ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی سے نوٹی کی عادت سے واقف تو اچھی طرح تھا لیکن ایسی نشوونما تک حالت میں اس نے باپ کو پہلی بار دیکھا تھا چنانچہ وہ گھبرا گیا اور اس نے اپنی ماں کو چگانے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ڈاکٹر بھٹائی کو اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر بعد شہاب غوری کو لائف ہاسٹل منتقل کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں جان لیوا خاموشی تھی۔ شہاب غوری بستر پر دراز تھا اور سامنے نظر آنے والے نشوونما زندہ چروں کو اپنی وحشتناک ہوتی آنکھوں سے تنگ رہا تھا۔ اس کے پیٹ کے اطراف میں اس کی بیوی سائرہ، بیٹی رباب، داماد ڈاکٹر بھٹائی اور بیٹا عبدالوہاب اسے شکر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں کہاں ہوں، مجھے کیا ہوا ہے؟" شہاب غوری کی لرزتی ہوئی آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔

"مدہوشی کی حالت میں آپ کو خون کی الٹی آئی تھی اور پھر فوری طور پر آپ کو یہاں لایا گیا۔ آپ اس وقت اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ہیں۔" عبدالوہاب نے بھڑائی ہوئی آواز میں وضاحت کی۔

بیٹے کا سائڈ ریک پر رکھی ہوئی بھاری فائل افکار ڈاکٹر بھٹائی نے صفحے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "ماموں جان! آپ کا جگر..... بڑی تیزی سے خراب ہو رہا ہے۔ اسکریننگ ٹیسٹ سے پتا چلا ہے کہ آپ کو ہپاٹائٹس ہے اور پھر انڈر سائڈ اور لی ہی آرٹی رپورٹس نے یہ ثابت کر دیا کہ..... ہپاٹائٹس نے آپ کے جگر کو خاصی حد تک متاثر کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی آخری اسٹیج نہیں آئی ورنہ لیور ٹرانسپلانٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، ویسے اب بھی آپ بارڈر لائن پر ہیں۔"

"اف! میرے خدا یا....." شہاب نے سامنے دکھائی دینے والی موت سے نظریں چما کر آنکھیں موند لیں۔

"شہاب! میں جتنی دہی، چلاتی رہی۔ تم نے میری ایک نشہ شرب میں غرق ہو کر تم نے اپنا کیا حال کر لیا۔" سائرہ سسکتے ہوئے بالآخر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"امی! ا خدا کے لیے..... ابو بڑا ہیں۔ انہیں اب حوصلہ دینے کی ضرورت ہے۔" رباب نے ماں کو سنبھالتے ہوئے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کیے۔

"رباب! بولنے دو اپنی ماں کو، سائرہ کو غصہ کرنے کا حق ہے بیٹا۔" شہاب کے حلق سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔

اب اسے رورہ کر وہ شب و روز یاد آ رہے تھے جب اس کی بڑی عادت پر سائرہ اس سے لڑتی جھگڑتی تھی۔ کئی کئی دنوں کے لیے روکھ جاتی تھی مگر وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس کے وحشتناک ہونے ذہن کے پردے پر ایک اور منظر ابھر رہا تھا جب ایک رات وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا تھا اور اوپر کمرے کی طرف جاتی سیز حیاں عبور کرتے ہوئے گرنے کو تھا کہ عبدالوہاب نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے قلم لیا تھا اور ڈرتے ڈرتے جڈ بانی لہجے میں کہا تھا۔

"ابو! اس حرام چیز کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے جو انسان کو سیز حیاں سے بھی گرا دیتی ہے اور..... نظروں سے بھی۔"

"تیرا..... چپ رہو، تم اپنے یہ پچھرا کان کے بچوں کو دیا کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ مجھے پچھرو دیتے ہو، مجھے؟"

ہاں، یہی کہا تھا شہاب غوری نے اور عبدالوہاب کے بازوؤں کو جھٹک کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ آج عبدالوہاب سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا شہاب کے اندر۔ شاید موت کے خوف نے اسے اعصابی شکست دے دی تھی۔

"ماموں جان! اگرچہ آپ کا کیس پیچیدگی کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے مگر پچھری..... ہاں، میں نے اپنے سینکڑوں سے ڈسکس کیا ہے آپ کا کیس اور ان سے ایک پھر اوپنیشن بھی لی ہے۔ آپ کا علاج شروع ہو گیا ہے۔ ہم سب پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر بھٹائی نے بے ہرہ سے جھلسوں میں شہاب کو نشوونما تک بیماری سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میری بیماری قابل علاج تو ہے؟"

جواب کی سولی پر لٹکتے ہوئے شہاب نے سرسراہی آواز میں پوچھا۔

"ابو! جتنی پوری کوشش کر رہے ہیں آپ کی زندگی....."

رباب جملہ پورا ہونے سے پہلے رو دی۔

"سائرہ! قریب آ کر میری بات سنو۔" شہاب کی آواز لرزیدہ وجود کے نویں سے برآمد ہوئی۔

سائرہ نے قریب آ کر شہاب کے دونوں ہاتھ قلم لیے۔

"سائرہ! میں ابھی اور جینا چاہتا ہوں۔" شہاب کی زبان سے جینے کی خواہش بھٹکتے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔ پرائیویٹ روم میں ایک ساتھ کئی

سسکیاں گونج اٹھیں۔

☆☆☆

شہاب غوری سے عام ملاقات پر پابندی تھی۔ دفتری محلے کے ساتھی، دوست احباب کی کوٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف عبدالوہاب، سائرہ اور رباب باقاعدگی سے صبح و شام آتے تھے۔ سرکاری اسپتال سے چھٹی کے بعد ڈاکٹر بھٹائی مستقل طور پر رات بارہ بجے تک ہر دو گھنٹے بعد شہاب کے روم کا وٹ کرتا تھا..... اس روم کے لیے ایک تجربہ کار نرس کی سربراہی میں باقاعدہ نرسنگ اسٹاف متعین کر دیا گیا تھا۔

علاج کی بہترین سہولیات کے ساتھ ساتھ شہاب کی خوراک کا بھی خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ کھانے میں زیادہ تر پھلوں کا جوس اور زرد پھل متوی غذا شامل تھی۔ صبح و شام دوا کھلانے کی ڈس ڈاری نرسنگ اسٹاف کے سپرد تھی۔ گیسٹ پر موجود اور ڈیوٹے کے ہدایت کردہ طبی عمل کی کسی اجنبی اور غیر متعلقہ شخص کو کمرے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

شہاب غوری کا بیشتر وقت تنہائی کی صلیب پر گزرتا تھا۔ اگرچہ صبح و شام کمرے اور راداری میں ٹھنکی کی اجازت تھی اور ہدایت بھی کر دی گئی تھی مگر موذی مرض کے احساس اور موت کے خوف نے شہاب کو بہتر تک محدود کر دیا تھا۔ اسے سو ہال فون رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اسپتال سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ شہاب اس سے بالکل بے خبر تھا۔ جگر کے موذی مرض نے اسے دفتری کچھ آرا زندگی اور دوستوں کی بارون محفلوں سے الٹا کر اسپتال کے مستحکم ہونے تیار ماحول میں لا کر پھینک دیا تھا۔ موت کے تاریک سائے شہاب کو ہر وقت اپنے وجود پر منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ سوچتے سوچتے ایک دن اس کا دھیان دفتری کے ہیڈ کلرک رؤف احمد کی طرف چلا گیا جو پچھلے ہی سال جگر کے کیسر میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ صرف تین ماہ کے اندر اندر پیٹھ پیٹھ کا حال رؤف احمد دیکھتے ہی دیکھتے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ شہاب نے خوف سے جگر جھری لی۔

اب دھیرے دھیرے اسے شراب سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ شاید موت کے خوف کے باعث ایسا ہو رہا تھا لیکن سب کچھ لاکھ ہوش میں آئے تو کیا آئے.....

ایک شام حسب معمول عبدالوہاب باپ کی مزاج پر سی کے لیے آیا تو گھر سے لائی ہوئی جائے نماز اس نے بیٹے کے سر ہانے کی طرف رکھی ہوئی تپائی پر رکھ دی۔ عبدالوہاب نے اس بات کو کچھ ناگوار سمجھا لیکن البتہ باپ کے سر ہانے جائے نماز رکھنا ہی اس بات کا اشارہ تھا کہ اب شہاب غوری کو غلوں دل کے



ساتھ اللہ کی طرف رجوع کر لیتا چاہیے۔ شہاب نے جائے نماز دیکھ لی تھی اور یہ احساس اس کے دل میں بھی چٹکی بھر چکا تھا کہ زندگی، موت کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اسے اب یقیناً اپنے معبود کے سامنے سر بخود ہو کر گڑ گڑانا چاہیے۔ ممکن ہے اس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی موت اپنی جین قدی روک دے۔ ممکن ہے کہ اس کی توبہ خدا کے ہاں قبول ہو جائے اور اس کی بے ترتیب الجھتی ہوئی سانسوں میں نئی زندگی کا سلیقہ پھر سے لوٹ آئے۔

عبدالوہاب ڈبڈبی آنکھوں سے باپ کو دیکھتا رہا، حوصلہ دینا رہا اور زیر لب دعا بھی کرتا رہا اور پھر پوچھل قدموں کے ساتھ گھر واپس چلا گیا۔

شہاب غوری اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اپنے وجود کی تہائی سے لڑنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ اسے ہر لمحہ احساس زیاں تانے لگا تھا۔ ندامت اس کے قلب و احساس میں غل کھانے لگی تھی۔ کبھی سلیقہ مند بہی اور وقار شریک حیات سائرہ کا غرور و جبر و آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا اور بھی ارباب اور عبدالوہاب کی دھکی اور معصوم صورتیں دکھانے کے سامنے آ کر غبر جاتیں۔ اب شہاب غوری کو اپنی زندگی کے ان تمام شب و روز اور آلودہ مناظر سے گھن آنے لگی کہ جنہوں نے اسے آج موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد نرس اس کا بلڈ پریشر اور پھر پچھلے آئی تو وہ بھی گھبرا گئی اور شہاب غوری کا چارٹ اٹھا کر لے لے قدموں واپس چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں ڈاکٹر بھیجی اور ایک سینئر ڈاکٹر ممتاز جیسی موجود تھے۔

”دیکھیے شہاب غوری صاحب! آپ لیور کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ کی تمام سیڑجیکل رپورٹس میں دیکھ چکا ہوں۔ خاص طور پر لیڈ و سن سٹی انجین کی رپورٹ نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ آپ اپنی بلاناغی سے اپنا جگر کالی حد تک خراب کر چکے ہیں۔ اب لیور کو مزید نقصان پہنچانے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ یاد رکھیے، شراب کا ایک قطرہ موت کی جانب آپ کا ایک اور قدم بڑھا دے گا۔“ ڈاکٹر ممتاز جیسی نے نہایت غمخوارہ آنکھوں کے ساتھ گلی پٹنی کے بغیر شہاب کے سامنے حقیقت رکھ دی۔

شہاب غوری کے کاسے اظہار میں رکھائی کیا تھا کہ وہ جواب دیتا۔ بس وہ دھلائی ہوئی نظروں سے بے بسی کی تصویر بنا جسٹ کی جانب دیکھتا رہا اور باقی ماندہ زندگی پھل پھل کر اس کی آنکھوں سے رتی رہی۔

دونوں ڈاکٹر کمرے میں موجود نرس کو ضروری ہدایات

دے کر واپس چلے گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ شہاب غوری چپ چاپ بستر سے اتر اتر اور آگے کے ساتھ دوش بستن کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وضو کر کے وہ عبدالوہاب کی لائی ہوئی جائے نماز بچھا کر اپنے معبود کے آگے سر بخود تھا۔ توبہ اور استغفار کے الفاظ بے ساختہ اس کی زبان سے جاری تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھج چکا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اپنی مدہوش خطاؤں کے لیے خدا کے حضور معافی طلب کرتا رہا۔

بیڈ کے قریب قد آدم کھڑکی کے اس پار مسجد کے میناروں سے اذان فجر کی بیدار کن آواز آرہی تھی۔ شہاب کو اس بات کی خوشی تھی کہ آج وہ برسوں بعد نماز فجر ادا کرے گا۔

☆ ☆ ☆  
شام ڈھلے سائرہ اور باب شہاب غوری کے پاس بیٹھی تھیں اور بیٹھکی آنکھوں کے ساتھ اس کی فحاش بندھاری تھیں۔

آج شہاب پہلے کی طرح مضطرب نہیں تھا۔ توبہ اور استغفار نے اس کی روح کو کسی قدر پرسکون کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جیسی کے آخری راولڈ کے کچھ دیر بعد سائرہ اور باب گھر چلی گئیں۔ کمرے میں غل غل ماسوئی تھی اور باہر راہداری میں دور تک سنا تھا۔

شہاب نے بیڈ پر کروٹ لی اور سونے کی غرض سے آنکھیں موند لیں۔ اسی اثنا میں وارڈ بوائے اٹھا اور بیلری کے اختتام پر واقع دوش روم کی طرف چل دیا۔

اجانک ایک انجینی شخص کمرے میں داخل ہوا۔ انجینی ففٹس کے قدموں کی آہٹ سے چونک کر شہاب نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ بیڈ کی طرف بڑھا تو فوراً ہی شہاب نے پہلو بدلا۔ سامنے ایک انجینی کھڑا تھا۔

شہاب نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ ”کون ہو تم؟“ کمرے میں گیسے آئے۔ وارڈ بوائے کہاں ہے۔

”وارڈ بوائے دوش روم گیا ہے۔ میں ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔“ انجینی نے دیے انداز میں سر گھولی۔

”لیکن تم کون ہو اور کیوں آئے ہو؟“ شہاب کے لہجے میں تشویش تھی۔

”آپ سے غالباً ہوا بس فون بھی لے لیا گیا ہے۔“ آپ کا اپنے دوستوں سے رابطہ نہیں ہے۔ مجھے آپ۔

دوست ملک شہریار نے بھیجا ہے۔“ انجینی نے مختل انداز میں جواب دیا۔

”ملک شہریار نے، مگر کیوں؟“ شہاب غوری کا ماتھا

لڑکا۔  
”غوری صاحب! آپ کا بہت خیال ہے آپ کے“  
”اتوں کو ملک شہریار نے آپ کے لیے واڈ کھینچی ہے۔“  
انجینی نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھٹی کی بول

الائی۔  
”کیوں بند کرو۔ دفع ہو جاؤ۔ لے جاؤ یہ زہر مجھے نہیں چاہیے۔“ شہاب پوری قوت سے دہانڑا۔

انجینی بدحواس ہو کر لے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

خفیہ کی وجہ سے شہاب کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اسی اثنا میں وارڈ بوائے کمرے میں داخل ہوا۔ وارڈ

بوائے کے چہرے پر بھلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔  
”صاحب! کون تھا؟ آپ کس کو ڈانٹ رہے تھے؟“

وارڈ بوائے نے مؤدب انداز میں پوچھا۔  
”میں تھا کوئی، چلا گیا۔ خیال رکھنا آئندہ کوئی انجینی

کمرے میں داخل نہ ہو۔“  
”ایسا ہی ہوگا صاحب۔“ وارڈ بوائے تائید میں سر ہلا کر

چلا گیا۔  
☆ ☆ ☆

دن اور رات کی گردش میں وقت پر لگا کر اتر اتر اور تین

ماہر گز رہے۔ شہاب غوری کو ایک بار پھر مختلف میڈیکل انجینازر کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ رپورٹس کسی آئی تھیں، مرض کی

مورت حال اب کیسی تھی، جگر کی خرابی پر کس حد تک قابو پایا گیا تھا، شہاب اس سے بے خبر بھی تھا اور دوسرا سوال بن کر زندگی اور

موت کی بارڈر لائن پر پڑا تھا۔  
آج سائرہ، رباب اور عبدالوہاب ایک ساتھ

آئے تھے۔  
”ابو! کل آپ کو اسپتال سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے۔“

عبدالوہاب کے لہجے میں کسی قدر اطمینان تھا۔  
شہاب نے خوشگوار حیرت سے تیزوں کی طرف دیکھا۔

”ہاں ابو! آپ کا علاج شاید مکمل ہو گیا ہے۔“ انجینی کہہ رہے تھے کہ کل آپ کو چھٹی دے دی جائے گی۔

رباب نے مسکراتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔  
اب شہاب کی نظر سائرہ سے ملی۔ دونوں نے آنکھوں میں

آنکھوں میں اسپتال اور گھر کا درمیانی فاصلہ سمیٹا۔  
”شہاب! کل سے اپنے گھر میں رہو گے تم،

ہمارے درمیان۔“ سائرہ نے شہاب کی پیشانی پر ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا۔  
اور پھر اگلے روز شہاب غوری کو اسپتال سے گھر منتقل

کر دیا گیا۔  
☆☆☆

شہاب نے اپنی مرضی سے گھر کو قبل از وقت

ریٹائرمنٹ کی درخواست دے کر طویل رخصت لے لی۔  
شہاب کے اس اقدام پر سب حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

”چلو، اب تمہارے ابو گھر میں آرام کریں گے اور ہمارے درمیان وقت گزاریں گے تو عبدالوہاب کی دکن لانے

میں مجھے آسانی ہو جائے گی۔“  
سائرہ نے رباب سے شش کر کہا تو پاس بیٹھا عبدالوہاب

سر جھکا کر ہر نکل گیا۔  
شہاب غوری اب بدل چکا تھا۔ ایک خوشگوار مثبت

تبدیلی تھی جو شہاب کی عادات و اطوار اور معمولات سے

جھجک رہی تھی۔ اس نے اپنے تمام سے لوش دوستوں سے

قطع تعلق کر لیا تھا۔  
دفتر کے دو چار بھلے مانس ساتھی تھے جو شہاب سے ملنے

گھر آ جا یا کرتے تھے۔ زبان طالب علمی میں شہاب کو مٹلا کے

شوق ہو کر کرتا تھا اس نے اپنے بیٹے عبدالوہاب سے اپنی

پند یہ تاریخی، ادبی اور دینی موضوعات کی کتا میں منکوا لیں۔  
ایک دن شہاب غوری اپنی ذاتی الماری سے چننریں

نکال کر از سر نو ترتیب دے رہا تھا کہ اس کی نظر اپنی میڈیکل

فائل پر پڑی اور... بے اختیاری طور پر اس کے ہاتھوں میں

آگئی۔ پہلے تو اس فائل کو چومتے ہی شہاب کو جھجھری سی آئی

پھر یونہی کسی خیال کے تحت اس نے فائل میں گئے کاغذات کو

دیکھنا چاہا۔  
شہاب غوری کو حیرت کا شدید جھکا لگا۔

فائل میں رنگ برنگے سادہ کاغذوں کو وہ دیر بڑی



## یتیم

### شرعباس

مغربی معاشرے میں جہاں بہت ساری برائیاں موجود ہیں وہاں کچھ ایسی انوکھی اچھائیاں بھی فعال ہیں جن کے اثرات وہاں کے باشندوں کی معمولی سی زندگی کو بھی بہت غیر معمولی بنادیتے ہیں۔ وہاں یتیموں کے لیے حکومت نے بہت اچھے قوانین بنائے ہوئے ہیں۔ انہی قوانین کے تحت وہ چاروں دھائی جو یتیم ہو چکے تھے کس طرح خوبصورت اور کارآمد زندگی کی طرف لائے گئے، اس کا احساس زیرِ نظر تحریر پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

کئی نہ چھوڑے دالے رشتوں کی تہائی آواز دھماکے



کہ ہم لڑ رہے ہیں۔ لہذا وہ دونوں کو پکڑ کر لے گئے اور جیل میں بند کر دیا۔ صبح سویرے جیلر آگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے گا لیکن اس نے کوٹھری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور گرجت آواز میں بولا۔

وہ جیل میں میرا پہلا دن تھا۔ گزشتہ شب میں نے نئے میں چور ایک راہ گیر کو لوٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے اس مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ ہم آپس میں دوست دکر یہاں تھے کہ گشت پر مامور پولیس والے آگئے۔ وہ سبھے

بتایا گیا تھا اور پھر میں تین ماہ داخل رہا ہوں اسپتال میں.....  
شہاب کے لہجے میں بھرپور الجھن کا تاثر تھا۔  
”بس یہیں سے جتنی اور عبدالوہاب کا منصوبہ شروع ہوتا ہے۔“

رہا بے لاد بھرے انداز میں باپ کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر عبدالوہاب نے نہایت سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

”ابو جی! یہ ہم لوگوں کا بڑا المیہ ہے کہ ہم خدا کے خوف سے برائی کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے لیکن اگر ہمیں موت سامنے دکھائی دینے لگے تو پھر ہم..... موت کے ڈر سے برائی کو

چھوڑنے کی ہمت کر لیتے ہیں اور برائی چھوڑنے پر بہر صورت تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ نشہ آور تمام چیزیں حرام ہیں اس کے باوجود ہم ان چیزوں سے چمکا کر

حاصل کرنا بہت مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن تصور کرتے ہیں لیکن اگر ڈاکٹر ہمیں یہ بتا کر خوف زدہ کر دے کہ فلاں چیز کے استعمال سے ہمارے جسم کا ایک اہم حصہ کارہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ہم موت کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ہم..... جس چیز کے حد درجہ عادی ہو چکے ہیں اسے چھوڑنے کی پوری کوشش کریں گے اور پھر کامیاب ہو جائیں گے۔ کاش! خطرہ مرگ

سے زیادہ ہم لوگ خوف خدا کو اہمیت دیتے۔“  
آخری جملے پر عبدالوہاب کی آواز جذبات کی شدت سے بھرا گئی۔ اس دوران بے اختیاری طور پر شہاب غوری کی نظریں اپنی تصاویر میں پھلتی رہیں۔

”ماموں جان! ہم نے نیک نیکی کے ساتھ آپ کو اسپتال میں داخل کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ جگر کی خرابی اور میڈیکل رپورٹس کی تشویش پھیلانا ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔ اسی لیے آپ کو خصوصی نگرانی میں رکھا گیا اور آپ کے کمرے میں خفیہ نگہبرے نصب کیے گئے تاکہ..... آئی ایم

سوری ماموں جان! ہم آپ کی بدلتی ہوئی کیفیات کا پورا مشاہدہ کرتے رہے ہیں اور ہاں آپ کی آزمائش کے لیے اس اجنبی کا کردار بھی فرضی تھا۔“

ڈاکٹر جتنی سے منصوبے کی باقی جزئیات بھی بیان کر ڈالیں۔

شہاب غوری کی نظریں مسلسل اپنی تصاویر میں جھک رہی تھیں اور پھر ایک تصویر پر شہاب کی نظر کچھ دیر تک جمی رہی۔ تصویر میں شہاب پورے انہماک کے ساتھ اپنے معبود کے حضور دعائیں مصروف تھا۔

”جب اس رات آپ کے دوست آپ کو مدہوشی کی حالت میں گھر چھوڑ کر گئے تھے تو آپ کو خون کی آہنی ہوئی تھی۔ عبدالوہاب نے فوری طور پر پہنچی..... کو بلا لیا اور یہ دونوں آپ کو اسپتال لے گئے۔ وہاں آپ کو ابتدائی طبی امداد دے کر فارغ کر دیا گیا کیونکہ کوئی ایسی فکر مندی کی بات نہیں تھی۔“

”فکر مندی کی بات نہیں تھی؟ لیکن مجھے تو جگر کا عارضہ

کے عالم میں اپنے بال نوچتے ہوئے اور پھر جائے نماز پر سجدہ ریز ہوتے ہوئے۔

اچانک ایک اور تصویر پر نظر پڑی۔ یہ وہی اجنبی شخص تھا جو اچانک ایک رات کمرے میں آگیا تھا۔

ایک تصویر میں وہ اپنی واڈا کی بوتل کوٹ کی اندرونی جیب سے نکال رہا ہے۔ دوسری تصویر شہاب کی جگہ جس میں شہاب کے چہرے پر شدید غصہ نمایاں تھا۔

شہاب کا دماغ پکڑا گیا۔  
”یہ سب آخر کیا ہے؟“

☆ ☆ ☆  
”یہ سب آخر کیا ہے؟“  
شام کو لادائج میں بیٹھے ہوئے شہاب نے سب کے سامنے قائل لہراتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”یہ لو عبدالوہاب، ڈاکٹر جتنی، یہ کیا ہے؟“  
سوال سن کر پہلے تو سب نے ہم کر شہاب کے چہرے سے نظریں چرا لیں پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

شہاب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔  
”میں پاگل ہوا ہوں یا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟“

شہاب غوری نے غصے سے تھماتے ہوئے پوچھا۔  
”ابو! خدا! خواست آپ پاگل نہیں ہوئے۔ بس کچھ ہم نے اپنا دماغ چلا یا تھا، مطلب ہے دماغ ٹھیک تھا۔“

عبدالوہاب نے سادگی سے جواب دیا اور پھر سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں کچھ نہیں سمجھا۔“  
شہاب کی آواز میں بے جتنی اور بے بسی تھی۔

”ماموں جان! آئی ایم سوری، دراصل یہ میرا اور عبدالوہاب کا مشترکہ منصوبہ تھا۔“

”منصوبہ! کیا منصوبہ؟“  
شہاب کی حیرت اب دو چند ہو گئی۔

”ہم قتل قصہ میں جتانی ہوں۔“ سارہ نے پرسکون لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

”جب اس رات آپ کے دوست آپ کو مدہوشی کی حالت میں گھر چھوڑ کر گئے تھے تو آپ کو خون کی آہنی ہوئی تھی۔ عبدالوہاب نے فوری طور پر پہنچی..... کو بلا لیا اور یہ دونوں آپ کو اسپتال لے گئے۔ وہاں آپ کو ابتدائی طبی امداد دے کر فارغ کر دیا گیا کیونکہ کوئی ایسی فکر مندی کی بات نہیں تھی۔“

”فکر مندی کی بات نہیں تھی؟ لیکن مجھے تو جگر کا عارضہ



”میں اس کی بات کر رہا ہوں جس نے مجھے گود لیا تھا۔“  
 ”چرچڑا سا کسر اور تم نام اس کسر ہو۔“  
 ”ہاں۔ میں اور میری بیوی ڈورنگی اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ لگتا تھا کہ خدا کی مرضی نہیں ہے۔“  
 ”کیا تم نے بھی کوئی ایتم چرچڑا کو لینے کے بارے میں سوچا؟“  
 میں نے یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی لیکن وہ سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”ہاں۔ میں نے اس بارے میں سوچا تھا لیکن ڈورنگی نے کوئی وجہ نہیں لی۔ اسے یقین تھا کہ خدا ہماری ضرورت سے گوارا دینا پسند نہیں کرتا۔“  
 وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جب میرا بیٹا پیدا ہوا اور میں نے اسے پہلی بار گود میں لیا، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ خدا ان کی تسبیح و تحمید میں ہے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی تلاش کرنا چاہیے۔“  
 میں نے کافی غم کرتے ہوئے کہا۔ ”نام! میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کاش تمہارا بیٹا کئی سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا۔“  
 مجھے یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ نام شہر کے بہترین ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور میرے لیے اس سے بھی زیادہ سٹارٹنگن بات یہ تھی کہ کلرک نے مجھے دیکھ کر تاک نہیں چڑھائی۔ یقیناً اس ہوٹل میں بھی کوئی ایسا گاہک نہیں آیا ہوگا جس نے گزشتہ رات ٹیبل میں گزاری ہو اور اس سے پہلے سونے کے لیے ٹھکانا ڈھونڈنا پڑتا تھا۔  
 وہ کلرک صرف اتنا جانتا تھا کہ میں یعنی مسٹر فیملی، مسٹر اسپاسر کا دوست ہوں۔ اس نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں تمہارے برابر والا کمراد سے ملتا ہوں۔“  
 ”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ کیا تم مسٹر فیملی کے کپڑوں کی فوری دھلائی کا بندوبست کر سکتے ہو، جب یہ غسل کے لیے جائیں۔ ان کا سامان آنے میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔“  
 میزبیاں چڑھتے ہوئے مجھے پکارا رہے تھے۔ چند منٹ پہلے میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وقت پر ٹیبل سے باہر آ جاؤں تاکہ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ پیسے چراسوں اور اب میں مارشل کی میزبیاں چڑھ رہا تھا۔ واقعی آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ میں کس دنیا میں آ گیا تھا؟  
 میں نے اپنے بھائی سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم نماز کو تازہ دم ہو جاؤ۔ یہ اب تمہیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“  
 میں نے ایسا ہوٹل پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ

ب دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ لگ رہا تھا کہ میں پر یوں کے دیں میں آ گیا ہوں۔ میں نے اپنے کپڑے بیدروم کے فرش پر ڈالے اور ہاتھ روم کا کھول دیا۔  
 ابھی تک میرا سر ہلکا رہا تھا۔ بچپن میں ہمیشہ بھائی میرے دماغ میں رہتے تھے۔ میں نے انہیں ایک عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے مجھے امید نہیں تھی کہ ان سے دوبارہ مل سکوں گا۔ نام اب امیر آدمی بن گیا تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے بھائی نے بھی کسی امیر لڑکی سے شادی کر لی ہو۔ ایک میں میرا رہ گیا جس کا نہ کوئی ٹھکانا تھا اور نہ کوئی مستقبل۔  
 دروازے پر دستک ہوئی تو میں بھی اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ ”ایک منٹ.....“ میں نے کہا اور اپنے جسم کے گرد تو لیا لپیٹ کر دروازہ توڑا سا کھول دیا۔ سامنے نام کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوٹل والوں نے تمہارے لیے کچھ کپڑے بھیجے ہیں۔ جب تمہارے کپڑے دھل کر آ جائیں تو یہ واپس کر دینا۔ ہم بعد میں تمہارے لیے نئے کپڑے خریدیں گے۔“  
 مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“  
 میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں کیا ہوں گا اور یہ کہ وہ جو کچھ میرے لیے چن کر لے کر آیا ہے وہ میں قبول کر لوں گا۔ میں اس کا پتھر اٹھا لیٹا تھا یا اتنا دار ملازم؟  
 ”میں شروب کی بوتل بھی لا یا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”گنڈا امیر سے لیے ایک گلاس بناؤ۔“ یہ کہہ کر میں نے وہ کپڑے پہن لیے جو میرے لیے ہوٹل کے کسی ملازم سے ادھار لیے گئے تھے۔ بہر حال وہ صاف ستھرے کپڑے تھے اور میرے جسم پر فٹ آ گئے۔  
 اس کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز بھی تھی۔ اس نے بوس اور گلاس میز پر رکھے اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو میں نے کہا۔ ”اب بتاؤ۔ تم فیملی سے اسپاسر کیسے بن گئے؟“  
 اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں وہ آدمی یاد ہے جو مجھے ٹرین سے اپنے ساتھ لے گیا تھا؟“  
 مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ ٹرین اپنے پہلے اسٹاپ پر رکی۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تمام بچے جن میں زیادہ تر لڑکے تھے اور ان کی عمریں دو سے سترہ سال کے درمیان تھیں، پلیٹ فارم پر قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ گا کہ جن میں زیادہ تر کسان اور ان کی بیویاں تھیں، پلیٹ فارم کی دوسری طرف کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے گرد آلود

اور کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک آدمی نے ان کے سامنے تقریر کی اور انہوں نے ہمارا ساتھ شروع کر دیا جیسے فروخت کے لیے لائے گئے کوٹھڑوں کا کیا جاتا ہے۔  
 جی نے رونا شروع کر دیا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے دیکھا کہ نام سیاہ سوٹ میں ملیوں کی آدمی سے باتیں کر رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس شخص نے قہقہہ لگایا اور نام کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا پھر وہ دونوں وہاں سے چل دیے۔ میں نے جی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پیچھے جانا چاہا لیکن ٹرین کے ایک آدمی نے ہمارا راستہ روک لیا اور بولا۔ ”اپنی باری کا انتظار کرو۔“  
 ”وہ نام کو کہاں لے جا رہے ہیں؟“ جی نے پوچھا۔  
 ”اس کے سنے کمر۔“  
 ”کیا ہم بھی اپنے سنے کمر جائیں گے؟“

☆☆☆

”چرچڑا سا کسر و مگن میگر تھا۔“ نام نے مجھے بتایا۔  
 ”اس کے علاوہ ڈان کونسل کارکن بھی تھا اور ہاں صرف ان کی نمائندگی کرنے آیا تھا۔ وہ لڑکے کو ساتھ لے جانے نہیں آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے دیکھ کر اس کا راز بدل گیا۔“  
 ”کیا اس کے اپنے بچے بھی تھے؟“  
 ”نہیں۔ اس کی بیوی جا رہی تھی۔ اس کے یہاں ایک یادو مرد بچے پیدا ہوئے تھے، بہر حال وہ مجھے پا کر بہت خوش ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔“  
 ”اور اسپاسر بھی خوش ہوگا۔“ میں نے کہا۔

نام نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ میں وہیں رہ کر بڑا ہوا۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تو اس کی بیوی انتقال کر گئی اور چار سال پہلے چرچڑا بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔“

”اور دراخت میں تمہیں اس کا کاروبار مل گیا؟“  
 اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، انہوں نے مجھے گود لے لیا تھا۔ اس کے بعد سے ہم صرف بھگیاں ہی نہیں بلکہ ٹورڈ کی گاڑیاں بھی بیچ رہے ہیں۔“  
 ”لگتا ہے کہ تم نے اپنے لیے بہت کچھ کر لیا ہے۔“  
 وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔ تم سناؤ تم پر کیا گزری؟“  
 ”جب تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“ میں کہتے کہتے رک گیا کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوئی اس کے بھائے میں نے کہا۔ ”اس کے بعد ٹرین تین یا چار بج کر کی لیکن کسی نے مجھے یا جی کو نہیں لیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یونہی سفر

کرتے ہوئے کئی نور نیا تک پہنچ گئے اور ہمیں کسی نے نہیں لیا تو کیا وہ ہمیں واپس بھیج دیں گے یا سمندر میں چھینک دیا جائے گا؟“  
 نام نے سر ہلادیا۔

”اب آخر ہم کیسا کس کے قصبہ وان سم پہنچ گئے۔ وہ ہمیں لے کر ایک ادیرا ہاؤس میں گئے اور قذ کے لحاظ سے ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ اس طرح میں اور بھی جدا ہو گئے۔“  
 میں نے شروب کا کھونٹ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”کسان ایک ایک کر کے آتے گئے اور ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس گروپ میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ خوب صورت بچے تلاش کر رہی تھیں جبکہ مرد بڑے لڑکوں کو دیکھ رہے تھے۔“  
 ”تاکہ وہ کھیتوں میں ان کے ساتھ کام کر سکیں۔“

نام بولا۔

”ان میں ایک چھوٹے قد کا بڑی مونچھوں والا شخص تھا جو قطار کے درمیان میں کھڑے ہوئے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے داہیں ہاتھ میں ریشہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ شخص بیمار تو نہیں۔ اس کا نام نارمن منٹر تھا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ چند کاغذات پر دستخط کیے اور اپنے ساتھ لے کر چل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں چھڑے میں اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک میل جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ فارم کتنی دور ہے۔ وہ میری طرف مڑا اور اتنی زور سے میرے منہ پر ہتھ مارا کہ میں گاڑی سے گرتے گرتے چلا۔“  
 ”اوہ میرے خدا!“ نام بڑبڑایا۔

”اس نے کہا۔۔۔۔۔ جب تک تم سے بولنے کے لیے کہا نہ جائے، تم خاموش رہو گے اور ہمیشہ مجھے مسٹر منٹر کہہ کر مخاطب کرو۔“

”اوہ پیٹ۔۔۔۔۔“

”مزرے کی بات یہ تھی کہ جب اس نے مجھے چھڑا مارا تو اس کے ہاتھ کی لڑش رک گئی۔ تب میں سمجھا کہ وہ کیوں ایسے لڑکے تلاش کر رہا تھا جو قد میں اس سے چھوٹے ہوں۔“  
 ”پیٹ! مجھے افسوس ہے۔“  
 ”تمہیں کیسے معلوم ہوتا نام کیونکہ تم تو اسپاسر کے ساتھ سو رہے تھے۔“  
 ”اس کی بیوی کیسی تھی؟“  
 ”وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں لمبی اور بھاری جسم کی تھی لیکن وہ دوسروں کے کام آتی تھی۔ اس نے میرے



ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔

”ایجنٹوں کے بارے میں کیا کہو گے؟“

میں تیزی سے چڑھتا ہوں بولا۔ ”کون سے ایجنٹ؟“

”میںم خانے والے سے دیکھنے کے لیے اپنے ایجنٹ

بجھے ہیں کہ لے پالک بچوں کی کسی پرورش ہو رہی ہے۔“

”اچھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہیں ایجنٹ کہتے ہیں۔

میرے وہاں بیچنے کے چند ماہ بعد ایک آدمی آیا تھا۔ میں

کھلیان کے باہر مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا، جب وہ ایجنٹ

آیا۔ مسٹر بلر اپرن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئی اور بولی۔

پیٹ! کوئی تم سے ملے آیا ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ

سے ملے کون آ سکتا ہے؟“

”جلدی کرو اور باتوں میں وقت ضائع نہ کرتا۔“

ایجنٹ اور مسٹر بلر مہمان خانے میں بیٹھے ہوئے

تھے۔ میں دروازے پر ہی رک گیا کیونکہ صرف ایک دفعہ

میں نے وہاں قدم رکھا تھا تو مسٹر بلر نے مجھے چھڑ مار دیا

تھا اور کہا تھا کہ یہ صرف مہمانوں کے لیے ہے۔

”اندرا آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”یہ مسٹر بلر کی ہیں اور

دیکھنے آئے ہیں کہ تم یہاں کس طرح رہ رہے ہو۔“

مسٹر بلر نے قہقارہ بولنا شروع کیا تھا۔ اس نے آنکھوں

پر مونے پیشوں کا چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔ کندھے جھکے ہوئے

اور ہونٹوں پر گرم جوش مسکراہٹ تھی۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی پیٹ۔“ یہ کہہ کر اس نے

مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”سیپ کھاؤ گے؟“ مسٹر بلر نے پوچھا۔

مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہاں ایسی جرأت

نا قابل معافی جرم تھا لیکن میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، ورنہ

مہمان کے سامنے مسٹر بلر کی بے عزتی ہو جاتی۔ اس لیے میں

نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”مسٹر بلر تم سے کچھ سوالات کریں گے کہ تم یہاں

کس طرح رہ رہے ہو۔“

”بیٹھ جاؤ پیٹ۔“ مسٹر بلر نے صوفے پر ہاتھ

مارتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے منہ بولے باپ کی طرف دیکھا۔ اس

نے سر ہلا دیا۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم جتنی دیر

چاہو، باتیں کر سکتے ہو۔“

”یہ لوگ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟“

مسٹر بلر کیسی نے پوچھا۔

میں نے اسے بتا دیا کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی سی

باتوں پر مجھے مارا جاتا ہے اور اگر مسٹر بلر کی بات نہ سنوں تو

میرا کھانا بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر مسٹر بلر کیسی کا چہرہ مزید

سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا۔ جب

میں نے اپنی بات ختم کی تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں بہت عرصے سے کسی کو اپنا دلخیزا سنا چاہ رہا تھا اور بالآخر

مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔

ایجنٹ نے اپنا چشمہ ناک پر رکھا اور بولا۔ ”یہ تو

میری سوچ سے بھی زیادہ بری صورت حال ہے۔“

اس کے پاس ایک پراٹا چڑے کا بست تھا۔ اس نے

اس میں سے تین خط نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے اور

بولا۔ ”انہیں پڑھو۔“

میں نے ان میں سے پہلا خط نکالا جو منظر نے باوری

فاؤنڈنگ ہوم کو لکھا تھا۔ اس نے میرے بارے میں کہا کہ

میں ایک نافرمان اور جھوٹا لڑکا ہوں لیکن اس کے باوجود انہوں

نے منظر کی شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے ایک اور موقع

دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے وہ خط ایک طرف رکھ دیا۔

”دوسرے خط بھی پڑھو۔“ مسٹر بلر کیسی نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”بھئی میں یہ خط پڑھنے چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ

تم نے اپنے والدین کو کتنا پریشان کر رکھا ہے اور اب تم

میرے سامنے جیسے کہ مزید جھوٹ بول رہے ہو۔ جیہیں

انداز ہی نہیں ہے کہ تم کتنے خوش قسمت ہو۔ اگر میں تمہارا

باپ ہوتا تو تمہارا دامغ خمیک کر دیتا۔“

”میرا باپ مر چکا ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

..... ”اس کے بعد میں نے دوبارہ ایسی کوشش نہیں کی۔“

میں نے کہا۔ ”کیونکہ کوئی بھی میری بات پر یقین کرنے کے

لیے تیار نہیں تھا۔ لہذا اس دن کے بعد جب بھی کسی مسٹر بلر کیسی

یا اس کی جگہ کوئی دوسرا ایجنٹ آیا تو میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ

سب خمیک ہے۔ اس طرح میں مزید پٹائی سے بچ گیا۔“

”اوہ پیٹ.....“ ٹام بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

تھے۔ ”مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔“

”جیہیں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔“ میں نے کہا اور دل میں

سوچا کہ تم تو اپنی فی شاخت بنانے اور اپنے منہ بولے باپ

کی دولت میں اضافہ کرنے میں مدد کر رہے تھے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم کمر

چار رہے ہو؟“

ٹام نے مشروب کی بوتل کی طرف دیکھا اور اسے

ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی نہیں۔ میں سوچ رہا تھا

کہ ہم دونوں مل کر ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہیں۔“

میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید ہم دونوں مل کر

کاروبار کریں گے۔ کیا میں مسوری کے ایک چھوٹے سے

قبیلے میں رہ سکوں گا جس کا مطلب ہے کہ مجھے کوئی مستقل

کام کرنا پڑے گا۔ کیا میں واقعی ایسا کام کرنا چاہتا ہوں؟

اس نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکاتے ہوئے

بولا۔ ”میں امید کر رہا تھا کہ تم ایک آدمی کو قتل کرنے میں

میری مدد کرو گے۔“

میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور میں نے کہا۔ ”کیا تم

اسی لیے مجھے قتل سے نکال کر لائے تھے؟ تمہارا کوئی

کاروباری حریف ہے اور تم نے سوچا کہ تمہارا آوارہ اور

شرابی بھائی تمہارے لیے اسے قتل کر سکتا ہے۔“

”پیٹ.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”میں جس آدمی کی بات کر رہا ہوں..... اس نے جی

کو مار ڈالا۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو مار دیا۔“

میں نے ٹام کا کھوت لیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے

بات پہلے کہیں کہی تھی؟“

”جی بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ اس نے کبھی غصہ نہیں دکھایا

اور نہ ہی کسی سے ناراض ہوا۔ میں نے فاؤنڈنگ ہوم میں

دو نگہبانوں کو اس کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ وہ

اس لیے پریشان تھے کہ اسے قیدیوں کی ٹرین پر بھیجا جا رہا

تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹا تھا لیکن وہ اس سے پہلے بھی چار سال

کی عمر کے بچوں کو بیچ چکے تھے۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اسے

کوئی قبول نہیں کرے گا کیونکہ اس کی بیٹائی کمزور تھی۔“

کسانوں نے سب سے مضبوط لڑکوں اور سب سے

خوب صورت چھوٹے بچوں کو منتخب کیا اس لیے مجھے ٹام کی

زبانی یہ سن کر کوئی حیرانی نہیں ہوئی کہ اسے راستے میں آنے

والے قیدیوں میں سے کسی نے منتخب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ٹرین

اپنے آخری اسٹاپ ریڈ کلف پر پہنچ گئی۔

”مجھے میرے سرانجام رسالوں نے بتایا کہ وہ ایک

سال سے بھی کم عمر مرد ہاں رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔“

”ایجنٹ اسے اس لیے لے گیا ہوگا کہ وہ لوگ جی کو

مارتے تھے۔“ میں نے قیاس آرائی کی۔

”نہیں، اس کی بیوی حاملہ ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں

نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی دوسرے کے بچے کو پالنے کی

ضرورت نہیں۔“

”اوہ میرے خدا۔“ میں بڑبڑایا۔ ”پھر بعد میں اس

کے ساتھ کیا ہوا؟“

”اسے ایک جوڑا اپنے ساتھ لے گیا۔ ان کا فارم

ریڈ کلف سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ان کی پہلے سے

ایک بیٹی تھی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں گھیت پر کام کرنے کے

لیے ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔“

”نہا جی کیسے مل چلا سکتا تھا؟ وہ تو بڑا ہونے کے

بعد بھی اس کام کے لیے بہت چھوٹا تھا۔“

ٹام کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف یہ

معلوم ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور پھر بارہ سال

کی عمر میں اس کی موت واقع ہو گئی۔“

”تم اس کے مرنے کی وجہ جانتے ہو؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہوں نے ڈبچہ

سریفیکٹ میں کیا لکھوا یا لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ بہت

زیادہ مشقت اور بہت کم خوراک کی وجہ سے اس کی موت

واقع ہوئی۔“

”وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اسی فارم پر رہے جبکہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔

ہم ٹرین کے ذریعے دو دن میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

”تم نے اپنے سرانجام رسالوں کے بارے میں سوچا ہے؟“

”کیا؟“

”اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہوم مارا گیا تو وہ تم پر اس

کا الزام عائد کر دیں گے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“

اگلے روز اس نے میرے لیے کپڑوں کی خریداری

کی پھر ہم نے گھیس اور گولیاں خریدیں۔ ایک دن بعد ہم

ٹرین میں سوار ہوئے۔ سفر کے دوران زیادہ تر میں منظر کے

بارے میں سوچتا رہا۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تو برف

باری کے دوران کھلیان سے لاتے ہوئے میں نے آدمی

بائیں دودھ گرا دیا تھا۔ مسٹر بلر نے مجھ پر وہ دودھ پینے کا

الزام لگا دیا اور غصے میں آکر مجھے زوردار چھڑ مارنے کے

لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس

کی کلائی پکڑ لی۔ ہم ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہے

اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ میں قد میں

اس سے زیادہ اور قدرے طاقتور ہوں۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب بھی مجھے دیکھ رہا

تھا۔ ”اسکول جاؤ۔“ یا آخر اس نے کہا۔ ”دیر ہو رہی ہے،



جلدی کرو۔"

مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے اس نے کبھی دیر ہونے کی پروا کی ہو یا کبھی پوچھا ہو کہ میں اسکول کیا تھا یا نہیں۔

جب میں چھٹی کے بعد اسکول سے باہر آیا تو شریف ایک سوٹ کپڑے لیے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہارے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اسے دھکا دیا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ بیکار چیزیں کبھی فائدہ مند نہیں ہوتیں۔"

"شریف! کیا میں ذرا جرات ہوں؟"

"تمہارا باپ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے تمہارے لیے خرین کا ٹکٹ بھی خریدا ہے۔ میں تمہارا سوٹ کیس لے کر آیا ہوں۔ اب یہاں بھی مت آنا۔ ورنہ میں تمہیں تھل میں ڈال دوں گا۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے سڑک پر سوٹ کیس کھول لیا۔ سب بچے یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

"میرے پیسے کہاں ہیں؟ اس ڈیکٹ میں چودہ ڈالر تھے۔" "جھوٹ مت بولو فیملی۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

☆☆☆

"اوہ پیٹ! نام نے ایک بار پھر کہا۔" واقعی مجھے بہت افسوس ہے۔"

"جی پوچھو میں بیکار کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔"

"وہ کیوں؟"

"اگر میں وہاں رہتا تو ایک دن اسے ضرور قتل کر دیتا پھر مجھے ضرور پھانسی ہو جاتی۔ یوں سمجھو کہ میری جان بچ گئی۔ کچھ عرصہ کل مجھے معلوم ہوا کہ ان کے مکان میں آگ لگ گئی اور وہ دونوں اس میں قتل ہو گئے۔ اگر میں وہاں رہ رہا ہوتا تو میں بھی اسی آگ میں جل کر اڑھ بوجا ہوتا۔"

میرا اسکا پہنچ کر ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دوسرے دن فارم کی تلاش میں نکل پڑے۔ بڑی مشکل سے اس کا پتا ملا۔ وہ تنگہ بالکل ویران تھی۔ میں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ آج کل اس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"شاید۔"

"وہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"صرف ہومر۔۔۔۔۔ اس کی بیوی مرچکی ہے اور بیٹی کہیں چلی گئی۔"

ہم نے بھی روکی اور گھوڑوں کو ایک جگہ باندھ دیا۔ اس کے بعد ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ دالان میں کھڑے

ہو کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ دروازہ کھڑکی کا تھا اور اس کا رنگ اڑھ تھا۔ نام نے میری طرف دیکھا اور دروازے پر ہلکی سی دھک دی۔

"کون ہے اندر آ جاؤ۔"

پورا گھر ہوٹل کے ایک بڑے کمرے کے برابر تھا۔ اس میں سادہ اور پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ ایک میز، تین کرسیاں، ایک صندوق، کھانے پکانے کے برتن ایک دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے سائے دانی دیوار کے ساتھ ایک سرخ رنگ کا صوف پڑا ہوا تھا اور اس صوف پر ایک بوڑھا آدمی ٹاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔

"کیا تم ہی ہومر کا رت ہو؟" نام نے پوچھا۔

"ہاں لیکن تم کون ہو؟"

نام اچانک اتنی تیزی سے آگے بڑھا جیسے ابھی پستول نکال کر اس کا خاتمہ کر دے گا لیکن اس نے ٹاف سے پیچھے گھٹ کر فرش پر پیچید کر دیا اور بولا۔ "میں صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کہیں تم نے ٹاف کے نیچے کوئی ہتھیار تو نہیں چھپا رکھا ہے کیونکہ تم جیسے آدمی کڑواہی کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔"

اس بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں اور وہ بولا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔"

تم نے بتایا نہیں کہ کون ہو؟" "دوسرے کمرے میں دیکھو۔" نام نے مجھ سے کہا۔

وہاں دو کمرے اور بھی تھے۔ ایک کمرے میں ڈبل بیڈ اور ڈریسنگ روم دوسرے کمرے میں سنگل بیڈ اور میز رکھی ہوئی تھی۔

"یہاں کوئی نہیں ہے۔" میں نے نام کو بتایا۔

"ٹھیک ہے۔" اس کی نظریں بدستور ہومر پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم جانا چاہتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ تو سنو، ہم تمہارے بیٹے اور جلا ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم تک پہنچنے میں آتی دیر لگی۔"

ہومر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کس جرم کی سزا دینے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تم فیملی پر اوردہ ہیں۔ جنہیں کچھ یاد آیا؟" اسے مجھے میں کچھ دیر لگی پھر اس کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں۔ "تم جی کے بھائی ہو؟"

"ہاں۔" نام نے کہا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ ہمیں کہاں لے گا؟"

"وہ چرچ کے قبرستان میں ہے۔ اسے اپنی ماں کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔"

نام نے اس کے منہ پر قبضہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ماں کا نیو یارک میں انتقال ہوا تھا۔ تم کس ماں کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ عورت جو تمہاری بیوی تھی؟ کیا تم نے اسے بھی جی کی طرح زد و کوب کر کے مار ڈالا یا وہ تمہارا ظلم برداشت نہ کر سکی اور اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" بوڑھے نے کہا۔ "میں نے کبھی جی یا اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں ان دونوں سے بہت محبت کرتا تھا۔"

"میرا نام تمہارا باپ بھی کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھے چڑے کی سیلٹ سے مارتا اور لوگوں سے یہی کہتا کہ اس نے کبھی مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"کیا تم مجھے مار ڈالو گے؟" ہومر نے کہا۔

"ہاں، یہ تمہارے لیے کم سے کم سزا ہوگی۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ پڑی عورت میرے لیے کھانا لے کر آئے والی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ جنہیں یہاں دیکھے۔"

"تم اس لیے پریشان ہو رہے ہو کہ میں تم پر کڑے نہ جاؤں؟" نام نے کہا۔

"نہیں، مجھے پریشانی یہ ہے کہ کہیں تم اسے بھی نہ مار دو۔ میرے جرم کی سزا اسے نہیں ملنی چاہیے۔"

"اچھا ہوا کہ کون ہو؟" اسے جرائم کا اعتراف کر لیا۔ "نام بولا۔ "بہتر ہوگا کہ تم ان کی تفصیل بھی بتا دو۔"

میں نے کہا۔ "نام! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ابھی نہیں پیٹ۔" نام بولا۔ "میں جانتا چاہتا ہوں کہ اس نے جی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"تمہارے پاس گن ہے۔" ہومر بولا۔ "مجھے گولی مار دو۔"

"اگر تم اپنی پڑوسن کو بچانا چاہتے ہو تو اپنے جرائم کا اعتراف کر لو۔" نام نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ہومر بولا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے بھائی سے بہت زیادہ کام لیا۔ اسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیا لیکن میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔"

"لیکن تم اسے مار رہے تھے؟"

"مارتا تھا؟" وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں تاکہ وہ سیدھے راستے پر چلے۔ بالکل بھی نہیں کہتی ہے۔"

نام نے گن اس کی ٹھوڑی پر رکھی اور بولا۔ "جب وہ بیمار ہو گیا اور کام کرنے کے قابل نہ رہا تب بھی تم نے اسے

مارا۔ اس طرح اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے اسے۔۔۔۔۔" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی آواز بھرائی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پاپا! ایک زنانہ آواز آئی۔ وہ ایک لمبے قد کی عورت تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہومر نے چلاتے ہوئے کہا۔

"میری! یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔۔۔ بھاگو۔"

میں نے اس عورت کا بازو پکڑ لیا لیکن اس نے چمڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولی۔ "تم کون ہو اور تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ایک بیمار آدمی کو تنگ کرو۔"

"ہم جی کے بھائی ہیں۔" نام بولا۔ "کیا تم نے اسے کبھی یاد کیا؟"

"بالکل۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ تم میں نام کون ہے اور پیٹ کون؟"

"جنہیں ہمارے نام کیسے معلوم ہوئے؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"تم ہی ہر وقت تمہاری باتیں کرتا تھا۔ وہ جنہیں کبھی نہیں بھولا تھا۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں یاد کرتا ہوگا۔" نام بولا۔ "اور دعا کریں مانگا ہوگا کہ ہم یہاں آکر اسے بچا لیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میری بولی۔ "وہ یہاں خوش تھا۔ ہم سب اس سے محبت کرتے تھے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" نام نے کہا اور اس کی طرف گن تان لی۔

"اسے جانے دو۔" ہومر بولا۔ "یہ معاملہ میرے اور تمہارے درمیان ہے۔"

میں نے نام کا گن والا ہاتھ نیچے کیا اور اس عورت سے پوچھا۔ "جی کی موت کیسے ہوئی تھی؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اسے بخار ہو گیا تھا اور میری ماں اس کی چار داری کرتے کرتے خود چار ہو گئی۔"

"تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو۔" نام نے کہا۔ "کسی نے بھی اس کا خیال نہیں کیا۔"

"تم میرے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" میری بولی۔ "وہ بہت مہربان اور محبت کرنے والے تھے۔"

میں نے کہا۔ "ممکن ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے ہوں کیونکہ تم ان کی حقیقی بیٹی ہو لیکن ایک نیم بچے سے نہیں



بنی اسرائیل کے درمیان ایک شخص ”سامری“ بھی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معتقد ہو کر بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل آیا تھا۔ وہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن ”سامری“ ہونے کے ناتے اس کے دل میں بتوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گائے بیل اور چھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصر میں بھی۔ سامری اس کا نام نہیں تھا بلکہ سمیری ہونے کی وجہ سے سامری کہا گیا۔

## حضرت موسیٰ علیہ السلام

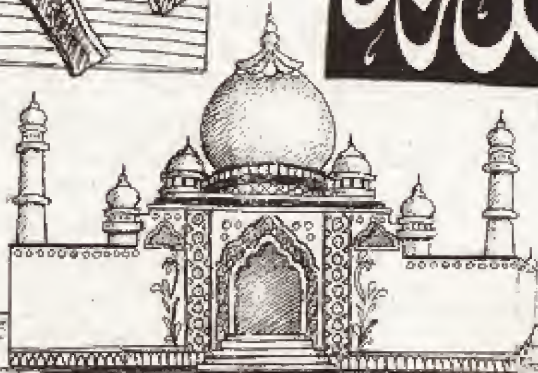
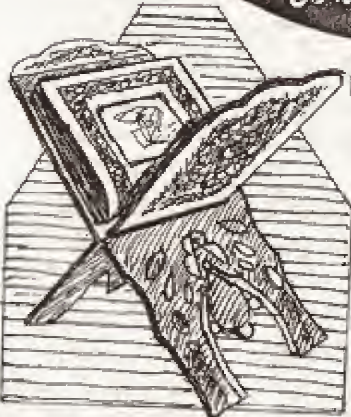
رضوانت ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔۔۔ یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا۔۔۔ ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے۔۔۔ حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارہ دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نو مولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ نہ دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نو مولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے۔۔۔ جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و بدبشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا۔۔۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر مسرونی سازشیں اور

پیغمبر کے معجزات کا احوال

آٹھواں حصہ



میں دیا تو یہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ اس لیے میں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے حالانکہ بعد میں جب میں اسے انہی طرح جان گیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ہم تینوں کو اپنے ساتھ لے جاتا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس پر یہی غاہر کیا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی بیوی سے بھی جھوٹ بولا۔

میں اور میری اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی اور اس نے پستول کی نال انہی تک اپنی بیٹی سے لگا رکھی تھی۔

میں نے کہا۔ ”نام! اگر تم مر گئے تو تمہارے بیٹے کا کیا ہوگا؟“

”سمیری بیوی اسے سنبھال لے گی۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں جو اس کے کام آئے گا۔“

”اگر اس کے ساتھ بھی کچھ ہو گیا۔“ میری بیوی۔ ”کوئی بیماری یا حادثہ۔۔۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بیٹا پیٹیم ہو جائے اور اسے ہمیں قیدیوں کی ٹرین میں سوار ہونا پڑے اور وہ اپنی بقیہ زندگی کسی ظالم شخص کی غلامی میں گزار دے؟“

میرے بھائی کا ہاتھ کاٹنے لگا۔ پستول اس کا ہاتھ سے گر گیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دو ہفتے بعد ہومر کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میں اور میری اس کے پاس موجود تھے۔ نام واپس اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں سمیری کی دلجوئی کے لیے اس کے پاس رک گیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک میں نے اپنے بھائی کو نہیں دیکھا۔ البتہ ہم خط اور ٹیلی فون کے ذریعے رابطے میں رہے۔ جب اس کی چھوٹی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس نے مجھے اور میری کو بھی بچوں سمیت بلایا اور ہمارے لیے ریل کے ٹکٹ بھیجے۔ اس شادی میں شہر کے امراء اور معززین شریک ہوئے جبکہ میری حیثیت ان کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن مجھے اپنے بھائی سے کوئی حسد محسوس نہیں ہوا بلکہ اس تقریب کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ اگر نام اس روز اپنے آپ کو کوئی مار لیتا تو اس کی بیٹی کی اتنی دھوم دھام سے شادی نہ ہوتی اور اس کے بچے بھی قیدیوں کی ٹرین میں سوار ہو کر درور کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ خدا کسی بچے کو کبھی ماں باپ کے سامنے سے محروم نہ کرے۔

کیا ہندو دی ہو سکتی ہے جسے وہ نوکر کچھ کر لائے تھے۔“ ”میں ان کی حقیقی بیٹی نہیں ہوں۔ کوئی مجھے چرچ کی سیز جیوں پر چھوڑ گیا تھا۔“ تیم خانے والوں نے مجھے وہاں سے اٹھایا اور پھر ایک دن قیدیوں کی ٹرین میں سوار کر دیا۔ یہ لوگ مجھے لے آئے اور مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں۔“ ”ایسا مت کہو۔“ اس کے باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں پہلے دن سے ہی گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہی تھی اور اسی طرح مجی کو بھی انہوں نے رکھا۔ ہم سب اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ شاید ہی کسی تیم بچے کو اتنا پیارا ملا ہو۔“

میں نے ہومر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ تم نے اسے مار ڈالا۔ کیا اس لیے کہ ہم تمہاری بیٹی کے آنے سے پہلے چلے جا چکے؟“

ہومر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میری بیوی۔ ”اسے معلوم نہیں تھا کہ میں آ رہی ہوں۔ اس نے صرف اس وجہ سے اپنے آپ کو قصود اور بھہرایا کہ تم اسے گولی مار دو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں یا پا؟“ ”مجھے افسوس ہے بے بی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”اسے کیسے ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو دو ایسے بھی اثر نہیں کر رہی ہیں۔“

میں نے نام سے کہا۔ ”میں چلنا چاہے۔ اب یہاں ہمارے کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ہمیں جی کا قرض اتارنا ہے۔“

”وہ پتار ہو گیا تھا۔ اس کے لیے کسی کو لازم نہیں دیا جاسکتا۔“

”کسی نہ کسی کو تو لازم دینا ہوگا۔“ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی تو ذمے دار ہے۔ اگر یہ نہیں ہو پھر میں۔“ یہ کہہ کر اس نے گمن اپنی کشتی پر گھر لی۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

نام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کہنے لگا۔ ”یہ اس دن کی بات ہے جب سسر اساکس مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور بھائی یا بہن بھی ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ صرف ایک بھئی لے رہے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر جواب ہاں



وہ دن بھر کھڑا رہا اور یہی باتیں کرتا رہا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں آئے کیونکہ خدا نے انہیں دس دن تک اور روک لیا تھا۔ دوسرے دن وہ پھر نکلا اور سینہ تان کر کہہ رہا تھا کہ موسیٰ اب بھی نہیں آئیں گے۔ تم کہو کہ تم میں تمہارے لیے ایک دیوتا بناؤں تاکہ تم موسیٰ کے محتاج نہ رہو۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ دیوتاؤں کی پرستش کے لیے پہاڑ پر چلا جاتا ہے اور تم پرستش سے محروم رہ جاتے ہو۔ کب تک پرستش سے محروم رہو گے۔

”تم ہمارے لیے کس قسم کا دیوتا بناؤ گے؟“

”کیا تم حورس دیوتا سے واقف نہیں ہو۔ مصر میں تم دیکھ چکے ہو۔ حورس کا منگنا نے کاہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک گاؤں میں تمہیں بتا دوں گا۔“

صدیوں تک مصری غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عفا کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں خاصی حد تک رچنے جا چکے تھے۔ گاؤں کے پرستش مصر کا قدیم عقیدہ تھا اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اسی لیے ان کے ایک بڑے دیوتا حورس کا منگنا کی شکل کا تھا۔ وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی تو انہوں نے اسے بد آسانی قبول کر لیا۔ بنی اسرائیل میں کچھ صالح لوگ بھی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور اپنے لوگوں سے کہا کہ تم سامری کی باتوں میں مت آؤ، جو کچھ یہ کہہ رہا ہے وہ گمراہی کا راستہ ہے۔ تم موسیٰ اور اس کے رب کے احسانات یاد کرو پھر تم بتائے ان کے خلاف نہیں جاؤ گے۔ سامری نے اسرائیلیوں کو اتار غلامی کا کہہ کر وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ان بھی بھڑکے ہوئے تھے۔ یہ چند صالح افراد دھڑکتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پہنچے کہ جا کر ان کے سامنے تمام معاملات بیان کریں۔

ان کے چلے جانے کے بعد سامری اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔

”تمہارے پاس چاندی سونے کے وہ زیورات موجود ہوں گے جو تم مصری عورتوں سے عاریتہ کر آئے تھے؟“

”ہاں وہ ہیں تو۔“

”انہیں میرے پاس لے کر آؤ۔“

”تم ان زیورات کا کیا کر دو گے؟“

”ان زیورات کو گھلا کر ہی تو میں وہ پھنساؤں گا جس کی تم پرستش کر سکو گے۔ اس سے جو مانگو گے وہ تمہیں دے گا۔ جب وہ بے جان ہونے کے باوجود آواز دیں گے گا تو تمہیں خود یقین آ جائے گا کہ وہ دیوتا ہے۔“

چند لوگ حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پہنچے اور انہیں سامری کے ارادوں سے باخبر کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام پابند تھے کہ قوم کو گمراہی کے راستے پر نہ جانے دیں۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ سامری اس وقت کہاں ہوگا۔

وہ سامری سے بات کرنے کے لیے پہنچے۔ وہ اس وقت بھی اسرائیلیوں کے درمیان گھبراہٹا تھا۔ لوگ اسے اپنے اپنے زیورات لاکر دے رہے تھے۔ اس کے سامنے زیورات کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام وہاں پہنچ گئے۔

”سامری! اتھو نہ یہ کیا ڈھونڈ رہا ہوا ہے۔ خود بھی گمراہ ہو رہا ہے اور دوسروں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا رہا ہے۔“

”مجھے ڈانٹنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اپنے لوگوں سے خود پوچھ لو کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے بڑی امیدوں کے ساتھ اپنی قوم کی طرف دیکھا لیکن کوئی ایک فرد بھی ان سے آگے ملانے کا روادار نہیں تھا۔ وہ اپنے زیورات بڑے ذوق و شوق سے سامری کے حوالے کر رہے تھے۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں بہت غیبت دلائی تو وہ سینہ تان کر ان کے سامنے آ گئے۔

”تم دونوں بھائیوں نے ہمیں مصر سے نکال کر بڑی غلطی کی۔ اب ہم زیادہ دیر صبر نہیں کر سکتے یا تو ہمیں مصر واپس جانے دو یا ہمیں اس پھنسرے کی پرستش کرنے دو جو سامری ہمارے لیے بنانے والا ہے۔“

”موسیٰ! اس نے تمہیں آگے ہی والے ہیں تم یہ مقدمہ ان کے سامنے رکھنا۔“

”سامری ٹھیک کہتا ہے۔ موسیٰ اب آئے والے نہیں اور ہم تمہاری بات ماننے کے حق میں نہیں۔“

”میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ یہ گمراہی کا راستہ ہے۔ اس سے باز آ جاؤ ورنہ میں تم پر سختی کروں گا۔“

”اگر تم نے زبردستی کی تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔“

یہ شخص جن کے مجھے بتانے کا بہر تھا۔ مصر میں وہ یہی کام کرتا رہا تھا۔ وہ دعاؤں سے مجھے تیار کر سکتا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کی ذہنی حالت کا اس وقت سے مشاہدہ کرتا چلا آ رہا تھا جس دن سے وہ مصر سے نکلا تھا۔ اس نے وہ منظر بھی دیکھا تھا جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے لیے میوہوں کے بت بنا دے تاکہ ہم ان کی پرستش کریں۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ڈانٹنے پر خاموش ضرور ہو گئے تھے لیکن ان کے دلوں سے جن کا شوق کیا نہیں تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ اپنے اس شوق کو ظاہر بھی کر دیا کرتے تھے۔ سامری یقیناً یہ سب سن رہا ہوگا۔ وہ بنی اسرائیل کے ذہنوں میں یہ بات پہلے ہی ڈال چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان سے فرار ہونے والے ہیں۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ بنا دے۔ اس کے لیے اسے ابھی کچھ اور محنت کرنی تھی۔ اس نے مختلف جگہوں پر بیٹھ کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دیں جن سے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے شک میں پڑ جا گیا۔

”کچھ معلوم ہے یہ موسیٰ علیہ السلام کہاں گئے ہیں۔“

”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کوئی طور پر اپنے رب سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔“

”انہیں ملاقات کی ایسی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ خدا سے ہمارے لیے ہدایات لیتے رہے ہیں اور اب ملاقات کو گئے ہیں۔“

”انہوں نے کہہ دیا اور تم نے یقین کر لیا۔ یہ کیا خدا ہے جو وہاں ہے، یہاں نہیں ہے۔ وہ تم سے جھوٹا ٹھکانہ کر رہا ہے۔“

”وہ تمہیں اہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”انہیں اہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”وہ نہیں چاہتے کہ تم کسی معبود کی پرستش کرو۔ اس طرح ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے منع کر دیا تھا کہ زمین پر کوئی بت نہ بنانا۔“

”خود جا کر پرستش کر آتے ہیں اور تمہیں منع کرتے ہیں۔ انہوں نے ضرور وہاں کوئی بت بنا کر رکھا ہوگا۔“

”کچھ معلوم ہے وہ کتنے دلوں کا کہہ کر گئے تھے؟“

”انہوں نے کہا تھا وہ میں دن کے بعد پہاڑ سے نیچے اتر آئیں گے۔“

”مدت قوت ہونے میں دو دن باقی ہیں۔ اگر وہ پھر بھی نہیں آئے تو میں تمہارے لیے دیوتا بنا دوں گا۔“

”یہ دیوتا کیا ہوگا؟“

”یہ تو میں دیوتاؤں سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔“

سامری نے یہ گفتگو یہیں چھوڑ دی اور ان سے الگ ہو گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کے دلوں میں شوقی منہ پختی پیدا کر دیا تھا۔ وہ ابھی دیکھنا چاہتا تھا کہ ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آتے ہیں یا نہیں۔ اگر آ بھی جاتے ہیں تو اس نے ان کی قوم کو اتار غلامی کا کہہ کر وہ خود ان سے بت بنانے کا تقاضا کرتی۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے منصوبے پر غور کرنا شروع کیا تو ایک اور بات بھی اس کے ذہن میں آئی۔ اگر موسیٰ کی قوم ان سے منحرف ہو جائے تو قیامت میرے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ ایک رات کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدت قوت ختم ہو چکی تھی۔ انہیں اگلے دن آ جانا چاہیے تھا۔

وہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکلا اور لوگوں سے پوچھتا پھرا۔

”موسیٰ ابھی آئے نہیں۔ تمیں دن تو مکمل ہو گئے تم سے کبھی بہرہ رکھے تھے؟“

”ابھی تو دن نکلا ہے۔ وہ ضرور پہاڑ سے اتریں گے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو ہم ابھی ہارون (علیہ السلام) سے جا کر پوچھ لیتے ہیں۔“

”خبردار! ایسا نہ کرنا۔ وہ باتیں بنا کر تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ جب تک میں نہ کہوں ان سے کوئی ذکر نہ کرنا۔ آج اور دیکھ لو۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“



آوازیں غروں کی شکل میں سنائی دے رہی تھیں۔  
 ”ہارون! یہ میں کیسا شور سن رہا ہوں؟ بستی میں کوئی غنیمت محسوس آیا ہے؟“  
 ”پہل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، وہ چاہتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام خود دیکھیں کہ ان کی قوم کس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔  
 یہ دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا سونے کا ایک بچھرا رکھا ہے۔ لوگ اس کے گرد گھوم رہے ہیں، گانے گارہے ہیں۔ گویا بچھڑے کی عبادت کی جارہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ منظر دیکھ کر بے پناہ غضب ناک ہو گئے۔  
 ”تم لوگوں نے یہ کیا ڈھونڈ کر چاہا ہوا ہے اور یہ کیا حرکت ہے جو تم کر رہے ہو۔ تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اگر وہ یہی ایمان ہے تو انفس اس ایمان پر کیا ہی بری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے۔“  
 حضرت موسیٰ کی لگاتار سنتے ہی ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔ پھر ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شخص جو سامری بچھڑا ہے، یہ بچھڑا اس نے بنا کر دیا ہے۔ اس نے ہم سے کہا تھا، موسیٰ تم کو بھول گئے۔ تمہارا رب تو یہ ہے چنانچہ ہم اس کی پرستش کرنے لگے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصے سے حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ گمان گزرا کہ حضرت ہارون علیہ السلام نیا بت کا حق بیچ طرح ادا نہ کر سکے اور قوم کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔  
 ”انفس! تم نے کس طرح میرے طریقے سے میری جانشینی کی۔ تم اپنے پروردگار کے حکم میں ذرا بھی اعتقاد نہ کر سکتے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش میں آ کر حضرت ہارون علیہ السلام کو بالوں سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچنے لگے۔  
 حضرت ہارون علیہ السلام نے بے بسی سے کہا۔ ”اے میرے بھائی! میں کیا کروں۔ لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور تیرے حکم کو ٹھکر دیا۔ میں میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہمتیں اور تم مجھے ان ظالموں کے ساتھ شام کر۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی احساس ہوا کہ انہوں نے بھائی پر حملہ کیا۔ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی۔  
 ”پروردگار! میرے بھائی کو بھی اور میں اپنی رحمت میں داخل کر۔ تجھے سے بڑھ کر کون ہے جو ہم پر رحم کرنے والا ہے۔“

اسی پکار کے جواب میں خدا نے فرمایا۔ ”جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے حصے میں خدا کا غضب آئے گا اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنی صفائی پیش کی۔  
 ”میرے بھائی! اس معاملے میں میری مطلق خطائیں ہیں۔ میں نے ان کو ہر چند سمجھا لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی اور کہنے لگے جب تک موسیٰ..... نہ آیا ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انہوں نے مجھے کزدو بھگ کر میرے گل کا ارادہ تک کر لیا تھا کہتے تھے ہم بہت ہیں اور تو اکیلا ہے۔ میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا جائے جو اس بچھڑے کی پوجا کے خلاف تھے تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ آجائے کہ میں نے قوم میں فتنہ ڈال دیا۔ میں ان سے جنگ کر سکتا تھا لیکن میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا۔ اب آپ آ گئے ہیں جو فیصلہ کریں۔“  
 حضرت ہارون علیہ السلام کی یہ معقول دلیل سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ان کی طرف سے فرو ہو گیا۔ اب وہ سامری کی طرف متوجہ ہوئے جو وہیں ایک گوشے میں کھڑا سب کی باتیں سن رہا تھا۔

”اے سامری! اتونے یہ کیا ڈھونڈ کر چاہا ہے۔ تو تو ایمان لے آیا تھا اور یہاں تک میرے ساتھ لگا چلا آیا۔ پھر میرے دل میں کفر کی یہ بات کیسے سنائی کہ تم کو گمراہ کرنے پر بے رغبت ہو گیا۔“  
 ”اس میں میرا قصور نہیں۔ تیری قوم ابھی تک مصر کو یاد کرتی رہی تھی۔ ان کا دل پھل رہا تھا کہ مصر کی طرح یہاں بھی وہ جوں کی پرستش کریں۔ آپ نے آنے میں دیر لگائی۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بچھڑا بنا کر انہیں دے دیا۔ اگر یہ نہ چاہتے تو اپنے زیورات لا کر مجھے کیوں دیتے جنہیں ڈھال کریں نے یہ بچھڑا بنا دیا۔“  
 ”بچھڑا آوازیں کیوں نکالتا ہے؟ کیا یہ تیرا کوئی جادو ہے؟“  
 ”میں نے ایسی بات دیکھی جو ان امرا کیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی۔ غرق... فرعون کے وقت اللہ کا نرشیہ

”میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں قوم میں انتشار پیدا نہ ہونے دوں اس لیے تمہاری کافرانہ خدے کے سامنے خاموش ہوئے جاتا ہوں۔ جب موسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو تم سے خودکشت لیں گے۔ بس اتنی گواہی ضرور دینا کہ تمہیں میری رضامندی حاصل نہیں تھی۔ میں نے تم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے بس ہو کر ان کے سامنے سے ہٹ گئے۔  
 سامری نے زیورات کو پھٹلایا اور اس سے ایک بچھڑا تیار کر لیا۔ جب اس نے اپنے فن کا شاہکار تخلیق کر لیا تو اس نے اس بچھڑے کو ایک نمایاں جگہ رکھ دیا اور تمام بنی اسرائیل کو بلا دیا۔

”یہ تمہارا خدا ہے۔ اسے سجدہ کرو۔“  
 ”تو نے تو کہا تھا کہ بچھڑا ہے جان ہو گا لیکن بولتا ہو گا۔“  
 ”تم سجدہ کر کے اسے خدا تسلیم کر تو یہ بولے گا۔“  
 اسرائیلی سجدے میں گر گئے۔ سامری نے ایک مشت خاک اس کے اندر ڈال دی۔ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہوئے اور وہ ”بھائیں بھائی“ کی آوازیں نکالنے لگا۔

”دیکھا تم نے؟ تمہارا معبود تو یہ ہے جو تمہیں سلاستی کی نوبت بنا رہا ہے۔“  
 اسرائیلیوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور بچھڑے کے گرد ناچ ناچ کر دغا دینا گیت گانے لگے، جیسا کہ انہوں نے مصر میں مصریوں کو دیکھا تھا۔

مجیب قوم تھی۔ ان کا پیغمبر پروردگارِ عالم سے راز و نیاز میں مصروف اور ان کے لیے آئین الہی (توریت) حاصل کرنے میں مشغول تھا اور قوم نے سامری کی قیادت میں خود ہی اپنا معبود تلاش کر کے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔  
 اللہ کو سب معلوم تھا کہ نیچے وادی سینا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعے سے مطلع کر دے۔

”موسیٰ! تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟“ اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔  
 ”خدا یا! اس لیے کہ جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں۔“  
 ”جس کی ہدایت کے لیے تم آتے مغلط ہو، اس نے گمراہی اختیار کر لی۔ تمہارا چلہ پورا ہو چکا۔ تم قوم کی طرف واپس جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے ایک گائے کی شکل میں اپنا معبود بنالیا ہے اور وہ اس کی پرستش کر رہے ہیں۔“

یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت ندامت ہوئی۔ شرمندگی سے گردن جھکا لی۔  
 ”موسیٰ! تم کیوں شرمندہ ہوئے۔ تم نے تو اپنا کام پورا کیا۔ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کر دوں۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے تمام تر غصے کے باوجود اب بھی قوم کا خیال تھا کہ کہیں اللہ کا غضب ان پر نہ ٹوٹے۔ وہ خدا سے منت گزار ہوئے۔

”اے خداوند! کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے جن کو تو میرے نکال لایا ہے۔ مصری لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ موسیٰ..... انہیں پہاڑوں میں مار ڈالنے کے لیے نکال کر لایا تھا۔ تو اپنے بندوں ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کا خیال کر جن سے تو نے اپنی قسم کھا کر کہا تھا کہ تو ان کی نسل کو آسان کے تاروں کی طرح بڑھا دے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توریث کی لوہیں ہاتھوں میں اٹھائیں اور پہاڑ سے نیچے اترے۔  
 حضرت ہارون علیہ السلام بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار پہاڑ کے نزدیک جا کر دیکھ آتے تھے۔ بالآخر وہ دن آیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ہارون علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ قوم گمراہ ہو گئی ہے دوسرے اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چہرہ خدا سے ہم گلائی کی وجہ سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

جب وہ نزدیک آئے اور بھائی کو اچھی طرح دیکھتے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر بستی کی طرف چلے۔ دل میں ڈرتے بھی بے تھے کہ جب قوم کی گمراہی کا راز کھلے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا گزرے گی۔  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام بستی کے قریب آئے تو انہیں کچھ شور سنائی دیا۔ گانے کی آوازیں مچیں۔ درمیان میں بے ہنگم



اسرائیلیوں اور فرعونوں کے درمیان جاگ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کے "نہم" کی خاک میں اثر حیات پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے قدم جہاں پڑتے ہیں، وہاں ہرزہ اگ جاتا ہے۔ یہ بات مجھے عجیب سی لگی۔ میں نے گھوڑے کے قدموں کی خاک اپنے پاس محفوظ کر لی۔ میں نے وہی خاک اس پھڑے میں ڈالی تو یہ پھڑے جیسی آواز نکالنے لگا۔"

قرآن نے بھی اس کی گواہی دی ہے۔  
 "(سامری نے کہا) میں نے وہ بات دیکھی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش قدم سے ایک مٹی بھری پھراس کو (ڈھلے ہوئے پھڑے میں) ڈال دیا۔ میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے بھائی۔" (طہ)  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "جب تو نے اعتراف کر لیا ہے تو تیرے لیے یہ سزا تجویز کی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح بار بار امارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو تو اس سے دور بھاگے اور کہتا جائے کہ مجھے ہاتھ نہ لگنا۔ یہ دنیاوی غراب ہوگا اور قیامت میں جو عذاب ایسے انسانوں کے لیے مقرر ہے وہ اٹک ہے اور یہ بھی دیکھ لے کہ تو نے جس معبود کو بنایا تھا میں اسے جلا کر خاک بنا دوں گا اور اس خاک کو دریا میں بہا دوں گا تا کہ تیرے مقتدیوں کو اور تجھے معلوم ہو جائے کہ تیرا بنایا ہوا معبود دوسروں کو فائدہ کیا پہنچاتا خود اپنے آپ کو بھی جلائے سے نہ بچا سکا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے بعد بنی اسرائیل سے مخاطب ہوئے۔ "بدبختو! تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ پھڑا صرف بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ تمہاری باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ تمہارا معبود صرف خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔"

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پھڑے کو جلا چکے اور سامری کا حال پاگلوں کی طرح ہو گیا۔ وہ جس طرف جاتا لوگوں سے کہتا جاتا۔ میرے قریب نہ آتا۔ مجھے ہاتھ نہ لگا اور نہ میری بیماریاں نہیں بھی لگ جائے گی تو بنی اسرائیل پر غوف طاری ہوا۔ وہ آپس میں ان گناہ گاروں سے بچنے کے لیے جنہوں نے اس پھڑے کی پرستش کی تھی۔ تمام بنی اسرائیل کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں ان کا حال بھی سامری جیسا نہ ہو جائے۔ وہ سب موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کے لیے دوڑے کہ وہ انہیں اللہ کے غضب سے بچائیں۔

"ہم سے بہت بڑی عداوتی ہو گئی ہے۔ تو ہمیں اللہ کے غضب سے اسی طرح بچالے جس طرح اب تک بچتا آیا ہے۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور انہیں باہر کھڑے رہنے کا حکم دے کر غصے کے اندر چلے گئے۔ اگر ایک ستون غصے کے دروازے پر آکر ٹکڑ ٹکڑ کیا۔ اس ابر کے ستون سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بچائیں۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"فرمان! اٹھی ہے کہ ہر گناہ کی معافی فقط توبہ و ایمان صالح سے ہو جائے گی مگر پھڑے کی عبادت کے عظیم گناہ کی معافی میں تمہیں اپنی جانوں کی قربانی دینی ہوگی۔"

"میں تم سے کہتا ہوں، تم نے پھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت عظیم کیا ہے لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔ اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک توبہ بہتری ہے۔"

قرآن کے الفاظ ہیں۔  
 "یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام (یعنی توبہ لے ہوئے پانا تو اس نے) اپنی قوم سے کہا۔ لوگو! تم نے پھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت عظیم کیا ہے لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔ اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک توبہ بہتری ہے۔" (سورہ بقرہ)

"موسیٰ..... ہم توبہ کرتے ہیں لیکن ہم اپنی جانوں کو ہلاک کیسے کریں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"  
 "ان آدمیوں کو لڑ کر جنہوں نے پھڑے کی پرستش کی۔ اسی میں ان کی توبہ اور تمہاری نجات ہے۔"

فسا میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے کہ ہر مومن کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرنا چاہیے کہ جو شخص رشتے میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو۔

بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا کیونکہ جو بے گناہ تھے، وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ گناہ گاروں کی وجہ سے کہیں ان پر خدا کا غضب نازل نہ ہو۔

جو لوگ اس گناہ سے پاک تھے انہوں نے تمنا میں لیں اور گناہ گار لوگ دوزخ الو سر جاکر مرنے میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت بادل ٹھہر کر آئے اور ایسا اندھیرا چھا گیا کہ قریب والے کو اپنا سامی بھی نظر نہ آتا تھا اور نہ کسی کو اپنے رشتے دار کی خبر

ہوتی تھی۔ پھر گناہ سے پاک لوگوں نے ان کی گردنیں اڑانا شروع کر دیں۔ توبہ میں ہے کہ اس طرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے۔ بعض اسلامی روایات میں یہ تعداد ستر ہزار تک بیان کی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد جب قوم اپنے عزیزوں کا ماتم کر چکی تو حضرت ہارون علیہ السلام کے کہنے پر ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے خطاب کیا۔

اے قوم! بلا شرم قتلے میں ڈال دیے گئے۔ بے شک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے۔ پس اب بھی سمجھو اور میری پیروی کرو اور میرے حکم کو مانو۔"

کچھ دن بعد پھر ایک خطاب کیا۔ دنوں کا تقداس لیے دیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی حالت پر غور کریں۔ ان نشانوں کا جائزہ لیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دکھائی ہیں۔ اس کے بعد انہیں توبہ لے کر خوش خبری سنائی جائے۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہنا شروع کیا۔

"تم نے پھڑا بنا کر اپنی جانوں پر بڑا عظیم کیا تھا۔ پھر تم نے جی تو یہی کہی اور اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ جرم اپنی بے پایان رحمت سے معاف کر دیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ تمہیں اس ملک تک لے جائے گا جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے بشرطیکہ تم اس کی پیروی کرتے رہو۔ جو وہ کہے اس پر عمل کرو تا کہ وہ تمہارے دشمنوں پر تمہیں فتح یاب کرے اور تمہیں ان ملکوں پر قابض کر دے اور ہرگز نہ ڈرنا کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔"

"اب میں تمہیں ایک خوش خبری دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہاری راہبری کے لیے کتاب اتاری ہے۔ اس میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو میں اب تک تمہیں بتاتا رہا ہوں یا آئندہ تمہیں ان سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ اس میں وہ تمام قوانین درج ہیں جو تمہیں دوسری قوموں پر ممتاز کر دیں گے۔ میرے پاس جو یہ "الواح" (تختیاں) ہیں، یہی وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور نئی و دنیوی زندگی کی تلاش کے لیے مجھے عطا کی ہیں۔ یہ تورات ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔"

اسی وقت کروں کے بعد ہی ہو چاہیے تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سوچ رہے تھے۔ دنوں کی سختی میں کی آجانی چاہیے تھی لیکن بنی اسرائیل تھے جسے اللہ تعالیٰ "گردن کش قوم" قرار دے چکا تھا۔ ابھی کچھ لمحوں پہلے احکام کی تعمیل پر زبان دے چکے تھے، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن کر بالکل ہی بدل گئے۔

"موسیٰ! ہم کیسے یقین کر لیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ صرف تیرے کہنے سے تو نہیں مان سکتے۔ ہمیں تو اس وقت یقین آئے گا جب خدا کو بے حجاب دیکھ لیں۔ وہ خود ہم سے کہے کہ تورات میری کتاب ہے، ہم اس پر ایمان لے آؤ۔"

پہلے ایک آواز آئی پھر ہر طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں۔ یوحنا بن لون اور حضرت ہارون علیہ السلام نے بڑی مشکل سے اس شور پر قابو پایا اور مجمع کو اس قائل بنایا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن سکیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا۔ "تم کیوں نادانیوں پر نادانیاں کرتے ملے جا رہے ہو۔ یہ تمہارے لیے محال ہے کہ انسانی آئندہ سے خدا کو دیکھ سکو۔ یہ تم نے کسی خدا کا بندہ ہی ہے کہ خدا کو دیکھنے کی ضد کر رہے ہو۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جسے میں پوری نہ کر سکوں۔"

"تو ہمیں مصر سے یہاں لے آیا اور اب ہماری بات سننے کو بھی تیار نہیں۔"  
 "اپنے رب کے احسانات یاد کرو اور مانو کہ وہ تم پر مہربان ہے لیکن یہ تمہاری بے جا ضد ہے۔"

"یہ جب تک نہ ہوگا تم تورات کو ماننے والے نہیں۔"  
 "تمہاری یہی ضد ہے تو مانے لیتا ہوں لیکن یہ ناممکن ہے کہ تم لاکھوں کی تعداد میں طور پر جاؤ۔ میں تم میں سے ستر اشخاص منتخب کر کے پہاڑ پر لے جاتا ہوں وہ آکر تمہاری گردنوں کو تمہارے لیے مان لیتا۔ تم ایک گناہ عظیم کر چکے ہو۔ اس پر اظہارِ ندامت اور معافی کے لیے بھی یہ ایک اچھا موقع ہے۔ یہ سب تمہاری طرف سے اظہارِ ندامت کریں گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے ستر علماء کا انتخاب کیا اور قوم کو بھی اعتماد میں لے لیا کہ وہ ان کی تصدیق کو تسلیم کریں گے اور بعد میں کوئی بہانہ نہیں تراشیں گے۔ قوم نے ان لوگوں پر اعتماد کیا۔

ان علماء کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور یوحنا بن لون بھی تھے۔ ان سب کو حکم ملا کہ غسل کر کے پاک کپڑے پہن لیں اور خوشبو میں بس جائیں کیونکہ وہ وہاں ان کے بادشاہ کے حضور جا رہے ہیں۔



کر لیں گے لیکن جو باتیں مشکل ہوں گی، ہم انہیں چھوڑ دیں گے۔  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تم اپنی آسمانی تلاش مت کرو، اللہ کی رضا کو دیکھو۔ کوئی آقا اپنے اس غلام سے کیسے خوش ہو سکتا ہے جو یہ کہے کہ میں تیری کچھ باتیں تو مانوں گا، کچھ نہیں مانوں گا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ سب تمہیں قبول کرنا ہوگا۔ اللہ کی براس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ دیکھو اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں تمہیں کھول کھول کر بتاتا ہوں گا اور تم اس پر عمل کرنے کے پابند ہو گے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔“

”اے موسیٰ! تو بے شک اس کی باتیں بتا تا رہا۔ ہم تو صرف اتنا مانیں گے جس میں ہماری سہولت ہوگی۔“  
 ”دیکھو، اللہ کے غضب کے حق دار نہ بنو۔ یہ کتاب تمہاری ہدایت کے لیے ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔“  
 ”موسیٰ! ہم تیری باتیں سنیں گے ضرور لیکن ہم اس صحرا میں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ مشقت کرتے رہیں۔ اپنے خدا سے کہو اس میں آسان باتیں لکھ کر دے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی گستاخیوں کے باوجود رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے اور قوم کا یہ حال کہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔ وہ قوم کی بے راہ روی کا گلہ کرتے ہی رہے تھے لیکن اس وقت ان پر ان کے تیز مزاج کا غلبہ تھا کہ نہایت سخت الفاظ استعمال کر بیٹھے۔

”اے اللہ! یہ قوم اب میرے اختیار میں نہیں رہی۔ یہ تیری کتاب کے احکام تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ تو اب ایسا کر کہ میرا نام ہی اس کتاب سے ملتا رہے۔ میں اب ان سے یہ کہنے کا نہیں کہ یہ کتاب تجھے دی گئی ہے اور تم اسے تسلیم کرو۔“

فوراً ندا آئی۔ ”موسیٰ! تم دل چھوٹا کیوں کرتے ہو۔ ان نافرمانوں کے لیے میں تجھے ایک مجبور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ پر تو مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور جس پر تیرے سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا اور جس پہاڑ پر ہونے والی گفتگو کو یہ جھٹلاتا رہے ہیں، وہی پہاڑ ان کے سروں پر آنکر ٹکڑا ہوجائے گا۔ جب یہ مانیں گے کہ تو میرا سچا پیغمبر ہے اور تورت گئی کتاب ہے۔“

یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ بادل گرے اور بجلی چمکے گی۔ کالی گھٹائیں چھا سکیں۔ بنی اسرائیل اپنے ڈیروں میں بیٹھے کاب رہے تھے بھرہو دشت زدہ ہو کر باہر نکلے۔ کوہ طور ان کے سامنے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ ان میں سے بہت سے کہنے لگے کہ وہ قیامت آگئی ہے جس کا ذکر موسیٰ اکثر کرتے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ پہاڑ کو جھنڈ ہورہی ہے جیسے وہ اپنی جڑیں چھوڑ رہا ہو۔ انہوں نے اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا سمجھا لیکن یہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ پہاڑ نے زمین چھوڑ دی اور اوپر کی طرف اٹھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بلند ہو گیا کہ ان کے سروں پر سامناں کی طرح چھا گیا۔ اب تو بیچنے کے سوالوں کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب انہیں موسیٰ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے کچھ دنوں سے اپنے ارشادات میں کہنا شروع کر دیا تھا اگر انہوں نے تورت کو قبول نہیں کیا تو وہ پہاڑ جس پر تورات نازل ہوئی، تمہارے سروں پر چھا جائے گا اور زبان حال سے کہے گا کہ اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے تو تسلیم کرو کہ جو خدا تمہیں یہ مجبور دکھا سکتا ہے، اسی نے تمہیں تورت دی ہے۔ یہ بے جاں پتھر کا ٹکڑا (پہاڑ) اپنے رب کا حکم سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا مگر تم ہو کہ اپنے گھمنڈ میں غفلت کے پردے میں جیسے ہوئے ہو۔ تورت کو قبول کرو اور ان میں درج احکام پر عمل کرو۔ یہ نہیں کہ اپنی سہولت کی چیزیں قبول کر لو اور باقی کو رد کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان ارشادات کو یاد کرتے ہی وہ سمجھ گئے کہ اللہ کا غضب ان کے سروں پر آ پہنچا ہے۔ اب اگر انہوں نے ذرا بھی دیر کی تو یہ پہاڑ ان کے سروں پر آگرے گا۔ وہ بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ کن آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے کہ پہاڑ انہیں کھیلنے کے لیے نچے تو نہیں آ رہا ہے اور دل ہی دل میں اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے جاتے تھے۔

وہ اس وقت تک سجدے میں پڑے رہے جب تک انہوں نے ترجمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیا کہ پہاڑ ان کے سروں سے ہٹ گیا اور اپنی جگہ جا کر ٹکڑا ہو گیا۔ دھواں ختم ہو گیا، بادل چھٹ گیا۔

یہ یہودی آج تک کے لیے سنت ہو گئی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس سجدے سے بڑھ کر کوئی سجدہ نہیں جس نے ہم پر سے عذاب ٹھوکانا۔

بہت دیر بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں تو انہوں نے سر کو سجدے سے اٹھایا اور ہر قبیلے نے اپنے اپنے نمائندوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے تورات کی قبولیت کا وعدہ کریں۔

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور کو اٹھایا کیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور پھر تم نے اس کے بعد چپے پھیر لی۔ پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو

بنی اسرائیل نے داوی میں کھڑے ہو کر ان لوگوں کو طور کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ جب یہ افراد طور پر پہنچے تو ایک سپید بادل کی طرح ”نور“ نے پہاڑ کو ڈھانپ لیا ہے۔  
 یہ دراصل جمال خداوندی کا نور تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ کو گھیر لیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں عرض کیا۔

”اے رب ذوالجلال! تو میری قوم کے حالات سے واقف ہے۔ ان کی بے جا ضدوں کو بھی جانتا ہے۔ اب انہوں نے اپنی نادانی سے یہ ضد پکڑ لی ہے کہ وہ تورات کو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک انہیں تصدیق نہ ہو جائے کہ یہ کتاب تو نے ہی انہیں دی ہے۔ میں ان کی ضد پر سزا آدمی انتخاب کر لایا ہوں تاکہ وہ بھی اس جواب نور سے میری اور تیری ہم گامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کر دیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور کر لی گئی لیکن ان سرداروں نے وہی اپنا پہلا امر ادا قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں۔ ان کے اس بے جا مطالبے پر غیرت الہی جوش میں آگئی۔ پہاڑ اس طرح ہلنے لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ایک ہیبت ناک چمک نے ان کو آگیا اور جلا کر خاک کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ باجرا دیکھا تو سجدے میں گر گئے۔ یہ دعا ان کے ہونٹوں پر تھی۔  
 ”الہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ اے خدا! اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے۔“

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش کی لاج رکھی اور ان سب کو اپنی قدرت سے دوبارہ حیات بخش دی۔  
 ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے سزا آدمی بننے پھر نرا دینے والی ہولناکی نے انہیں آگیا تو موسیٰ نے عرض کیا۔

پر دروگہ را اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا اور میری زندگی بھی ختم کر دیتا۔ پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے بھکا دے جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دے۔ خدا یا تو ہمارا دلی ہے۔ ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر۔“ (سورۃ اعراف)

”اور جب تم نے کہا۔ اے موسیٰ! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں پس آنکھوں دیکھے تمہیں بجلی کی کڑک نے آچکرا۔ پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گزار رہو۔“ (سورۃ بقرہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔ خدا نے انہیں دوبارہ زندگی دے دی اور اس طرح کہ ایک دوسرے کو نہ صرف زندہ ہوتے ہوئے دیکھا بلکہ ان کے کپڑے بھی وہی تھے جو انہوں نے مرنے سے پہلے پہنے تھے۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور انہیں بجلی کی وہ کڑک یاد آتی تھی جو انہوں نے مرنے سے پہلے سنی تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے، ہم تو مر گئے تھے پھر ہمیں زندہ کس نے کیا؟ یہی سوال انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”میں تو رب ہے جو موت کا بھی مالک ہے اور زندگی کا بھی۔ جو مجھ سے دکھاتا ہے اور جو ہر شے پر قادر ہے۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا عام قانون تو یہی ہے کہ مرنے کے بعد عالم آخرت ہی میں دوبارہ زندگی ملے گی لیکن وہ ہر شے پر قادر ہے اس لیے اس نے تمہیں اس دنیا ہی میں دوبارہ حیات دے دی تاکہ تم اسے پہچانو اور اس کی تسبیح کرو۔“

ان سب نے اقرار کیا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے موسیٰ سے کلام کیا اور اسے کتاب دی۔ ہم قوم کے سامنے جا کر اس کی تصدیق کریں گے۔ اس کتاب پر خود بھی عمل کریں گے اور دوسروں کو بھی مجبور کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پورا اطمینان تھا کہ تصدیق ہو چکی۔ اب قوم کو تورات قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوگا۔ ہر قبیلے کے سرداروں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ کیا اب بھی وہ کوئی عذر پیش کر سکیں گے؟  
 ان نمائندوں نے قوم کے سامنے تصدیق کر دی۔ تھا تو یہ تھا کہ اب وہ کسی جگہ دھبے کے بغیر اسے تسلیم کر لیں لیکن انہوں نے عجیب بحث شروع کر دی۔

انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ”اے ہم پر کھول کر بیان کرو۔ جو باتیں آسان ہوں گی انہیں تو ہم قبول



وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے اور ان سے عہد کیا کہ وہ تورات کو قبول کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ یہ ہے شجک اللہ کا کلام ہے۔ تو ہمیں حکم دے کہ ہم ان احکام پر کیے اور کس طرح عمل کریں۔  
جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے خطاب کیا۔

”جس بات کا حکم خداوند نے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ تم اپنے پاس سے خداوند کے لیے دیہ لاؤ۔ سونا، چاندی اور پتھر اور آسانی، اور غوثی اور سرخ رنگ کے کپڑے اور بکریوں کے بچہ کی لانا۔ میں تمہیں کی سرخ رنگی ہوئی کھالیں اور بکری کی لکڑی بھی لانا اور جلانے کا تیل اور مسح کا تیل۔ تمہارے درمیان جو کارنگر ہیں، وہ آکر وہ چیزیں بتائیں جن کا حکم خداوند نے دیا ہے۔ میں تمہیں اور اس کا خیر اور خلاف اور اس کی گھنڈیاں اور تختے اور پیڑے اور اس کے ستون اور خانے، صندوق اور اس کی چوٹیں، سر پوش اور سچ کا پردہ، میز اور اس کی چوٹیں اور اس کے سب غروف اور نذر کی رونیاں اور روشنی کے لیے صحن دان اور اس کے برتن اور چراغ اور جلانے کا تیل اور بخور جلانے کی قربان گا۔ وہ سوختی قربانی کا ذبح اور ہارون کے بیٹوں کے لیے لباس تاکہ وہ کاہن کی خدمت انجام دیں۔“

یہ جماعت رخصت ہوئی اور اپنے اپنے قبیلوں میں جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اب بنی اسرائیل کے لیے پیچھے ہٹنے کا کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے سروں پر پہاڑ کو منڈلاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے پیغام سنا اور جس جس کے پاس جو کچھ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ راتے کے طور پر لائے گئے۔  
عورتوں نے بکریوں کی چشم کائی اور جو سردار تھے، وہ سینہ بند کے لیے سلیمانی پتھر اور جڑاؤ پتھر اور روشنی اور مسح کرنے کے تیل اور خوشبودار بخور کے لیے مسالے اور تیل لائے۔

ایک قبیلہ ایسا بھی تھا جو صنعت کاری میں اور سونے چاندی اور پتھر کے کام اور جڑاؤ پتھر اور لکڑی کو تراشنے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے سرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنی خدمات پیش کیں اور وہ تمام سامان ان سے لے لیا جو بنی اسرائیل ہدیے کے طور پر لائے تھے تاکہ ان سے مقدس کی عبادت کی چیزیں بنائی جاسکیں۔  
ان کا ذکر مکرور نے خیر لہذا اجتماع کی تیاری کے لیے کام شروع کر دیا۔ دوسرے کارنگر ”عہد کا صندوق“ بنانے میں مشغول ہوئے۔ انہوں نے یہ صندوق خدا کے حکم کے مطابق بکری کی لکڑی کا بنایا۔ اس کی لمبائی ڈھائی ہاتھ اور چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی ڈیڑھ ہاتھ تھی۔

اسی طرح نذر کی روٹیوں کے لیے میز، خالص سونے کا صحن دان، بخور جلانے کی قربان گا، بکری کی لکڑی کی بنائی۔ سوختی کی قربانی کے لیے مذبح خانہ بنایا۔

جب سب کام پایہ تکمیل کو پہنچ گئے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عبادت شروع کر دی۔ چڑھاوے بھی چڑھائے جانے لگے، قربانیاں بھی دی جانے لگیں۔

خدا اب بھی بنی اسرائیل سے مطمئن نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بار بار وحی اترتی تھی کہ یہ قوم سدھرنے والی نہیں۔ تو جیسے ہی ان سے دور ہوگا، یہ پھر بہک جائے گی۔ تو ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ اور انہیں ہمارے احکام سناتا رہے۔  
حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا فریضہ بخوبی انجام دیتے رہے۔

بنی اسرائیل کو اپنے حالات کے مطابق جو بھی مشکل پیش آتی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور ان سے پوچھتے کہ تیرے خدا نے اس بارے میں کیا احکام صادر کیے ہیں۔

ایک روز آپ خطاب فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے حرام و حلال کے بارے میں سوال کیا۔

”آپ یہ بتائیے کہ ہمارے لیے کن جانوروں کو حلال کیا گیا ہے اور کن جانوروں کو حرام۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”زمین کے جن حیوانات کو تم کھا سکتے ہو، ان کی پہچان یہ ہے کہ جانوروں میں جن کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں اور وہ چمکی کرتے ہیں، تم ان کو کھاؤ لیکن جو چمکی تو کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں، تم ان کو نہ کھانا پیسے اوٹ کیونکہ وہ چمکی کرتا ہے مگر اس کے پاؤں الگ نہیں۔ سو وہ تمہارے لیے حرام ہے۔ خرگوش بھی تم پر حرام ہے کیونکہ وہ بھی چمکی کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں۔ خنزیر بھی تمہارے لیے حرام ہے کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں لیکن وہ چمکی نہیں کرتا۔

پانی کے جانوروں میں جن کے پر اور جھلکے ہوں تو انہیں کھانا۔ جن کے پر اور جھلکے نہیں، وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں۔ پرندوں میں جو تمہارے لیے مکروہ ہیں اور جن سے تمہیں کراہیت کرتا ہے، وہ یہ ہیں۔ عقاب، چیل، ہر قسم کا باز اور ہر قسم کے کوءے، شتر مرغ، چنڈ اور ہر قسم کے شاہین، الو، گدھ، سب قسم کے بگے، بدمد اور چمگاڈ بھی تم پر حرام کیے گئے ہیں۔  
پر دار پرینگے والے جانور جتنے چار پاؤں پر چلتے ہیں، وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں۔

نیولا، چوہا اور ہر قسم کی بڑی چھچھلی تمہارے لیے حرام ہے، ان سب حرام جانوروں اور پرندوں کو کھانا تو بڑی بات ان کو چھونے سے بھی تم ناپاک ہو جاؤ گے۔ جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو چھوئے گا، وہ شام تک ناپاک رہے گا۔“

”ہمیں سمجھاؤ اور باتیں بتانا کہ ہماری زندگیوں میں کیا چیزیں ہیں۔“

اس سوال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں چند سختیں کیں۔

”تم بتوں کی طرف رجوع نہ کرنا۔ چوری نہ کرنا، دغا نہ دینا۔ میرے نام کی جھوٹی قسم نہ کھانا۔ مزدوری کی مزدوری تیرے پاس صبح تک نہ رہنے نہ پائے۔ بہرے کو نہ سونا اور اندھے کے آگے ٹھوکر گھٹنے کی چیز کو نہ دھرنا۔ فصلے میں نہ راتنی نہ کرنا۔ راستی کے ساتھ اپنے ہمسائے کا انصاف نہ کرنا۔ اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا۔ انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ نہ رکھنا۔ کسی چیز کو خون سمیت نہ کھانا۔ کوئی پردہ کسی تمہارے ملک میں بود و باش نہ رکھنا ہو تو تم اسے آزار نہ پہنچانا۔ ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرنا۔ چادو کروں کے پاس نہ جانا۔“

ابھی آپ کا خطاب جاری تھا کہ ایک شخص نے عجیب سا سوال کر ڈالا۔

”اس دنیا میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے؟“

”اسے شخص تو یہی سوال کیوں پوچھتا ہے جبکہ تجھے اچھی طرح معلوم ہے۔“

”میں آپ کو تو جانتا ہوں، کسی اور کو نہیں جانتا۔“

”بس یہی تو تیرا جواب ہے۔ مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم دیا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچ کر اپنا نام لے دیا کہ اس شخص کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو اور وہ میرا مطیع بن کر ہے۔ دوسرے لوگ جو ہیں، وہ بھی میری نبوت پر ایمان قائم کر سکیں۔

انہوں نے یہ بات کہنے کو تو کھردی لیکن خود ان کا ضمیر اس سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ اس سوال کے جواب کے لیے انہیں اللہ تعالیٰ سے پوچھنا چاہیے تھا اور اس لیے بھی کہ اس جواب سے غرور ظاہر ہو رہا تھا اور اللہ کو غرور پسند نہیں۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر چلتے رہے کہ اب اس نادانی کا کفارہ کیسے ادا ہو۔ کسی نادان سے خطا کا کفارہ ”توبہ“ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

انہوں نے توبہ کی کہ اسے اللہ، میں نے غیر ارادی طور پر یہ کہہ دیا کہ میں اس دنیا کا سب سے بڑا عالم ہوں۔ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہی تھا کہ آواز آئی۔

”موسیٰ! تمہارا منصب توبہ تھا کہ اس کو عظیم الٰہی کے سپرد کرتے اور کہتے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”اے اللہ! میں نے نادانگی میں یہ دعویٰ کر دیا۔ توبی بہتر جانتا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی اور ہے۔“

”تیرے قریب ہی ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے پاس وہ علم ہے جسے تو نہیں جانتا۔“

یہ سنتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام بے چین ہو گئے۔

”میرے مالک! تو نے یہ بتا کر مجھے بے چین کر دیا کہ میرے قریب ہی ایک ایسا شخص ہے جو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ مجھے بتا کہ میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟“

”ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے اس بندے سے ملو تاکہ تمہارے اندر چھپا ہوا غرور ختم ہو اور تم جان لو کہ ہم نے جس کو جو مناسب سمجھا اسے دیا۔“

”میں نہایت عاجزی اور شرمندگی سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے بتا، میں اس مرد صالح سے کہاں مل سکتا ہوں۔“

”وہ شخص تجھے اس مقام پر ملے گا جہاں دوسند راہیں میں ملتے ہیں۔ تم اپنے توشہ دان میں ایک پھلی رکھ لو اور جنوب مغرب کی طرف ردائے ہو جاؤ۔ چلتے چلتے کھٹکی کا راستہ طے کرنے کے بعد تم دو پانیوں کی جگہ پہنچ جاؤ گے۔ وہاں تم دم لینے کے لیے رک جانا اور جب تمہیں اتر جائے تو کنارے کنارے چلنا شروع کر دینا۔ جب تمہارے توشہ دان میں رہی ہوئی پھلی تمہارے سامان سے نکل کر پانی میں چلی جائے تو سمجھ لیتا منزل آگئی۔ تم وہیں رک جانا اور اس شخص کا انتظار کرنا۔ تمہیں اس کو



## شک

بابر اعوان

کیسی کبھی زندگی کے کچھ خاص دن دل پر اترنے گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی پہلو سے پوری جزئیات کے ساتھ یاد رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی واقعے کے کچھ یادگار حوالے ہیں جب زندگی کے گرد قص اجل جاری تھا اور کوئی رستہ فراہم کاممکن نہیں تھا لیکن انہیں ناممکنات میں سے کچھ ممکن لمحات بھی اپنا کام کر گئے... اور ایک ذرا سے شک نہ کسی کی زندگی کا پورا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

ایک ایماندار پر جوش پولیس آفیسر کی باریک بین نگاہوں کا کمال



پولیس ٹریننگ کے دوران ہی میرے انٹرکریک چھوٹی چھوٹی چیز نگاہوں نے میری غیر معمولی ذہانت کو جانچ لیا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا۔ ستر سال کی عمر ہونے کے باوجود اس کی صحت قابل رشک تھی۔ دراز قد، چاق و چوبند، کمرتی جسم کا مالک، ہمارا یہ انٹرکریک، روزانہ صرف ایک سمیٹے کا کیکچر دے کر غائب ہو جاتا تھا اور پھر دوسرے دن کلاس روم میں مقررہ وقت پر ہی نظر آتا۔ اس کی زبان کرخت تھی لیکن سراغ رسانی اور گفتیش کے موضوع پر اس طرح بات کرتا کہ اس سے ٹریننگ کے بعد شاگرد... مملی زندگی میں جا کر ان شعبوں میں بڑی مہارت حاصل کر لیتے تھے۔ میں نے خود اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ سب سے زیادہ کارآمد سبق وہ یہ تھا کہ ”مستقل مزاجی سے محنت جاری رکھو... شک ذرا سا بھی ہو، اسے نظر انداز نہ کرو۔ شک باپ پر بھی ہو تو اسے بھی شامل گفتیش کر لو۔ تمہاری ساری ہمدردی مظلوم کے لیے ہو۔“

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب میں بطور اسے اس

تلاش کرنا نہیں پڑے گا۔ وہ شخص خود تمہارے پاس آئے گا۔ تمہارا دل کو ای دے گا کہ یہی وہ مرد صالح اور دانا شخص ہے جس کے پاس تمہیں بھیجا گیا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بتا کر اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔ اب انہیں روانہ ہونا تھا اور اس طرح کہ کسی کو اس سفر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ اسکیلے جانے سے چھپکا بھی رہے تھے۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد اپنے غلیلہ یوشع بن نون کو طلب کیا اور انہیں سارا ماجرا سنایا۔

”میں جانتا ہوں اس سفر میں تم میرے ساتھ چلو۔ تم سے رازداری کی امید رکھ سکتا ہوں۔ تم یہاں بھی کسی سے کچھ نہ کہنا اور وہاں جا کر بھی خاموش رہنا۔“

یوشع بن نون نے سامان سفر تیار کیا اور ایک بھنی ہوئی مچھلی بھی اپنے ساتھ رکھ لی لیکن یہ سوچ ضرور رہے تھے کہ بھنی ہوئی مچھلی آخر کس طرح رازداری کی کرے گی۔

جب سامان سفر تیار ہو چکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام، یوشع بن نون کے ساتھ اس نامعلوم سفر کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ وہ جنوب مغرب کی سمت سفر کر رہے ہیں۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کتنی دنوں کا سفر طے کرنے کے بعد ختم ہوگی اور دو پانیوں کے ملاپ سے خداوند تعالیٰ کی کیا مراد ہے۔ کون سے دو سمندر ہوں گے جو کسی مقام پر آپس میں ملتے ہوں گے۔

سفر دشوار گزار تھا لیکن منزل تک پہنچنا بھی ضروری تھا۔

کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ دونوں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بحیرہ روم اور بحیرہ احمر آپس میں ملتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام کو غور سے دیکھا۔

”یوشع! شاید یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کے لیے مجھے کہا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہمیں یہاں سے کنارے کنارے سفر کرنا ہوگا۔“

”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میرا بھی ٹھنسن سے برا حال تھا۔ میں آپ سے کہ نہیں سکا لیکن دل ہی چاہتا تھا کہ یہاں کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔“

انہوں نے وہ تھملا ایک طرف رکھ دیا جس میں مچھلی تھی اور ایک پتھر کو کھینچ کر لیت گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ایک پتھر کو کھینچ لیا۔

”ایسا نہ ہو کہ ہم پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور کوئی تھملا اٹھا کر چلتا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

”یا اللہ کے رسول، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کوئی انسان تو کیا کوئی جانور بھی دور دور تک نہیں۔ تھملا کون اٹھائے گا۔“

”پھر بھی ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ تم ایسا کرو، لینے وقت تھیلے پر ہاتھ رکھ لو۔“

حضرت یوشع اس طرح لیت گئے کہ ان کا ایک ہاتھ تھیلے پر تھا۔

دونوں اتنا تھکے ہوئے تھے کہ لینے ہی نیند آگھموں میں اتر آئی۔ نہ جانے کتنی دیر سوئے رہے تھے کہ حضرت یوشع کو نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے ہاتھ کو تھیلے سے ہٹایا ہو۔ وہ کچھ دیر اسے خواب سمجھتے رہے لیکن پھر اچانک مچھلی کا خیال آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

انہی دیر میں ایسا ہوا کہ ان کے اٹھنے کے بعد مچھلی میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور وہ تھیلے سے نکل کر سمندر میں چلی گئی۔ مچھلی پانی کی جس سطح پر بہتی ہوئی تھی اور جہاں تک گئی، وہاں کے پانی نے برف کی طرح جم کر پگھلنے لگی کی شکل اختیار کر لی تھی معلوم ہوتا تھا سمندر میں ایک گھیری کھج تھی ہے۔ حضرت یوشع نے یہ منظر دیکھ لیا اور اکتفا کرنے لگے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوں تو انہیں یہ واقعہ سنایا جائے۔

(جاری ہے)

## ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن، قصص الانبیاء، ابن کثیر، توریت،..... ارض القرآن، سلیمان ندوی، ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد، انبیائے قرآن، جمیل احمد.



آئی تعینات ہو کر منظر گڑھ کے ایک چھوٹے سے قہانے میں روانہ ہو رہا تھا تو..... اس بوڑھے انسپکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”جلال! دیکھو..... یہ جسم کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے بچے! اگر زندگی میں بھی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو بھی اولیت نہ دینا۔ اس پر گنگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات بھی نہ بھی اپنی موت مر جاتے ہیں..... لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ ہے..... اسے بھی رشوت خوری، نا انصافی اور ظلم سے داغدار نہ ہونے دینا..... ورنہ ہمیشہ جہنم کا ایندھن بن جاؤ گے..... تمہارا ضمیر خوش قسمتی سے زندہ ہے۔“

بوڑھے انسپکٹر نے کتنی خوب صورتی سے آسان لفظوں میں یہ کلمہ سمجھا دیا تھا..... اور میں نے بھی اپنی اسناد کی اس بات کو نہ بھلا دیا۔

پولیس اسٹیشن میں پہنچ کر جرم و سزا کے کئی کیس میرے سپرد کیے گئے جنہیں میں نے بخوبی نشاں اور خال خال مجرموں کو گھبرا کر وارنٹ پھنچایا..... جس کے نتیجے میں چند سالوں میں ہی مجھے ترقی دے کر انسپکٹر بنادیا گیا۔

بہاری آمد آمد تھی۔ بادل اچانک ہی اٹھ آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے..... جیپ کی وینڈا سکرین دھندلا گئی، کیونکہ کئی کئی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔

قہانے سے شریک کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ بارش تھم چکی تھی۔ کانسٹیبل شریف پچھلی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس دوران اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا جبکہ میں اور میرا اسسٹنٹ، سب انسپکٹر راجا یونس ملک آپس میں بات کرتے آئے تھے۔

”ایسی بی صاحب کو ایسی کوئی پریشانی آ پڑی کہ صبح صبح ہی دفتر حاضر کر لیا؟“ راجا یونس نے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی اہم معاملہ لگتا ہے..... ورنہ توکل ہی میں ایسی بی صاحب سے مل کر گیا تھا۔“

کانسٹیبل کو جیپ میں چھوڑ کر ہم دونوں ایس بی صاحب کے آفس پہنچے تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے مگر ایس بی صاحب ابھی تک اپنی سیٹ پر براجمان نہیں ہوئے تھے۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد طاہر وقار صاحب ہاتھ میں ایک سفید رنگ کی فائل لیے دفتر میں داخل ہوئے تو ہم نے کھڑے ہو کر سیلیوٹ کیا۔

وہ فائل ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

”انسپکٹر جلال! اس فائل میں ایک عورت کی درخواست ہے۔ اس کا جوان بیٹا دو مہینے پہلے اینٹوں کے بھٹے کی آگ میں گر کر جل مرا تھا۔“

میں نے دیکھا کہ اس درخواست پر کسی بڑے آفسر کے ریمارکس یا حکم لکھا ہوا نہیں تھا۔ ایسی آئی پولیس نے بھی درخواست پڑھ لی تھی اور اس کے ہاتھ پر فٹنٹس کی پڑ گئی تھیں۔ ایس بی صاحب نے ہماری پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا کہ یہ درخواست اسے براہ راست ایک معزز شخص نے دی ہے۔ ”یہ عورت پولیس چوکی پر جاتی رہی ہے۔ اسے شک ہے کہ اس کا بیٹا خود بھٹے کی آگ میں نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا ہے۔ چونکہ انچارج نے اسے متعلقہ قہانے تک پہنچنے ہی نہیں دیا اور اس عورت کو یہ کہہ کر تارباک وہ فٹنٹس کر چکا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کا بیٹا اتفاقیہ جلتے ہوئے بھٹے میں گر تھا۔“

چائے پینے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور سیلیوٹ کر کے باہر نکل آئے لیکن ایس بی صاحب بھی دفتر سے باہر نکلے اور ہمیں چند ہدایات دیتے ہوئے بولے۔ ”انسپکٹر جلال اور سب انسپکٹر پولس! یہ بات یاد رکھنا کہ لوگوں کی عزت و آبرو، جان اور ان کے گھروں کی حفاظت کی ذمہ داری ہمارے گھنے پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ واردات ہو جائے تو محرموں کو پکڑنے کے لیے تانکے کے میز قرار گھوڑے کی طرح کام کرو۔“

جس معزز شخص نے ایس بی طاہر وقار کو یہ درخواست دی تھی، اس کا تعلق ہائی کورٹ سے تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کی معرفت ایس بی صاحب سے ملاقات کی تھی۔ اس کا یہ دوست بھی ڈی ایس بی کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ اس نے ایس بی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ بھٹے کے مالک کو ذاتی طور پر جانتا ہے اور وہ بھی اس نوجوان کی موت کو مشکوک سمجھتا ہے۔ دفتر نے درخواست رکھی۔

چلتے چلتے ایس بی طاہر وقار صاحب نے بتایا۔ ”میں نے چونکہ انچارج تھا تین دنوں پر بات کی ہے۔ اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ شک سا ہو گیا ہے، تم دونوں باقاعدہ فٹنٹس کرو..... یہ مت دیکھنا کہ یہ عورت غریب ہے یا امیر..... اور کون کیا ہے؟ اگر چونکہ انچارج تھا تین دنوں پر اسے کوئی بات کی ہے یا بغیر..... فٹنٹس اسے اتفاقیہ موت لکھ دیا ہے تو اسے گرفتار کر کے مجھے خبری ری رپورٹ دو۔“

قہانے پہنچ کر ہم نے فٹنٹس کا باقاعدہ پلان بنایا۔ اس وقت شام کے سات گھرے ہو رہے تھے۔ چونکہ ہمارے

پولیس اسٹیشن سے چودہ پندرہ کلومیٹر دور تھی۔ چند مسلح سپاہی جیپ میں بیٹھ چکے تھے کہ فون کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے ریسپونڈ اٹھایا۔ دوسری طرف ایس بی صاحب تھے۔ ”انسپکٹر جلال! اسپیکر سرائے میں نے کہا تو وقار صاحب نے کہا۔“

”جلال! میں نے آئی جی پولیس سے آرڈرز لے لیے ہیں..... بے فکر ہو کر فٹنٹس کرو..... اور اگر کوئی گھمبیر مسئلہ درپیش آئے تو فوراً مطلع کرو۔“

”اوکے سرائے! میں نے کہتے ہوئے ریسپونڈ کر دیا۔ رات نو بجے ہم اس پولیس چوکی پر پہنچے جس علاقے میں اینٹوں کا ڈھ بھٹا تھا، جس کی آگ میں جل کر ایک نوجوان مر گیا تھا۔ قائد ار شرافت خان لاہور کا رہنے والا تھا اور دو سال سے اس چوکی پر رائج کر رہا تھا۔ شرافت خان ایک تجربہ کار تھانیدار تھا۔ اس کے خاندان کی پوزیشن بہت اچھی تھی اور یہ اثر رسوخ والا خاندان تھا۔

ہمیں اپنی پولیس چوکی کے احاطے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہمارے استقبال کو دوڑ آیا اور اپنے دفتر لے گیا۔ میں نے اسے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”اس عورت نے تو میرا نام میں دم کر رکھا ہے۔“

شرافت علی خان نے کہا۔ ”وہ بیچاری اپنی جگہ بچی ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ وہ کسی کے خلاف بھی درخواست دے سکتی ہے۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اب لگتا ہے وہ اوپر تک پہنچ گئی ہے اور آپ صاحبان کو زحمت دی ہے۔“

”ماں تو مطمئن نہیں ہوگی.....“ میں نے کہا۔ ”آپ ہمیں مطمئن کر دیں۔ آپ نے جو فٹنٹس کی ہے وہ فائل دکھا دیں اور زبانی بھی بتائیں کہ یہ کیا معاملہ ہے؟“

وہ فائل لے آیا، جس میں اس نے تحقیقات کی کارروائی لکھی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں شخص اس کے پاس یہ رپورٹ لے کر آیا کہ اس کا ایک ملازم جلتے ہوئے اینٹوں کے بھٹے میں پاؤں پھسلنے کی وجہ سے گر پڑا اور مر گیا ہے۔

پھر اس نے لکھا تھا کہ وہ موقعہ واردات پر پہنچا اور لاش دیکھی جو ناقابل شناخت حد تک جل چکی تھی۔ پھر اس نے تین آدمیوں کے بیان لیے تھے۔ سب نے کہا کہ متوفی پاؤں پھسل جانے سے آگ میں گر پڑا۔ اس طرح اس تھانیدار نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے اس سانحے کو اتفاقی حادثہ.... قرار دے دیا۔ پھر اس نے زبانی معلومات سے آگاہ کیا۔

کلی بات یہ معلوم ہوئی کہ متوفی جمال احمد بڑے ماں کا بیٹا تھا۔ اس نے تین سال پہلے میٹرک پاس کیا تھا اور اس بھٹے کے مالک میر حسن کے پاس ملازمت اختیار کر لی۔ میر حسن ٹھیکیدار تھا۔ وہ تعمیراتی کام کرتا تھا، گورنمنٹ سکول ٹیکسٹ اور سیلار بھی تھا اور اس کا یہ بیٹا ”میر حسن برکس“ بھی تھا جہاں اینٹیں بنی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد تعمیراتی کام بہت بڑھ گیا تھا۔ ٹھیکیدار میر حسن کے وارے نیارے ہو گئے۔ مال آتا شروع ہوا تو اس نے ایک بہت بڑا بنگلا بنالیا۔ نئی چیمبرائی گاڑی بھی خرید لی اور بینک میں بھی اس کی کافی رقم محفوظ کی۔

”کیا متوفی جمال احمد بھٹے پر ملازم تھا؟“ سب انسپکٹر یونس ملک نے پوچھا۔ ”اگر بھٹے کا ملازم تھا تو اس کے ذمے کیا کام تھا؟“

شرافت علی خان نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، البتہ یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ بھٹے کا ملازم تھا۔“

”آپ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا؟ ہو سکتا ہے مرنے والے کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو اور اسے دھوکے سے بھٹے کی آگ میں دھکا دیا گیا ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں نے فائل میں تو نہیں لکھا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن معلوم کیا تھا کوئی دشمنی کا اشارہ نہیں ملا۔“

میں نے نوٹ کیا کہ شرافت علی خان نے یہ جواب دیا تو اس میں وہ خود اعتمادی اور بولنے کے انداز میں پہنچ گئی تھی، جو اس کے لہجے اور انداز میں پائی جاتی تھی۔

”شرافت بھائی!“ میں نے کہا۔ ”ہم فٹنٹس کے لیے آئے ہیں۔ اگر کوئی شک شیعہ والی بات ہے تو ہمیں بتادیں۔“

شرافت خان کچھ بے چینی سا ہو گیا۔ میرے ساتھ سب انسپکٹر یونس بھی تھا اس لیے میرے ساتھ وہ بے تکلفی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بہر حال ابھی کوئی رائے قائم کرنا قفل از وقت تھا..... جانے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی شرافت خان کی طرف سے منگوائے گئے تھے۔

میں نے اور پولیس نے جانے پر ہی اتفاق کیا تھا۔ ریفریجسٹ کے بعد میں نے شرافت خان سے کہا کہ وہ ہمیں اس عورت کے گھر پہنچا دے جس کا بیٹا جل کر مر گیا تھا۔ اس کا بیڑہ ریس تو فائل میں تھا مگر اسے بڑے قصبے میں کسی کا گھر تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ شرافت علی نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ معلوم ہوا کہ صرف یہ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا جو اس عورت کے گھر سے واقف تھا۔



"ایک کام کرنا شرافت خان!" میں نے چوکی اٹھارے سے کہا۔ "ٹھیکیدار میر حسن کو اطلاع دے دو کہ وہ چوکی پر آ جائے، ہم وہاں چوکی میں ہی آئیں گے۔"

ہینڈ کاشیٹیل ہمیں اس عورت کے گھر کے باہر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ دروازے پر دستک دی تو تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ اندھیرا گہرا ہونے کی وجہ سے لڑکے کی شکل واضح نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا اور پولیس کا تعارف کرایا اور لڑکے سے کہا کہ اندر جا کر کہو کہ آپ نے جو درخواست دی تھی، ہم اس سلسلے میں آئے ہیں۔ لڑکا فوراً اندر چلا گیا اور دو منٹ بعد ہی ایک اوجڑ عمر عورت باہر آگئی۔ اس کے ذیل ڈول سے پتا چلتا تھا کہ وہ مل کلاس کی معزز عورت ہے۔

وہ ہمیں اندر لے گئی۔ شکل صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کی خوب صورتی باقی تھی۔ جولا کا باہر آیا تھا، وہ بھی خوب صورت تھا۔ عورت کے چہرے پر اداسی تھی۔ مل کلاس کا یہ گھرا چھا اور صاف ستھرا تھا۔ عورت نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ ہمارے منہ بند کرنے کے باوجود وہ چاہے بنا کر لے آئی۔

عورت کا بیان شروع ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اپنے بیٹے جمال کو یاد کرتی رہی۔ اس کا ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا، جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ ہماری دستک پر بھی لڑکا باہر نکلا تھا۔ اس عورت کے شوہر کو فوت ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس کا ایک بھائی اسے کچھ پیسے دے جاتا تھا۔ یہ مکان اس کا اپنا تھا۔ جمال احمد اس کا بڑا بیٹا تھا جسے اس نے میٹرک تک پڑھا کر ٹھیکیدار میر حسن کے پاس ملازم رکھوا دیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بیٹا بھی نہ رہا۔ عورت نے اپنا نام خالدہ بتایا تھا۔

"آپ یہ بتائیں۔" میں نے پوچھا۔ "آپ کو یہ شک کیسے ہوا ہے کہ آپ کے بیٹے کو دھکا دے کر آگ میں گرایا گیا تھا؟"

"میرا بیٹا جمال ہر رات خواب میں آتا ہے۔" خالدہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "ہر رات ایک ہی بات کہتا ہے کہ میرے قاتلوں کو پکڑو، میں خودکشی کر رہا تھا۔"

"کیا وہ یہ نہیں بتاتا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جس!" خالدہ نے جواب دیا۔ "میں پوچھتی ہوں تو بھی نہیں بتاتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خود آگ میں جیس کر۔" یہ تو ماں کے جذبات تھے، جن کا اظہار وہ اس طرح

کر رہی تھی کہ اس کا بیٹا ہر رات اسے خواب میں ملتا ہے۔ میں نے یاپولیس نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ یہ اس کا وہم ہے اور اس کے جذبات ہیں۔ میں اس وقت تک قتل کی شے بار بار دوا توں کی تفتیش کر چکا تھا اور ایسی بہت سی مامیں میرے سامنے آئی تھیں، جن کے جوان بیٹے قتل ہو گئے تھے، وہ سب ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔

ہم دونوں پولیس آفیسر، اس کے جذبات کا ساتھ دیتے رہے اور اسے یہی تاثر دیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ہم حقائق معلوم کرنا چاہتے تھے تاکہ قاتل کو پکڑ سکیں۔

یہ میرا تجربہ تھا کہ بعض اوقات حادثاتی موت، جس کے متعلق ڈاکٹر یا اور کوئی یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ موت اتفاق یا قدرتی ہے..... وہ قتل کی واردات نکلتی ہے۔ اس لڑکے کی موت بھی قتل کی واردات ہو سکتی تھی۔ ہم نے خالدہ سے حقائق معلوم کرنا شروع کیے۔

"وہ کہنے پر کیا کام کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "میرا بیٹا، کہنے پر ملازم نہیں تھا۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "ٹھیکیدار کا کلرک یا فٹنی کہہ لو۔ ٹھیکیدار کے گھر بھی جاتا تھا اور گھر کی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ پوری کرتا تھا۔ ایک ڈیوٹی اس کے ذمے اور بھی تھی..... ٹھیکیدار میر حسن کی بیٹی کا کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے لیے باپ نے انجیل تاکا لگوا دیا ہوا ہے۔ میرا بیٹا جمال صبح اس لڑکی کے ساتھ کالج تک جاتا تھا اور چھٹی کے وقت کالج سے اسے گھر لاتا۔ ٹھیکیدار اس کام کی اسے الگ تنخواہ دیتا تھا۔ پانچ چھ دنوں سے وہ کہنے پر جا رہا تھا کیونکہ کہنے کا منشی چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا اور جمال نے کہنے پر حساب کتاب کرنا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا....." میں نے کہا۔ "کہ ٹھیکیدار کو آپ کے بیٹے پر بہت ہی اعتماد تھا۔"

"جی ہاں۔" خالدہ نے کہا۔ "یہ اعتماد کی ہی بات تھی کہ میر حسن میرے بیٹے کو اپنی بیٹی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ ٹھیکیدار میر حسن ہمارا دور کار شیٹے دار بھی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے میر حسن کا ایک بیٹا تھا جس کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اتنے مکان بننے ہی کہاں تھے۔ ہندو اور سکھ مکان بناتے تو ہندوؤں اور سکھوں کے بھنوں سے ایشیائیں لیتے۔ جنگ شروع ہوئی یعنی پاکستان بنا تو میر حسن کا بیٹا بھی چل پڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا ٹھیکیدار بن گیا اور دولت اس کے گھر کی غلام بن گئی۔ کار، گاڑی، بینک پولیس اور لوکر چاکر سب کچھ اسے میر ہو گیا۔ میرا خاندان فوت

ہو گیا تھا۔ میر حسن نے میرے ساتھ یہ بھڑکی کی کہ جمال کو اپنے ہاں ملازمت دے دی کیونکہ اس وقت وہ میٹرک پاس کر چکا تھا اور وہ اسے اچھی تنخواہ دینے لگا۔ حادثے کے بعد جمال جل کر فوت ہو گیا تو ٹھیکیدار میر حسن نے مجھے تیس ہزار روپے پیش کیے تھے مگر میں نے رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میں اپنے بیٹے کی قیمت نہیں لوں گی۔"

"آپ کو ٹھیکیدار پر تو شک نہیں ہوگا؟" راجا پولیس ملک نے پوچھا۔

"اس پر تو شک نہیں ہونا چاہیے۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "لیکن میر حسن کے خلاف مجھے شکایت ضرور ہے۔" "وہ کیا؟" میں نے فوراً پوچھا۔ "میں نے رقم قبول نہیں کی۔" خالدہ بولی۔ "بلکہ میں نے اسے کہا کہ مجھے تھانے لے چلو، کیونکہ مجھے شک ہے کہ میرے بیٹے کو آگ میں زبردستی جلا دیا گیا ہے۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ ایسے فضول شک نہ کرو۔ سب کہتے ہیں کہ تمہارا بیٹا بھل کر گرا تھا۔ میں نے کہا کہ میں خود تھانے چلی جاؤں گی..... میر حسن نے پھر مجھے سجھایا بجھایا اور چالیس ہزار روپے کی رقم پیش کی، جو میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ٹھیکیدار کو کھسکا دیا اور وہ کہنے لگا کہ تم خود بھی خراب ہو گئی اور مجھے بھی خراب کر دی۔" اس نے یہ بھی کہا کہ تم اس ضد سے باز نہ آئیں تو دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ چھوٹے بیٹے کو میٹرک پاس کر لینے دو، میں اسے جمال کی جگہ اپنے پاس رکھ لوں گا۔"

"ایک بار پھر سوچ لیں۔" میں نے تکی سے کہا۔ "اگر آپ کو ٹھیکیدار پر شک ہے تو ہمیں صاف صاف بتائیں۔" "میر حسن پر شک کی کوئی وجہ نہیں۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "اتنے امیر کبیر آدمی کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسے تو جمال پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی جوان بیٹی کو میرے بیٹے کے ساتھ بھیجا کر رہا تھا۔"

"یہ بھی دشمنی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے خاتون!" میں نے کہا۔ "اس کی لڑکی جوان ہے اور آپ کا بیٹا بھی جوان تھا۔ ہو سکتا ہے ان دونوں میں ایسی بے تکلفی ہو، جس کا میر حسن کو پتا چل چکا ہو۔"

"میں یہ نہیں مان سکتی۔" خالدہ نے کہا۔ "میرا جمال اتنا ہوشیار اور چالاک نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ٹھیکیدار مجھ سے گھر کرتا اور جمال کو نوکری سے بھی نکال دیتا۔ ہمارے لیے یہی سزا کافی تھی۔"

ٹھیکیدار میر حسن نے خالدہ کو تیس ہزار کی رقم پیش کی

تھی اور پھر یہ رقم چالیس ہزار کر دی۔ خالدہ نے یہ رقم قبول نہ کی اور وہ تھانے چلی گئی۔ تھانیدار شرافت علی خان نے اس سے کہا کہ اسے شک ہے تو کوئی گواہ ساتھ لائے اور اپنا شک ثابت کرے۔

ہم جاننے ہیں کہ پولیس والے ایسی بات اس صورت میں کرتے ہیں جب وہ کسی کو گناہ چاہتے ہوں۔ جبکہ خالدہ کے پاس ایک شہادت اور دو بیٹی ایک جوت تھا کہ اس کا بیٹا خواب میں اس سے کہتا تھا کہ وہ آگ میں خود نہیں مگر ایک اسے گرایا گیا تھا۔

دو بیٹے مگر گئے۔ جمال کا چالیسواں ہوا تو میر حسن ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ خالدہ دو تین مرتبہ پھر تھانے چوکی گئی۔

جس آدمی نے اس کی درخواست ایس بی طاہر وقار صاحب تک پہنچائی تھی، وہ اس کے شوہر کا دوست تھا۔ ایک روز یہ خالدہ کے گھر گیا تو خالدہ نے اسے اپنے شک کے بارے میں بتایا۔

اس غمزدہ ماں سے ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی، جس سے کوئی شک واضح ہوتا۔ صرف ایک بات ایسی تھی جو مجھے مشتبہ کر رہی تھی اور وہ یہ کہ جمال ٹھیکیدار کی بیٹی کو کالج لے جاتا تھا اور پھر واپس بھی لاتا تھا۔

جس شخص کو چانگ دولت مل جائے اور اس سے پہلے اس نے بھی اتنی دولت نہ دیکھی ہو تو اس کا اپنا داغ خراب ہو یا نہ ہو، اس کی اولاد کا لازمی خراب ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ میر حسن کی یہ بیٹی اخلاقی لحاظ سے کیسی ہے؟ رات کے بارہ بج رہے تھے جب میں اور پولیس اسی مسئلے پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے چوکی چلے گئے۔

ٹھیکیدار میر حسن تھانیدار شرافت خان کے پاس بیٹھا تھا..... وہ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر کا آدمی تھا۔ شکل صورت سے معزز لگتا تھا۔ وہ جس طرح ہم سے ملا، میری رائے میں وہ شاندار اور مہذب آدمی تھا یا پکا استاد تھا اور ہر ذہنک سے کمیلنا جانتا تھا۔ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میر حسن کو کہنے پر لے جائیں گے۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ صبح دو بجنے پر ہمیں ملے۔ رات کافی ہو چکی تھی اور ہمیں آرام کی سخت ضرورت تھی۔ شرافت خان نے پہلے سے ہی ایک کمرے میں میرے اور میرے ماتحت سب انسپکٹر پولیس ملک کے لیے بستر لگا دیے تھے اور باقی محلے کو دوسرے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ پولیس چوکی سے جتنا تقریباً یاں گلو میٹر دور تھا۔ جو منی



ہماری جیب بھرنے پر پہنچی میر حسن روڑتا ہوا ہمارے استقبال کے لیے لپکا۔

ایک کھلی سی جگہ پر میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ہمارے ناشتے کا پر تکلف اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم اس جگہ پر گئے، جہاں سے جہاں آگ میں گرا تھا۔ پچھلے کی جگہ کو لائی کے بجائے لیوڑے انداز کی خندق ہوتی ہے جس میں جکی ایشیں ایک خاص ترتیب سے جوڑی جاتی ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ایک ترتیب میں ڈھیر سا بن جاتا ہے۔ ڈھیر کے درمیان ایک خاص فاصلے پر جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ کونسلے، گٹھیاں یا جلنے والی اشیاء رکھ کر انہیں آگ لگا دی جاتی ہے پھر اس ساری خندق کو اوپر سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں آگ جل رہی ہو، وہاں اوپر لوہے کے ڈھکن رکھ دیے جاتے ہیں اور ایک جگہ جچی رکھ کر ادھر ادھر سے بانٹھ دی جاتی ہے۔ اس سے تمام بھنے کا دھواں باہر نکلتا ہے۔

ٹھیکیدار میر حسن نے ہمیں وہ جگہ دکھائی، جہاں سے جہاں پھسل کر آگ میں گرا تھا۔ میں نے اور پولیس ملک نے بھنے کے کنارے کو غور سے دیکھا۔ میں نے پولیس کی جانب اور اس نے میری طرف دیکھا کیونکہ وہاں پھسلنے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر ہم نے میر حسن کو اپنے رد عمل کا احساس نہیں ہونے دیا۔ آپ ایک دس فٹ گہری خندق کا تصور ذہن میں لائیں۔ اس میں آگ جل رہی ہے۔ خندق کے قریب جاؤ تو جش اتنی زیادہ ہوگی کہ آپ اس کے کنارے تک جانے کی ہمت نہیں کریں گے۔

بھنے کی آگ تو خاصی تیز ہوتی ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ جہاں کنارے تک چلا گیا تھا۔

”کیا وہ لپکا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ میر حسن نے جواب دیا۔ ”مزدور بہت ہیں، اس لیے میں نے ان پر ایک میٹ مقرر کر رکھا ہے، جو انہیں سنبھال سکتا ہے۔“

”کیا اس وقت آپ بھی یہاں موجود تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ باتیں میٹ نے بتائی تھیں۔“

”اور آپ نے اس کی ہر بات سچ مان لی؟“ میں نے کہا۔ ”تھانے چوکی میں آپ نے کیا رپورٹ دی تھی؟“

”مجھے کہ میرا ایک ملازم آگ میں گر کر جل گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آپ کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ آپ کے اس ملازم کو کسی نہ کسی وجہ سے آگ میں گرایا گیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی۔“ میر حسن نے کہا۔

”اس پکارے کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ اسے اس بھنے پر آئے چارہ دیں ہوئے تھے۔“ پولیس ملک نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ٹھیکیدار کا میٹ بھی وہیں تھا۔ ہم نے اسے صرف دیکھا، لیکن اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہاں پھسلنے والی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کونویں میں آدی جبکہ کر دیکھ لیتا ہے کیونکہ اس میں آگ نہیں، پانی ہوتا ہے لیکن بھنے کی اتنی تیز آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مزدور چلے گئے تھے۔ میٹ وہیں تھا اور دو چوکیدار بھی گئے تھے۔ ہم نے ٹھیکیدار میر حسن سے کہا کہ وہ رات دس بجے میٹ کو ساتھ لے کر بی ڈویژن پولیس اسٹیشن پہنچ جائے۔

رشتہ خوری اور ناقص سفارش کے میں ہمیشہ خلاف رہا ہوں۔ جب سے میں نے اس پولیس اسٹیشن کا چارج سنبھالا تھا، بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور میرا تمام عمل اس بات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جتنے بھی کیسوں میں ہاتھ ڈالا، کامیاب رہا۔ اس کیس کی ایک کڑی۔۔۔ میرے ہاتھ لگ چکی تھی، مگر یہ سب کچھ مل از وقت تھا۔

میں اور پولیس ملک وہاں سے ایک ٹک لے کر اپنے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ ہم نے انہیں دس بجے کا وقت دیا تھا اور ہم ایک گھنٹہ تاخیر سے آئے۔ یہ میرا طریقہ تھا۔ مشترکہ افراد کو میں کئی گھنٹوں انتظار میں رکھتا تھا تا کہ وہ ذہنی طور پر نڈھال ہو جائیں۔ پہلے میں نے ٹھیکیدار میر حسن کو بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر اس سے چند سوال کیے جن کے جواب میں اس نے وہی باتیں بتائیں جو جہاں کی والدہ بتا چکی تھی۔

”جناب انسپٹر صاحب۔“ میر حسن نے کہا۔ ”مجھے اس لڑکے جہاں کے مرنے کا اتنا زیادہ غم ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بے چارہ جیم تھا اور چھوٹے بھائی اور

یہ وہ ماں کا واحد سہارا بھی وہی تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس ذات نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں جہاں کو نوکری پر لگا کر خاصی زیادہ تنخواہ دیتا رہا۔ بڑا شریف اور قابلِ اعتماد لڑکا تھا، اس کی موجودگی میں مجھے حساب کتاب اور روپے

بچے کی طرف سے بے گھری رہتی تھی۔ میں اسے اپنی جوان بیٹی کے ساتھ کالج بھیج دیتا تھا اور وہی لڑکا میری بیٹی کو کالج سے واپس بھی لاتا تھا۔ خدا کی قسم! میں اس کی ماں کا سامنا نہیں کر سکتا۔“

اس نے اپنے بیان کا یہ حصہ روٹی صورت بنا کر مجھے سنایا۔۔۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی رو پڑے گا۔

”آپ نے اس کی والدہ کو تیس ہزار روپے دیے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ رقم اس نے نہیں لی، پھر آپ نے اس میں دس ہزار کا اضافہ کر دیا۔۔۔ اس نے یہ رقم بھی نہیں لی تو آپ نے اسے دو چوکی دی کہ تم دوسرے بھنے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔۔۔ آپ نے اسے یہ دو چوکی کیوں دی تھی؟“

”نہیں جناب انسپٹر صاحب!“ اس نے ذرا گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں نے خالہ کو ایسی کوئی دو چوکی نہیں دی، بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تمہارا دوسرا بیٹا میٹرک کر لے، تو میں اسے اپنے پاس اتنی ہی تنخواہ پر ملازمت پر رکھ لوں گا، جتنی تنخواہ پر جہاں کو رکھا تھا۔ اصل بات یہ ہے جناب! بے چارہ ماں ہے اور اس کا جوان بیٹا مر گیا ہے اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ اسے یہ ہے کہ اس کے بچے کو کسی نے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا تھا، بار بار کہتا ہے، چوکی کی طرف دوڑتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ہی اس کا والی وارث ہوں۔۔۔ اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے تھانے سے روکنے کے لیے کوئی سخت بات کہہ دی ہو۔ جسے اس نے دھکی سمجھا ہو، میں نے خود ہی پولیس کو اطلاع دے کر موقع پر بلا لیا تھا۔

تقاضیادار شرافت علی خان صاحب نے بڑی محنت سے تفتیش کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے ذہن میں یہ شک رکھ کر تفتیش کی تھی کہ کسی نے جہاں کو آگ میں دھکیلا ہوگا۔ جہاں بے چارے کو بھنے پر آئے ابھی چار دن ہی گزرے تھے، یہاں اس کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟“

”جہاں آپ کے گھر کیلوا کام کرتا تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ”پھر اسے آپ نے پھینک دیا؟“

”یہ ایک عارضی تبدیلی تھی۔“ میر حسن نے جواب دیا۔ ”مجھے کتنی چھ، سات دنوں کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ پیچھے جو میرے ملازم ہیں، وہ بیسیوں میں گویا گر دیتے ہیں چونکہ بھنے کی آمدنی ابھی خاصی ہے۔ بددیانت ملازم جتنے چاہے پیسے مار سکتا ہے۔ یہ فتنی جو چھٹی پر چلا گیا تھا ایسا عمار آدی ہے۔ میں نے اس کی جگہ جہاں کو بیچ دیا کہ یہ بھی اسی جیسا دیانت دار اور میرے گھر کا پائافرو ہے۔“

”کیا یہ فتنی پہلے کبھی چھٹی پر گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”شاید۔۔۔ مجھے۔۔۔ ہو سکتا ہے۔“ اس کی زبان ہلکتی پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ”میں یہ پوچھ کر بتاؤں گا۔“

اس سوال پر اس کا جڑ بول اس کے چہرے پر اور اس کے انداز میں ظاہر ہوا، وہ میرے لیے ایک واضح اشارہ تھا۔ میں نے اس فتنی کو بھی بلانے کا سوچ لیا تھا پھر میں نے میر حسن پر سوالوں کی اتنی بوچھاڑ کی کہ اس کی زبان لڑکھانے لگی اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ پہلے کیا کیا کہہ چکا ہے۔

میں فی الحال یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ جہاں کو اس کے عزم سے آگ میں پھینکا گیا ہے، لیکن میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ جہاں پاؤں پھسلنے سے آگ میں نہیں گرا، بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

”میر حسن صاحب!“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو براہ راست مشورہ دیتا ہوں۔ ابھی آپ کے پاس وقت ہے کہ آپ سچ بات بتا دیں تو آپ کے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔ اگر نہیں، دوسروں سے سچ بات معلوم ہوگئی تو پھر آپ نہیں جانتے کہ آپ کا انجام کیا ہوگا آپ سب کچھ جانتے ہیں ٹھیکیدار صاحب۔ یہ جان لو۔۔۔ کہ اس کیس کی تفتیش انسپٹر جہاں کر رہا ہے اور مجھے ایس بی کرائم برانچ اور آئی جی پولیس کی براہ راست حمایت حاصل ہے۔ ابھی تو آپ کے ساتھ باعزت طریقے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے مجبور نہ کریں اور حقیقت بتلا دیں، ورنہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

”آپ کے دل میں کیا شک ہے جناب انسپٹر صاحب؟“ ٹھیکیدار نے پوچھا۔

”شک نہیں ٹھیکیدار صاحب! یقین ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک یقین کو سامنے رکھ کر بات کر رہا ہوں۔

جہاں کو آگ میں گرایا گیا ہے اور اس کا آپ کو ابھی طرح علم ہے۔“

”لیکن حضور!“ اس نے کہیا نے سے انداز میں کہا۔ ”اس کی کوئی وجہ نہیں تو ہونی چاہیے۔“

”وجہ آپ بتائیں گے ٹھیکیدار صاحب!“ میں نے کہا۔ ”دولت کا فضا تا براہے کہ ذہن اور دل سے خدا کو بھی نکال دیتا ہے۔ ایک وجہ ہے کہ اس لڑکے نے آپ کی بیٹی سے دست دراز کی ہوئی یا آپ کی لڑکی اس لڑکے کے ساتھ قابلِ اعتراض حد تک بے تکلف ہوگئی ہوگی اور آپ نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا ہوگا۔“



میر حسن کو میری یہ بات بری محسوس ہوئی۔ ”آپ میری بیٹی کو ایسا بد چلن نہ سمجھیں۔“ وہ بولا۔ ”اور میں جمال کے بارے میں اور اس کے کردار کے متعلق بھی ایسی کوئی بات گوارا نہیں کر سکتا۔“

”پھر دوسری بات یہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا میٹ (نمبردار) اور کوئی دوسرا آدمی مجھے سے پیسے مارتے ہوں گے اور جمال ان کے لیے رکاوٹ بن گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی کو رگھے ہاتھوں پکڑ لیا ہو اور اسے چپ کرانے کے لیے ان لوگوں نے جمال کو آگ میں دھکیل دیا ہو۔؟“

”اس بارے میں..... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”ٹھیکیدار نے کہا۔“ میں خود بھی معلومات لوں گا اور آپ بھی تحقیق کریں۔“

”ٹھیکیدار صاحب!“ میں نے کہا۔ ”آپ سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی عزت قائم رہے۔ میں آپ کو کل شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اپنا برا بھلا سوچ لیں اور آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو وہ بتا دیں، اب آپ جا سکتے ہیں۔“

”ٹھیکیدار کے جانے کے فوراً بعد میں نے میٹ کو بلا دیا۔ وہ چھتیس سال کی عمر کے لگ بھگ تھا۔ اس نے اپنا نام اشرف بتایا تھا اور اچھو بھولا کے نام سے مشہور تھا۔ چھریں سے بدن اور مضبوط ڈیل ڈول والے، اچھو بھولا کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شریف آدمی نہیں ہے۔“

”تم کب سے مجھے پرکام کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً دس سالوں سے مجھے پر ہوں جناب!“

”ایک بات ذہن میں رکھ لو اچھو!“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جھوٹ بولو گے تو مجھ سے جاؤ گے۔ یہ دولت مند لوگ اپنے جرم اور گناہ اپنے ملازموں کے کھاتے میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ تمہارے ٹھیکیدار صاحب بھی کچھ ایسا ہی کرنے والے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے تو پہلے ہی بتا دو ورنہ..... ہمیں معلوم ہو گیا تو تم پھر ہمارے غٹھے سے نہیں نکل سکو گے۔ یہ بتاؤ کہ جمال کو ٹھیکیدار نے دوسرے کاموں سے ہٹا کر مجھے پر کیوں لگا دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے کاشی چھنی پر چلا گیا تھا۔“ اچھو بھولے نے جواب دیا۔

”کاشی کب سے مجھے پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سات، آٹھ سالوں سے وہ کاشی کے فراخس انجام دے رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ پہلے بھی چھنی پر گیا تھا؟ اور کب؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے۔“ اس نے سوچ کر کہا۔ ”تین سال پہلے وہ چھنی پر گیا تھا۔“

”کیا اس وقت بھی میر حسن نے کسی اور کو اس کی جگہ بٹھنے پر بھیجا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں عالی جاہ!“ بھولے نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔“

”مجھے پر کون شخص ایسا ہے جو پیسے مارتا ہے، یا بے ایمانی کرتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”کوئی بھی نہیں عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔

”باقاعدہ کیش میو جتنے ہیں، پیسے مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”پیسے تم مارتے ہو۔“ میں نے اسے ہنر کانے کے لیے جھوٹ بولا۔ ”اسی لیے ٹھیکیدار نے جمال کو مجھے پر بھیجا تھا۔“

”کیا یہ ٹھیکیدار صاحب کہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیکیدار صاحب تو بہت کچھ کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیکیدار نے صرف یہی ایک بات نہیں بتائی۔ وہ تمہاری اور حرمین اور کروت بھی بتا رہا ہے۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان دولت مند ٹھیکیداروں اور جاگیرداروں کی وفاداری بڑی خطرناک اور مشکوک ہوتی ہے۔“

”لوگ اسے گناہوں پر، پردہ ڈالنے کے لیے اپنے وفاداروں کو روں اور حزازوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ اگر تم کوئی بات دل میں چھپائے ہوئے ہو تو مجھے بتا دو۔“

”میں نے اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی دیکھی۔ میں نے کافی سوال کیے اور اس کے جوابوں پر اتنی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے بدلے ہوئے انداز اور چہرے کے تاثرات کو نوٹ کرتا رہا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں کوئی بات ضرور چھپی تھی، جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

عام طور پر بیٹھوں میں کافی مزدور کام کرتے ہیں اور ان مزدوروں کو کنٹرول کرنے کے لیے جو میٹ یا انجمن مقرر کیے جاتے ہیں، وہ بکے جرائم پیشہ اور غنڈے ہوتے ہیں۔

خاص کر بیٹھوں پر جی ایشیائی بنانے کے لیے پورا پورا کتبہ کام کرتا ہے، ان میں نوجوان لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ میٹ اور مالک ان کو مزدوری سے ہٹا دینے کی دھمکی دے کر اور کام کم کر دینے کا کبھہ کرنا جنس خراب کرتے ہیں۔

اخبارات میں آئے دنوں خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ بیٹھوں پر مزدوروں کے ساتھ نا انصافی، حقوق نشی اور ان کی عورتوں کے ساتھ جسی زیادتی ہو رہی ہے۔

ٹھیکیدار میر حسن کا یہ میٹ جس کا نام اچھو بھولا تھا، ایسے ہی بیٹھوں میں سے تھا۔ اس نے خود اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ غنڈہ اور بد معاش ہے۔ یہ رائے میری تھی جو میں نے اس کی باتوں اور اس کے انداز سے قائم کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اکیلا میٹ ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی ہے؟

اس نے بتایا وہ اکیلا ہے۔

میں نے اچھو کو تھا۔ نے میں رہی رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اگلے روز میرا ارادہ مجھے پر جا کر مزدوروں سے ملاقات کرنے کا تھا۔ اگر اچھو بھولا مجھے پر ہوتا تو مزدور اس کے ذریعے مکمل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔

دو گھنٹے بعد میں نے اچھو بھولا کو پھر بلا کر اپنے سامنے بٹھالیا اور کچھ سوال کیے۔ ”جمال، اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے کیا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ٹھیک شاک تھا عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔

”اپنے کام سے کام رکھتا تھا، اس لیے سب اس کی عزت کرتے تھے اور دوسرے وہ میر حسن صاحب کے دور کے رشتے داروں میں سے بھی تھا۔“ بھولانے جواب دیا۔

”ٹھیکدار کی بیٹی کے ساتھ جمال کا کیا جگر چل رہا تھا؟“ میں نے بھولانے سے چاہا تھا حالانکہ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کوئی جگر تھا بھی..... یائیں، میں اچھو کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ مجھے سب معلوم ہے۔

”میں اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا صاحب!“

بھولا نے جواب دیا۔ ”لڑکا ان کا اپنا تھا، ان کے گھر بھی جاتا تھا اور لڑکی کے ساتھ کالج بھی جاتا، آتا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں سنی۔“

”اور لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”لڑکی پردہ نشین ہے عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”برقعے میں کالج جاتی ہے اور گھر سے باہر نہیں نکلتی۔“

ایک اور بات صاحب! ٹھیکیدار صاحب کے اپنے خاندان کی عورتیں ہی نہیں بلکہ ان کی ساری رشتے دار عورتیں پردے میں رہتی ہیں اور صحیح معنوں میں شریف عورتیں ہیں۔

ٹھیکیدار صاحب کو اچانک دولت مل گئی تو انہوں نے شراب چینی شروع کر دی اور دوسری عیاشیوں میں پڑ گئے لیکن ان کی عورتیں جیسے پہلے تھیں ویسی ہی اب ہیں۔“

”جمال جب مجھے میں گرا، اس وقت تم اس کے ساتھ تھے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے آگے جانے سے روکا نہیں تھا؟“

”ہاں عالی جاہ!“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے روکا تھا لیکن پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پاؤں ایسا بھٹسا کہ مگر پڑا اور چل گیا۔ میرا خیال ہے، اسے مجھے کی آگ دیکھنے کا شوق تھا۔“

”یہ شمار سوال و جواب کے ذریعے میں جان چکا تھا کہ یہ شخص کچا بد معاش ہے۔ اس کے باوجود میں نے سوالوں کی بوچھاڑ جاری رکھی۔“

اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہ میٹ استاد اور غنڈہ اسے۔ اسے میں نے باقاعدہ گرفتار نہیں کیا بلکہ پولیس ملک سے کہا کہ اسے تھانے کی حوالات میں ہی رکھے اور ادھر ادھر ہونے دے۔ اگلے روز صبح نو بجے میں مجھے پر پہنچا۔ ٹھیکیدار کو دانستہ اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔

دہاں وہی منشی موجود تھا، جس کی جگہ جمال مجھے پر آیا تھا اور چل کر راکھ ہو گیا تھا۔ گپ شپ کے انداز میں..... میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ مجھے جانتا تھا، گزشتہ روز اس نے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے نوٹ کیا کہ یہ جواں سال منشی خود اعتمادی سے بات کرتا ہے اور اس کا انداز بھی دوستانہ سا ہے اور یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ مزدوروں کے میٹ اچھو بھولا سے مرعوب ہے۔ کیونکہ جب اچھو بھولا کا ذکر آتا تو وہ جھینپ جاتا اور اپنی کوئی رائے نہ دیتا۔

”تم پچھلی چھنی پر کب مجھے تھے منشی صاحب!“ میں نے پوچھا۔

”شاہد تین سال پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان تین سالوں میں تمہیں چھنی نہیں ملی یا خود ہی نہیں مجھے؟“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اشارے سے بتایا۔ ”وہ سامنے جو گاؤں ہے وہاں میرا گھر ہے، کوئی مسئلہ بن جائے تو ایک آدھ دن کے لیے گھر چلا جاتا ہوں۔“

”اب شاید کوئی لمبا کام آن پڑا تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں صاحب!“ اس نے کہا۔ ”ٹھیکیدار صاحب سے ذکر نہ کیجیے گا..... کام کوئی نہیں تھا۔ اشرف بھولا نے ایک دن کہا کہ تم چھنی لے سکتے ہو۔ پھر لیتے کیوں نہیں؟

ٹھیکیدار نے تمہیں کونسا انعام دے دینا ہے..... کچھ دن کی چھنی لو، آرام کرو اور کھو محو ہو۔“

چھنی والا سوال میری چھنی جس نے مجھ سے کروا ڈالا تھا اور یہی وہ جواب تھا، جس نے مجھے چونکا دیا۔ اچھو بھولا نے



زبردستی اسے چھٹی پر بھجوا دیا تھا۔ ایک ہفتے کی چھٹی کے ساتھ کچھ رقم بھی تنگیدار سے لے کر اس کے حوالے کی گئی تھی۔

”چلو اچھا ہوا..... آپ کو کچھ آرام کا موقع تو ملا۔“

میں نے کہا۔  
”سیر و تفریح اور آرام کر کے میں چھٹی گزار آیا لیکن جمال بے چارہ، آگ میں گر کر جل مرا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ نہ میں چھٹی پر جاتا نہ اسے میری جگہ بھنے پر بھیجا جاتا۔“

وہ تو سادگی میں یہ باتیں کہہ گیا لیکن میرا ذہن اس انکشاف پر ابلک گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مٹی کو چھٹی پر بھجواتا..... جمال کے کٹل کی سادش کی ایک کڑی تھی۔ اس بھانے جمال کو بھنے پر لانا اور اسے آگ میں پھینکنا تھا۔

مجھے اب اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی کہ یہ سازش اور پلاننگ کیلئے اچھو بھولا کی تھی یا اس میں تنگیدار میر حسن بھی شامل تھا؟ میں نے مٹی سے اور باتیں بھی پوچھیں لیکن اس کی زبان سے مجھے اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔  
”تم تو بڑے اہم آدمی ہو یا را!“ میں نے مٹی کی پیٹھ پر جھک کر دیکھ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ جتنا تہی چارہ ہے۔“ اشرف بھولا تو غنڈا گردی کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا ہوگا۔“

اس طرح میں نے اسے خوب ہوا دی تاکہ وہ کچھ اور اگے دے۔ اسے میں نے داخل مندر اور کیا ایک خطاب دے ڈالے۔  
”ایک بات بتاؤ مٹی صاحب!“ میں نے کہا۔  
”جمال کو مرے ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ تم نے چھٹی سے واپس آ کر مزدوروں سے تو پوچھا ہوگا کہ جمال آگ میں کیسے گرا تھا؟“ تم نے اچھو بھولا سے بھی پوچھا ہوگا، یہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟“

”سب حیران تھے۔“ مٹی عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ”حیران اس بات پر تھے کہ وہ آگ میں گرا کیسے؟ اتنی زیادہ آگ کے قریب جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اچھو بھولا کہتا تھا کہ جمال بے وقف لڑا تھا۔“

”ایک بات اور عزرا!“ میں نے کہا۔ ”یہ بات بھی تم ہی بتا سکتے ہو، کیا ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ جمال نے یہاں کسی لڑکی پر ہاتھ رکھا ہو اور اچھو بھولا اس لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو؟“

”نہیں صاحب!“ مٹی نے کہا۔ ”مٹی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کسی نے مجھے ایسا واقعہ نہیں سنایا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اشرف بھولا

کے بارے میں یہاں کوئی آدمی اپنی زبان نہیں کھولے گا..... میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔“

”کہاں ہے اشرف بھولا؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہ ابھی آجائے گا۔“ مٹی عزیز نے جواب دیا۔

”دس گیارہ بجے آیا کرتا ہے۔“  
”وہ اب نہیں آئے گا۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ گرفتار ہو چکا ہے، ہماری حوالات میں بند ہے۔“ مٹی نے آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”حیران مت ہو عزرا!“ میں نے کہا۔ ”اچھو بھولا کو مرے واقعی گرفتار کر لیا ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور جیب کے ذرا نیچے اور ایک کاٹھیل کو پولیس اسٹیشن بھجوا دیا تاکہ اچھو کو پھنکری لگا کر بھنے پر لے آئیں۔

یہ اقدام اس لیے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے دلوں سے اچھو کا خوف نکل جائے اور وہ مکمل کر بیان دے سکیں۔  
مٹی عبدالعزیز کو جب یقین ہو گیا کہ ان کا غنڈا امیٹ اشرف بھولا گرفتار ہو چکا ہے تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔  
”یہ حادثہ میری غیر حاضری میں ہوا ہے۔“ مٹی نے کہا۔ ”مگر میں یہاں ہوتا تو مجھے کچھ تو بتا چل جاتا۔“ مجھے کچھ کچھ آری ہے کہ اچھو میٹ۔ کیوں مجھے چھٹی پر بھجواتا ہے پر بلند تھا اور تنگیدار صاحب سے چھٹی بھی دلا دی، حالانکہ مجھے اتنی چھٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو کے متعلق میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ بھنے کے تمام مزدور اس سے ڈرتے ہیں اور یہ شخص مانی کرتا ہے۔“

مٹی نے اس کا گلاں ملتا اور طعنیہ بتا دیا، جہاں وہ رہتا تھا۔ میں نے مٹی عزیز سے پوچھا کہ مجھے ان مزدوروں کا نام بتاؤ، جنہوں نے جی انڈیوں کو جوڑ کر یا رکھ کر آگ چلائی تھی۔ مٹی نے پانچ چھ مزدوروں کا نام لیے اور میرے کہنے پر اس نے ان آدمیوں کو بلا لیا۔

میں نے ان میں سے ایک کو الگ کر لیا۔ ”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے بھائی!“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ جب جمال آگ میں گرا وہ اس وقت کہاں تھے؟“  
اس خریب مزدور کا درجہ بڑھ گیا تھا کہ اس کے چہرے پر بے بسی صاف نظر آنے لگی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میری جانب یوں دیکھا جیسے رو پڑے گا۔ یہ تھا اس کے چہرے پر کبھی ہوئی تھی کہ جناب مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔

”ڈر نہیں جوان!“ میں نے کہا۔ ”جس سے تم ڈرتے ہو، وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے سامنے آجائے گا اور تم جو بھی بات بتاؤ گے کسی کو

نہیں بتائی جائے گی۔“

مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ پر کھڑا تھا اور اس نے جمال کو اچھو میٹ کے ساتھ بھنے کی خندق کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین اور مزدور وہاں کام کر رہے تھے اور اچھو میٹ نے پیچھے سرگرد دیکھا اور سب کو ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، ادھر چلے جاؤ۔ وہ آدمی وہاں سے بٹے تو فوراً بعد اچھو میٹ نے شور مچایا کہ لڑکا آگ میں گر پڑا ہے۔

میں نے اسے بھنے کو کہا اور مٹی سے اسے پانی پلانے کا کہا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے پانی پا کر میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”حضور!“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں۔“

پھر میں نے ان تینوں، چاروں مزدوروں کو باری باری الگ کیا اور وہی سوال پوچھتے جو پہلے مزدور سے پوچھے تھے۔ ہر ایک کا رد عمل وہی تھا جو پہلے کا تھا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ اچھو میٹ نے انہیں ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس وقت اچھو اور جمال کس طرح چل رہے تھے، یہی آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ؟..... انہوں نے بتایا کہ جمال آگ کی طرف تھا اور اچھو میٹ اس کی دوسری طرف کے پہلو کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے ان سے اچھو میٹ کے متعلق کچھ اور باتیں پوچھیں تو سب نے گول مول سے جواب دیے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ڈر کے مارے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ اسے میں تنگیدار میر حسن آگیا اور سید حامد میرے پاس آ کر اس طرح کی حرکتیں اور باتیں کرنے لگا، جیسے میرا انگوٹھا پیار یا بے تکلف دوست ہو۔

”ایک بات یاد رکھنا تنگیدار صاحب!“ میں نے ذرا دبدبے سے کہا۔ ”یہاں کے کسی درگزر سے آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے اس سے کیا پوچھا ہے اور اس نے کیا جواب دیا ہے۔ کسی مزدور کو کوئی ہدایت نہیں دینی، جو میری تفتیش میں رکاوٹ بنے۔ اگر آپ نے کسی مزدور پر اس طرح دباؤ یا ڈانٹا تو میں آپ کو گرفتار کر لوں گا۔“ تنگیدار سر جھٹکا سے چلا گیا۔

ان تین چار مزدوروں سے مجھے پتا چلا کہ دو مزدور اور بھی تھے جو جمال کے گرد بٹے وقت موجود تھے۔ میں نے انہیں بلایا۔ اسے میں اشرف بھولا اٹھکڑیوں سمیت ہمارے سامنے آ بیٹھا۔ کاٹھیل نے پھنکری کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مزدور کام چھوڑ کر حیرت سے اچھو میٹ کو

اٹھکڑیوں میں جبراً دیکھ رہے تھے۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ..... بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔

میں نے اچھو بد معاش کو ایک جانب بٹھا کر دو مزدوروں سے پوچھ کچھ شروع کی۔ ایک مزدور نے بتایا کہ اسے یقین تو نہیں لیکن اسے ایسا لگا تھا جیسے اچھو میٹ نے لڑکے کو آگ میں دھکیلا ہو۔ وہ یقین اور شک کے درمیان بات کر رہا تھا۔ بہر حال اس کی اس بات سے یہ یقین ہو گیا کہ اچھو میٹ، جمال کو آگ کے بہت قریب لے گیا تھا۔

مجھے کوئی ایسی شہادت تو نہ ملی کہ اچھو نے جمال کو آگ میں گر لیا تھا مگر یہ شک پختہ ہو گیا کہ جمال کو جلانے میں اچھو میٹ کا ہاتھ ہے۔ اس کے بارے میں مزید انکشاف ہوا کہ وہ ہر مزدور سے پچاس روپے ماہانہ کمیشن لیتا تھا۔ مزدوروں کی نو جوان لڑکیوں کو وہ اپنی زرخیز لونڈیاں سمجھتا تھا۔

میں نے وہاں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ کافی حد تک حاصل کر لیا تھا۔ آدھے سے زیادہ دن وہیں گزار گیا تھا۔ ہم نے اچھو میٹ کو گاڑی میں بٹھایا اور واپس پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ اچھو بھولا کو تفتیش والے کرے میں بٹھا کر کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے مگر وہ انکار کرتا رہا۔

میں دوسرے طریقے سے بھی اس کی زبان کھلواسکا تھا مگر اس کے متعلق پولیس رپورٹ لینا بھڑکھا۔ اچھو میٹ کا ٹھکانہ جس پولیس اسٹیشن کی حدود میں تھا، میں نے وہاں کے ایس ایچ او کو فون کیا اور اسے اشرف میٹ کا پورا نام اور عرفیت بتا کر کہا کہ اس کے متعلق مجھے جلدی رپورٹ دے۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر اس کا کوئی جاننے والا آدمی ہو تو اسے میرے پاس بھیج دے۔

ایس ایچ او نے مجھے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ شخص

تھانے کے ریکارڈ پر ہے اور ایک بار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ شام کے وقت ایک شخص مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک بند لافزدہ دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔ یہ اشرف بھولا کی ہسٹری تھی۔ اسے چاقو زنی کی واردات کے جرم میں دو سال سزا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی جھگڑے میں دو بار پکڑا گیا تھا لیکن تھانے والوں نے راضی نامہ کر دیا تھا۔ چاقو زنی میں ہی ایک بار پھر پکڑا گیا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا۔ تھانیدار نے اپنی رائے لکھی تھی کہ یہ پکا غنڈا اور بد معاش ہے۔ دلیر بھی ہے، پولیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی رہی ہے۔

یہ رپورٹ طویل اور بڑی واضح تھی۔ جو آدمی یہ رپورٹ لایا تھا، وہ اس تھانے کا پرانا کاٹھیل تھا۔ تھانیدار



نے اس کا ٹھیل کو خاص طور پر بچھا تھا کیونکہ اس کا ٹھیل کے ساتھ اشرف بھولا کی بڑی گہری یاری تھی۔ اس کا ٹھیل نے خود ہی کہا کہ وہ اشرف بھولا کی پوری رپورٹ دے سکتا ہے۔ اس نے اشرف کی پوری زندگی کی کہانی اور اس کے جرائم کی تفصیلات سنا ڈالیں۔

اس نے بوہڑ گیت کی ایک طوائف کا نام بتایا، جس کے ساتھ اچھو بھولا کے گھر سے مراد تھے اور وہ فارغ وقت اسی کے ہاں گزارتا تھا۔ اس طوائف کا ایڈریس معلوم کر کے میں نے کاشٹیل کو واپس بھجو دیا۔

میں نے اگلے روز اپنے اسے ایس آئی ممتاز خان کو طوائف کے کونٹے کی جانب روانہ کیا تاکہ اس سے کچھ سرائے مل سکے۔

عادی قاتل بھی قتل کر کے اپنی مخصوص طوائف کے پاس جاتا ہے اور شراب کے نشے میں بڑے فخر سے انداز میں طوائف کو بتاتا ہے کہ وہ قتل کی واردات کر کے آیا ہے۔ میں نے اس طوائف کو اس موقع پر بلایا تھا۔

ایک گھنٹے بعد طوائف پولیس اسٹیشن آئی تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ فخر یا غم میں سال کی خوب صورت طوائف تھی۔ میں نے اسے بٹھایا، اس کی گھبراہٹ اور خوف قدرتی تھا۔

اسے نارمل حالت میں لانے کے لیے میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں تاکہ وہ ذہنی طور پر سیٹ ہو جائے۔ میں نے اس کے حسن کی تعریف کی۔

آخر طوائف تھی، جس کا سوسائٹی میں نہ کوئی مقام تھا نہ کوئی وقار۔ میں نے اسے ہوا دینی شروع کی تو وہ غبارے کی طرح پھوٹی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”سرکار! ہمیں کیوں بلایا گیا ہے؟“

”تمہارا یار پچاسی چڑھ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”اشرف عرف اچھو بھولا۔“ میں نے بتایا۔ ”اس رات وہ تمہارے پاس گیا تھا اور اس نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ وہ پورا بیان دے چکا ہے۔ تمہیں صرف تصدیق کے لیے بلایا ہے۔“

”ہاں!“ طوائف نے اس طرح کہا جیسے آدمی جاتی ہے۔ ”وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس رات وہ بہت زیادہ لیٹھا تھا۔ نشے میں تھا کہ کچھ ہنگامہ اور اوٹ پٹانگ باتیں بھی کرتا رہا۔ کہہ رہا تھا کہ آج دولت بھی کمائی ہے اور ایک لڑکے کو جلا کر مار دیا ہے۔ ہے کوئی جو میرے سامنے آئے۔ میں بھی دیکھیں مار رہا ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھیں نہیں۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ تمہیں اس سے اتنی رقم بتانی تھی؟“

”پچاسی ہزار کہتا تھا۔“ طوائف نے جواب دیا۔

”میں نہیں مانتی تھی۔ اتنی زیادہ رقم کون دیتا ہے؟“

طوائف نے فوراً راز اگل دیا تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ طوائف اس کی بھی نہیں ہوتی، جس سے ہزاروں روپے کمائی ہے۔ اچھو بھولا نے بھی اسے اپنی محبوبہ بنا رکھا تھا اور طوائف نے بھی اسے یہی تاثر دے رکھا تھا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اور اس پر سمرتی ہے لیکن اسے ایک پولیس انسپٹر کا میک کی صورت میں سامنے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کو کیا بڑی غلطی کہ اچھو بھولا کے لیے جھوٹ ہو گئی۔ بہر حال وہ اس کہیں میں ایک اہم گواہ تھی۔

طوائف کے جاتے ہی میں نے اچھو میٹ کو حوالات سے نکلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے۔

”دیکھو اچھو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم اقبالی بیان نہیں دے گے، تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، نقصان تمہارا ہوگا۔ اگر بیان دے دو گے تو میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں کم سے کم سزا ملے۔ اگر پریشان کرو گے تو ہم تمہیں سیدھا چابی کے تختے پر پہنچا دیں گے۔“

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔ ”تمہیں اسے بٹھایا ہے۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کونٹے میں دھکا دیا تھا۔

سے ہی اسٹے پھلتے رہے تھے۔ لاکین تک ان کا پیار ان کی روجوں میں اتر گیا تھا۔ پھر یہ جوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو حالات نے ایسا پلٹا دیا کہ میر حسن کی قسمت کا دروازہ کھل گیا اور وہ دولت مند ٹھیکیدار بن گیا۔

ادھر جمال ختم ہو گیا۔ گھر کی دال روٹی پوری کرنا حال ہو گئی۔ جمال نے میز پر پاس کر لیا تو ٹھیکیدار نے اس پر رحم کرتے ہوئے اسے ملازم رکھ لیا۔ ساتھ ہی ڈیوٹی اس کے ذمے لگا دی کہ وہ اس کی بیٹی کو تانگے پر کاج لے جائے اور واپس بھی لے آ کرے۔ ان دنوں میں پہلے ہی محبت تھی۔ انہیں ایک اچھا موصل مل گیا۔

میر حسن کی بیٹی نے دولت مندی سے اپنا دماغ خراب نہیں ہونے دیا۔ اس نے جمال کی محبت کو ایسا سینے سے لگا کر اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے بھی جمال کو نوکر نہیں سمجھا تھا۔

زمکس کے لیے رشتے کا ایک اچھا پیغام آ گیا۔ لڑکا تعلیم یافتہ اور امیر تاجر کا بیٹا تھا۔ ٹھیکیدار نے ہاں کر دی مگر زمکس نے اپنی ماں کو اعلان طور پر کہا کہ وہ اس آدمی سے شادی نہیں کرے گی۔ اور اگر زبردستی کی گئی تو کالج کے وقت وہ لڑکا گھر سے نکال دیا جائے گا۔

وہ جمال کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکی ہے اور وہ یہ قول نبھائے گی۔

اسے ماں، باپ کے علاوہ بہنوں نے بھی سمجھا یا لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا، جو ذہنی طور پر معذور تو نہیں تھا مگر عقل اور اسحق سا تھا۔ اس نے زمکس پر رعب بھاڑا تو زمکس نے خودکشی کرنے کی دھمکی دے دی۔ جمال کو زمکس کے ساتھ کالج جانے سے روک دیا گیا اور اس اسحق بھائی کو اس کے ساتھ تانگے میں جانے کو کہا گیا۔

زمکس نے کالج جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے سوچا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے، پڑھ کر کیا کرے گی۔ لہذا اسے کالج جانے سے روک دیا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

زمکس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور ساتھ ہی صند کر کے لی کہ جمال کو بلا دے۔ جمال اس گھر میں چڑھ کر آتا جاتا تھا، لیکن اسے روک دیا گیا تھا۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر میر حسن نے جمال کو اپنے گھر بھیجنا شروع کر دیا۔

باپ کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اچھو میٹ کو بتایا اور کہا کہ جمال کو اس طرح مارا جائے کہ زمکس یہ نہ سمجھے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ اتفاقی یا

حادثاتی موت معلوم ہو۔

پھر جمال کو بھینے کی آگ میں پیچھے جانے کا طریقہ ٹھیکیدار نے سوچا جو اچھو میٹ کو سب سے اچھا لگا۔

”اور یہ کام کرو گے۔“ ٹھیکیدار نے اچھو میٹ سے کہا۔

”میرے علاوہ اور کون ہے، جو یہ کام کر سکے؟“ اچھو نے کہا۔

”لیکن عالی جاہ یہ بھی سوچ لیں کہ کسی نے دیکھا تو پچاسی چڑھ ہی ہے۔“

”جمال نہ رہا تو کیا لڑکی آپ کی پسند کی شادی کر لے گی؟“ اچھو نے پوچھا۔

”مجھے امید ہے کر لے گی۔“ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔ ”میں کرے گی تو میں اس کا بھی پتا کاٹ دوں گا۔“

اچھو میٹ اور ٹھیکیدار میر حسن نے جمال کو بھینے کی آگ میں پیچھے جانے کا طریقہ

عبدالعزیز کو چھٹی پر بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ جمال کو بھینے پر بھیجا جائے۔ فکری کی غیر حاضری میں وہ بھینے پر کام کرے گا۔ بانی کام بھی پڑھو کر دیا۔



آگ تو بجھ گئی مگر یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ جل جانے والا کوئی انسان تھا یا کسی درخت کا تھانہ۔

اچھو نے اپنے بیان میں کہا کہ علاقہ تھانیدار شرافت علی خان آیا اور دیکھی ساریاں لے کر چلا گیا۔

”شرافت خان نے تفتیش تو کی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”خاک تفتیش کی تھی۔“ اچھو نے جواب دیا۔ ”میں ہزار روپے لے کر اس نے لکھو دیا تھا کہ گواہوں اور بیٹی شاہدوں کے بیانات کی روشنی میں حوثی حادثاتی موت مرا ہے۔“

”ہم تو خوش تھے عالی جاہ کے معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے لیکن جمال کی ماں کی فریادیں خدا نے سن لیں اور ہمارا مکافات عمل شروع ہو گیا۔“

اشرف بھولا کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ٹھیکیدار میر حسن، اچھو جیسے جرائم پیشہ، چری اور شرابی کے ساتھ اتنا بے تکلف تھا کہ اپنی سگی بیٹی کی محبت اور اپنے گھر کی نازک باتیں بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔

ٹھیکیدار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

”میر حسن صاحب!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اقبالی بیان دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس بیان میں یہ ضرور شامل ہو کر تم نے تھانیدار شرافت علی خان کو تین ہزار روپے دے کر لکھوایا تھا کہ یہ حادثاتی موت ہے۔ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ کچھ چھپاؤ گے تو ہم یہاں پہلے تمہاری ہڈیاں توڑیں گے پھر عدالت میں پیش کریں گے۔“

اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو اچھو نے دیا تھا۔

”واہ ٹھیکیدار صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اپنی بیٹی کی شادی جمال کے ساتھ کر دیتے تو کیا حرج تھا؟..... جمال تمہارا درشتے دار ہی تھا۔“

”یہ تو میری بے عزتی تھی صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”رشتے دار تو بعد کی بات ہے، اصل بات یہ تھی کہ وہ میرا نوکر تھا اور غریب تھا۔“

میں نے میر حسن سے کہا۔ حقیقت کو چھٹلانے اور دوسروں کو حقیر جاننے کو کبھی کہتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں.....

تمہیں تکبر کی یہ سزا مل رہی ہے۔ تم نے دولت کو خدا بتا لیا تھا۔ تمہارا ایم احتساب آچکا ہے۔ ٹھیکیدار نے مجھے رشوت پیش کی۔

”مجھے اس کیس سے نکال دو۔“ میر حسن نے کہا۔ ”مجھنی رقم کو بگڑے نور اے دوں گا۔“

”جہنم کا خون ہضم نہیں ہو سکتا ٹھیکیدار صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ خون..... مجھے نہ ملاؤ۔ ایک بیوہ ماں کی آہوں کا عذاب دیکھ لو۔“

میری تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ اس تفتیش کے دوران میرا ایس بی طاہر ہر کار سے مکمل رابطہ رہا تھا اور آج جب میں نے انہیں اپنی کامیابی کی خبر سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔

میں نے انہیں تھانیدار شرافت علی خان کو معطل کرانے کی درخواست کی اور انہوں نے وعدہ کر لیا۔

صرف اقبالی بیان طوم کو سزا نہیں دلا سکتا۔ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت عدالت میں پیش کرنے پڑتے ہیں چونکہ جمال کو آگ میں جلا کر اچھو طائف کے پاس گیا تھا اور شراب کے نشے میں اس نے طوائف کو بتایا تھا۔ طوائف کا اطلاع بھجوا دی گئی کہ اگلے روز پولیس اسٹیشن پہنچ جائے۔ سب سے مضبوط ٹھیکیدار کی اپنی بیٹی زکس تھی۔

یہ خیال رہے کہ جمال کے قتل کے بعد میر حسن نے اپنی بیٹی زکس کی شادی وہیں کر دی تھی جنہوں نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ ہم اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ سب انسپکٹر راجا یونس ملک بھی بہت خوش تھا کیونکہ اس تفتیش کے آغاز میں اس نے بڑی ذمہ داری سے سارے کام کیے تھے۔ میری غیر موجودگی میں پولیس اسٹیشن بروہی سینٹر افسر تھا۔ اس کیس کو حل کر کے جہاں ہمیں روحانی سکون ملا..... وہاں ہم دونوں کی ترقی کے جاس بھی بڑھ گئے تھے۔

ہماری تفتیش مکمل ہو چکی تھی، لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس تفتیش کہانی کا ایک انتہائی جذباتی، عجیب و غریب اور دلوں کو ہلا دینے والا حصہ ابھی باقی ہے۔

اگلے روز ہمارے پاس جو گواہ آئے۔ ان میں پہلے طوائف آئی اس سے ضروری گفتگو کے بعد اسے فارغ کیا تو زکس اور اس کا شوہر چلے آئے۔ جن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ زکس نے پہلی ہی رات میں شوہر کو اپنی اور جمال کی محبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جس پر شوہر نے بڑی بھیداری کا مظاہرہ کر کے معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زکس کو اپنے پیار اور محبت سے سمجھایا

اسے اس کی مرضی کے مطابق جسے کا حق دیا اور اس پر اپنی طرف سے کوئی زور بردستی نہیں کی۔ البتہ زکس نے اپنے گھر والوں سے رابطہ بالکل ختم کر دیا تھا۔ جب باپ کی گرفتاری کی خبر سن تو جیسے اس کی جھلکتی ہوئی روح کو قراد مل گیا تھا۔

اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

”کیا آپ نے واقعی میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے؟“ زکس نے اس سے لکھنے میں پوچھا۔

”ہاں زکس۔“ میں نے کہا۔ ”نہی اسے اور اس کے پاراشرف عرف اچھو بھولا کو جہاں کو آگ میں پھینک کر قتل کر دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”اللہ تیرا شکر۔“ زکس نے آسمان کی جانب دیکھا اور دو ہاتھوں میں پھیلا کر کہا۔ ”قاتل آخر پکڑے گئے۔ اب میری روح کو تسکین مل گئی ہے۔“

”کیا تمہیں اپنے والد صاحب کی گرفتاری کا انوس نہیں ہوا؟“ سب انسپکٹر راجا یونس ملک نے پوچھا۔

”نہیں۔“ زکس نے دانت چیر کر کہا۔ ”مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہتی ہوں۔“

ہم نے اس سے یہ قصد بیک کر لیا تھا کہ یہ مقتول کو چاہتی تھی اور مقتول کے قتل کا باعث یا وجہ بنی تھی۔ میں نے دو چار سوال کر کے یہ قصد بیک کر لیا اور زکس سے پوچھا کہ وہ عدالت میں بیان دیے آئے گی؟

”کیوں نہیں آؤں گی۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں چلا چلا کر لوگوں کو سناؤں گی کہ یہ شخص قاتل ہے اور قتل کی وجہ یہ ہے۔“

ہم نے زکس اور اس کے شوہر کو رخصت کر دیا لیکن یہ دونوں مجھے جذباتی طور پر حیران کر گئے۔ اشرف بھولا عرف اچھو کا بیان، مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کر اسے جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا۔

ٹھیکیدار میر حسن نے مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ درودز ہماری حوالات میں رہا پھر خود ہی بیان دینے کے لیے راضی ہو گیا۔ اس کا بیان لے کر ہم نے اسے بھی جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا۔ مقدمہ چلا لیکن زکس جب گواہی دینے آئی تو کورٹ میں ہنسا طاری ہو گیا۔

وہ..... اپنے باپ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہا کر بیان دیتی اور کہتی تھی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ دو تین مرتبہ پیشینہج نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکی اتنی بیڑکی ہوئی تھی کہ اس نے بیان تو ٹھیک دیا لیکن وہ آگ بگولائی ہوئی تھی۔

میں آپ کو مقدمہ سے بیک انجام جاتا ہوں۔ ٹھیکیدار کو

تو سال قید کی سزا ہوئی اور اچھو بھولا کو سزا موت دی گئی۔ دونوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔ دونوں مسترد ہو گئے۔ میرا یہ کیس تو ختم ہو گیا اور ہم دونوں پولیس آفیسروں نے ایس بی صاحب اور آئی جی بی پولیس سے خوب داد و تحسین وصول کی۔

ہم دونوں کی ترقی متوقع تھی لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی زکس کی دعا میں لے کر ہوئی۔ دو چار ماہ تک زکس اور اس کا شوہر میرے ذہن پر سوار رہے۔ تقریباً ایک سال بعد میں اپنی بیوی اور بچوں کو سیر جانے کے لیے ملتان لے گیا۔ میری بیوی کو خانقاہ دیکھنے کا شوق تھا۔ وہاں گئے تو زکس اور اس کا شوہر مل گئے۔ وہ بھی سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ زکس بہت خوش و غرم تھی۔

انہوں نے پہلی خبر یہ سنائی کہ اشرف عرف اچھو بھولا تو پھانسی چڑھ گیا تھا اور ٹھیکیدار میر حسن کو تین سال تین ماہ بعد فارغ کا احتساب یہ جملہ ہوا کہ مر گیا۔ ”اس کی لاش گھر آئی تو میں وہاں نہیں گئی تھی۔“ زکس نے کہا۔ ”میرا شوہر سن رہا ہے، میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا کہ اب میں جڈبانی اور روحانی لحاظ سے آپ کی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ ایک فرشتہ تھا، جو اللہ نے میری نجات کے لیے اتارا۔“

میں نے اس کے خاندان کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور وہ سکرار تھا۔

”اب ہم بہت اچھے پیار کرنے والے میاں بیوی ہیں۔“ زکس کے شوہر نے کہا۔

یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ماضی کا یہ کیس جب یاد آتا ہے تو کچھ ایسے یک صفت لوگ یاد آجاتے ہیں جن کی وجہ سے شاید دنیا قائم ہے۔ جس میں ایس بی طاہر وقار صاحب اور جمال مرحوم کے والد کا وہ دوست جس نے درخواست لکھ کر براہ راست ایس بی صاحب تک پہنچائی۔

جیسا کہ تھانیدار شرافت علی خان جیسے بے ضمیر انسان نے ایک ماں کو دھکے مار کر تھانے سے نکال دیا۔ اسے ملا کیا؟ ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ ظالموں کو اس دنیا میں ہی پکڑ لیتا ہے۔

سلام کرتا ہوں اس روشن ضمیر انسان طاہر وقار کو جس نے دفتری کارروائیوں میں اٹھنے سے پہلے حکم دے دیا کہ اس ماں کا شک و فہم کرو..... یا اس کے بچے کے قاتل کو پکڑو۔ سلا کر۔ اسے ایس بی کی وجہ پر کے حکم کے بغیر ہی ایک کیس کی تفتیش کا حکم دے دے۔



دوسرا اور آخری حصہ

## سنگین خاتمہ

نثر ہادی

سب سے خوب صورت تحفہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کا دیا جس کی بدولت وہ غلط اور صحیح میں فرق کر پاتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ جب اس انتخاب کا وقت آتا ہے تو انسانی فطرت اسے اکثر لالچ اور مفاد کے نام پر انتہائی پستی میں گرا دیتی ہے۔ اسے بھی اپنی ذات پر اتنا ہی گھمنڈ تھا کہ ہر پسندیدہ چیز اور شخصیت پر اپنا استحقاق قائم رکھنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا تھا مگر... بڑے کڑوے سے مستقبل بنانے والا... ماضی کی کوتاہیوں میں ایسا الجھا کہ اپنے حال کو بھی فراموش کر بیٹھا جبکہ دوسری جانب دوستوں کے روپ میں ملنے والے دشمن اسے بڑے پیار سے تباہی کی طرف دھکیلے رہے اور جب خود اندیتوں میں مبتلا ہوئے تو احساس ہوا کہ ناحق کسی کو گناہ کی طرف راغب کر کے خود انہوں نے کتنی بڑی عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا...

ایک بچہ اداہات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل کرنے

والے نمبر رشتہ رشتہ لوگوں کی مہم پر اٹھنا





نہیں سنجیدگی سے چند لمبے افسار کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "میں سنا رہی ہوں۔ طلاق ہو چکی ہے میری۔"

افسار کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔  
نہیں سیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "کیا اب بھی تم مجھ سے شادی کرنا چاہو گے؟"

"دیکھا تو تھا ہے تمہارے جواب سے۔" افسار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں اس کے باوجود تمہیں اپنا ہاتھ نہ دوں گا۔"

"ج؟" نیکم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کچ کہہ رہے ہو افسار؟"

"کہو تو ابھی چلیں؟" افسار نے بے صبری سے کہا۔ "ابھی عدالت کا وقت ختم نہیں ہوا ہے۔"

"عدالتی شادی تو میں پسند نہیں کرتی۔"

"تو بتا دو ہم کب شادی کر سکتے ہیں؟ تمہیں اپنے والدین سے بات کرنی ہوگی شاید۔"

"بات تو کروں گی لیکن اسکی کوئی بات نہیں ہے کہ مجھے اجازت ملنی پڑے۔"

"اجازت تو لینا چاہیے، رسا ہی اسی! "

"تمہیں معلوم ہے؟ میرے والدین دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔"

"ہاں تم بتا چکی ہو۔"

"لیکن یہ نہیں بتایا کہ میں یہاں اکیلی کیوں رہتی ہوں۔ بس کبھی ان سے ملنے چلی جاتی ہوں اور ان سے کہاں بس اپنی ماں سے ملنے جاتی ہوں۔"

"والدے تعلقات خراب ہیں؟"

"وہ میرے سوتیلے والد ہیں۔ میرے والد کا تو بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

اپنے اس اقدام پر وہ آج تک بچھڑا رہی ہیں۔ میرے سوتیلے والد اچھے انسان نہیں ہیں۔ انہی کی ایک بے ہودہ حرکت کی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا تھا کہ ان سے علیحدگی اختیار کروں۔"

ان باتوں پر افسار نے افسوس کا اظہار کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں افسوس کی۔" نیکم نے کہا۔ "میں تو اب اس زندگی کی عادی ہو چکی ہوں۔"

"اس وقت میں تم سے بات کر کے اتنا خوش ہوا ہوں کہ..... جی چاہا رہا ہے، ہم ابھی کہیں گھونٹنے چلیں۔ رات تک گھونٹ ہی رہیں۔ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں۔ پھر میں تمہیں یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

"خوب اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کون ہے وہ؟ کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرے گا؟ ابھی تم کہہ چکی ہو کہ وہ شاید تم سے شادی کے لیے تیار نہ ہو۔"

"ہاں، حالانکہ وہ مجھے چاہتا ہے۔"

"ابھی ہوئی باتیں کر رہی ہو تم! وہ تمہیں چاہتا ہے لیکن تم سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ اس لیے ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ نہیں جانتا۔"

"تو اسکی کیا بات ہے تم میں جسے جانتے کے بعد وہ تم سے شادی کرنا نہ چاہے؟"

"وہ کوئی بری بات تو بہر حال نہیں ہے لیکن بعض مرد..... بلکہ بیشتر مرد اسے پسند نہیں کرتے۔"

"ایسی کیا بات ہے..... مجھے بتانا پسند کرو گی؟"

"اب اس موقع پر میں تمہیں بتا ہی دوں تو ایک مستقل اچھوت سے نجات مل جائے گی۔ مجھے بتاؤ افسار! "

میں خاصا طویل عرصہ ہو گیا ایک جگہ ملازمت کرتے ہوئے۔ ہم کسی نہ کسی حد تک بے تکلف بھی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں جو کچھ دیکھا ہے، وہ میں پڑھ نہ سکی ہوں؟..... اس سلسلے میں عورت زیادہ حساس ہوتی ہے مگر کی نہیں۔"

افسار کچھ خوش ہوا۔ "اس شخص کا نام تو بتاؤ۔"

"صاف صاف کھلوانا چاہتے ہو..... کیا تم مجھے نہیں؟"

نیکم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے کیا ہوں۔ وہ میں ہی ہوں۔" افسار نے جذباتی ہو کر نیکم کا ہاتھ پکڑا لیکن پھر فوراً ہی "سوری" کہہ کر چھوڑ بھی دیا۔

"سوری کی ضرورت نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم زندگی بھر کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

"اوہ..... اوہ....." اس دن افسار کو معلوم ہوا کہ خوشی سے بھی انسان کی سانس پھول سکتی ہے۔ "میں تمہیں بہت چاہتا ہوں نیکم!"

"لیکن اس سے پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ میری فطرت نہیں کہ میں کسی کو دھوکا دوں۔"

"دھوکا؟"

"ہاں۔" نیکم نے کہا۔ "اپنے بارے میں کچھ چھپاتا دھوکا ہی تو ہے۔"

"تو بتاؤ۔" افسار نے بے صبری سے کہا۔

ایسا لگنے لگا جیسے تم بہت گھرمند ہو گئی ہو۔"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے افسار۔" نیکم نے غور سے افسار کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "وہیے کیاریم شادی کے لیے تیار ہو چکی ہے یا ہو جائے گی؟"

"اس سے ابھی میری کوئی بات نہیں ہو سکی لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ تیار ہو جائے گی۔ تم بھی جانتی ہو کہ زید کی طرف اس کا جھکاؤ بہت ہے۔ تم چھپرتی بھی رہی ہو اسے کہ وہ آخر کب شادی کرے گی۔ اتنی عمر تو ہو گئی ہے اس کی۔"

"میں چھپڑ چھاڑتی ہی وہ..... میں سنجیدہ نہیں تھی۔"

اس نے تو فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ کبھی کبھی تو تم نے بھی اسے مذاق میں چھیڑا ہے۔"

"میں بھی سنجیدہ نہیں تھا اور....." افسار مسکرایا۔ "تمہاری عمر بھی اتنی ہی ہو چکی ہے لیکن میں نے تمہیں کبھی کبھی نہیں چھیڑا۔"

"مجھے تم نے کیوں نہیں چھیڑا؟" نیکم آہستہ سے ہنسی۔ "تم کو میں نے اس لیے نہیں چھیڑا کہ تم بھی ریمایا طرح کا کوئی فیصلہ نہ سناؤ۔ اس سے مجھے دھچکا لگ جاتا۔"

"دھچکا..... کیوں؟"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے۔" افسار مسکرایا۔ "میں تو بس یہ سوچتا رہا ہوں کہ شادی کے سلسلے میں تمہارا سوڈ کیا ہے۔ میں اب تک اس بارے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر رہا ہوں لیکن آج جب یہ بات چھڑی گئی ہے تو میں پوچھ لیتا ہوں کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں؟"

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ بڑھاپا آنے تک شادی نہ کرنا عورت کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔"

"یعنی تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی ہو جائے.....؟"

"ہاں، میں ایسا چاہتی ہوں۔"

افسار نے اس طرح طویل سانس لی جیسے یہ جواب اس کے لیے اطمینان بخش ہو۔

"لیکن....." نیکم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے ڈر ہے کہ میں جس سے شادی کرنا چاہتی ہوں، شاید وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہو۔"

"کون ہے وہ؟" افسار نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "دفتر ہی کا کوئی شخص ہے..... میں جانتا ہوں اسے؟"

ایسا لگنے لگا جیسے تم بہت گھرمند ہو گئی ہو۔"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے افسار۔" نیکم نے غور سے افسار کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "وہیے کیاریم شادی کے لیے تیار ہو چکی ہے یا ہو جائے گی؟"

"اس سے ابھی میری کوئی بات نہیں ہو سکی لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ تیار ہو جائے گی۔ تم بھی جانتی ہو کہ زید کی طرف اس کا جھکاؤ بہت ہے۔ تم چھپرتی بھی رہی ہو اسے کہ وہ آخر کب شادی کرے گی۔ اتنی عمر تو ہو گئی ہے اس کی۔"

"تم نے تو مجھے اچھوت میں ڈال دیا۔ آخر کیسا موڈ ہو گا وہ؟"

"وہی تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھ میں نہیں آرہا ہے۔" زید کی نظر اس کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔

"تو پھر چھوڑو۔" رہمانے اس سے ہاتھ چھڑایا۔

زید نے فوراً اس کی گردن میں اپنا ایک بازو حاصل کر دیا۔ "آج سے پہلے تم مجھے اتنی اچھی نہیں لگیں۔"

"زیادہ پی لگے ہوتا!" رہمانے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کے چہرے پر قدرے اچھوت بھی پیدا ہوئی تھی۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ زید نے اس کی گردن میں بازو ڈال دیا تھا۔

"کیا میری زبان میں لکنت ہے؟" زید نے پوچھا۔ "نہیں، لکنت تو نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے بہت زیادہ نشہ نہیں ہوا۔" زید نے کہتے ہوئے ریمایا کا سر اپنے چہرے کی طرف جھکایا۔ اس وقت رہمانے اپنا سر پیچھے کرنے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہو زید!" اس کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

"آج میرے بہت قریب ہو جاؤ ریمایا!" اس مرتبہ زید کے لیے میں بھی لرزش تھی۔

"نہیں زید..... پلیز!"

لیکن اس مرتبہ زید نے ایک جھٹکے سے اس کا سر اپنے بالکل قریب کر لیا اور اس کے ہونٹوں نے ریمایا کے ہونٹوں سے کچھ کہہ بھی دیا۔

"پلیز زید!" ریمایا کے ہونٹ کاٹنے لگے۔ "جب یہ ملے ہو گیا کہ ہماری شادی ہو جائے گی تو پھر....."

زید نے ایک بار پھر اس کے ہونٹ بند کر دیے جس کے بعد ریمایا کو بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایک ایسی احساس سے آشنا ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"خیریت تو ہے؟" نیکم اپنے گھر پر اچھے ہوئے لیے میں افسار سے کہہ رہی تھی۔ "آج تم کبھی بار میرے گھر آئے ہو۔"

"ایک اطلاع دینا ہے تمہیں اور تمہارا بڑا بھی دیکھنا ہے۔"

"ایسی کیا اطلاع ہے.....؟"

"زید نے ریمایا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" "اوہ!" نیکم کے منہ سے نکلا اور وہ سنجیدہ بھی نظر آنے لگی۔ "کیوں؟" افسار بولا۔ "تمہارے چہرے سے تو....."



”وہ ناکام رہی تو ضروری نہیں کہ میں بھی ناکام رہوں۔“  
 نیلم نے ایک طویل سانس لی۔ ”اور اس کی پہلی شرط؟“  
 ”میں وہ مان لوں گی۔“  
 ”یعنی ماں نہیں ہوگی؟“  
 ”ہاں۔“ ریمانے کہا۔ ”میں زید کی خاطر ماں بننے کی خواہش کا گنا گھونٹ دوں گی۔“  
 ”یعنی ایسی دوا کی استعمال کرو گی؟“  
 ”ہاں۔“  
 ”لیکن شادی اس سے ضرور کرو گی؟“  
 ”ہاں۔ اگر میں تمہاری بات ماننے کے بارے میں سوچوں تو اب یہ ممکن نہیں۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ اپنی شرط پہلی ہی رات کو پیش کر دے گا۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”تو وہ پہلی رات ہم مزار پر چکے ہیں۔“ ریمانے نظریں جھکا لیں۔  
 ”کیا؟“ نیلم چونکی۔  
 ”ہاں۔“ ریمانے کہا۔ ”اس کا ایک سبب تو یہ کہ کل ابصار کی وجہ سے نہیں آسکا۔ دوپہر کو آکر جا چکا تھا۔ میں اکیلی ہی تھی اس کے گھر پر۔ کل وہ نوشاہہ سے ٹون پر بات کر کے اتنا ڈسٹرب ہو چکا تھا کہ ابصار کے جانے کے بعد ہی اس نے عینی شروع کر دی تھی اور مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ نئے کے عالم میں اس نے مجھے اپنے سنے سے لگالیا۔ میں اس کی محبت میں جھکا تو رہی ہوں۔ اس کا کس پار مجھے بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ میں ایک بیچے کے قریب اپنے گھر جا سکی تھی لیکن جو کچھ ہو گیا، اس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ پہلی رات گزار چکی ہوں۔ اب یہ ممکن بھی نہیں رہا کہ میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کروں اور سچی بات یہ ہے کہ میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتی۔ آج ویر سے دفتر اسی لیے آئی کہ ویر تک سوتی رہی تھی۔ زید کے اب تک نہ آنے کا سبب بھی نیند ہی ہو سکتی ہے۔“  
 ”رہا بونتی ہی اور نیلم دم پہ خود بیٹھی سب کچھ سن رہی۔  
 ”ریمانے پھر بولی۔ ”تمہیں تو میں نے سب کچھ بتا دیا لیکن مجھے امید ہے کہ تم ابصار کو یہ باتیں نہیں بتاؤ گی۔ اگر بتا دیں تو مجھے اس کا سامنا کرنے میں دقت ہوگی۔“  
 ”ویر چائے لے آیا۔ نیلم ہی پیالیوں میں چائے

”کیا تم ماں بننا پسند کرو گی شادی کے بعد؟“  
 ”بہت ہی غیر متعلق سا سوال کر بیٹھیں تم۔۔۔۔۔۔“  
 ”بہر حال۔۔۔۔۔۔ دیکھا میں ایسی عورت شاید ہی ہو جو ماں بننے کی خواہش مند نہ ہو۔“  
 ”تو کیا تم اس پر قادر ہو سکتی ہو کہ تم بیٹے ہی کی ماں بنو، بیٹی کی ماں نہ بنو۔“  
 ”یہ تو کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن تم نے پھر ایک عجیب سی بات کہی ہے۔“  
 ”عجیب تو ہے لیکن غیر متعلق بات نہیں ہے۔“  
 ”کیسے۔۔۔۔۔۔“  
 ”شادی کی پہلی ہی رات تم اس سے ایک عجیب و غریب شرط سنو گی۔“  
 ”کیا شرط ہوگی؟ اور تمہیں کیسے معلوم کہ وہ کوئی شرط پیش کرے گا؟“  
 ”یہ میں تمہیں شاید پھر کبھی بتا دوں۔“  
 ”کیا تمہیں نوشاہہ نے کچھ بتایا ہے؟“  
 ”میں نے کہا ہے، یہ میں پھر کبھی بتاؤں گی۔“  
 ”مگر وہ شرط کیا ہوگی؟ تمہیں ابھی بتانا پڑے گا۔“  
 ”یہی کہ تم کسی لڑکی کو ہرگز جنم نہیں دو گی اور اگر ایسا ہوا تو وہ موقع ملنے ہی اس لڑکی کا گنا گھونٹ کر مار دے گا۔ لڑکی کا باپ جتنا اسے سخت چاہتا ہے۔ کیا یہ اس کے ساتھ ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ نہیں؟“  
 ”یہ شرط رکھنا تو پاگل پن ہوگا۔“  
 ”اس لیے میں نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ بھی ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم بے تکلفانہ انداز میں بھی کسی کے قریب ہو سیں تو بھی اس کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس شخص کو مار ہی ڈالے۔“  
 ”ریمانے پڑی۔ ”تمہاری دوسری بات تو بہت مضحکہ خیز ہے۔ پیشہ ور قاتلوں کے علاوہ کسی شخص کے دماغ میں قتل کرنے کا خیال بھی نہیں آسکتا۔“  
 ”نیلم چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”چلو شیک ہے، میں تمہاری دوسری بات ماننے لیتی ہوں لیکن پہلی بات غیر فطری ہے۔“  
 ”اگر کسی کے دماغ میں کوئی نفسیاتی گرہ پڑ چکی ہو تو اس کے لیے کچھ بھی غیر فطری نہیں ہوتا۔“  
 ”اچھا! ریمانے طویل سانس لی۔ ”میں اس کا علاج کراؤں گی۔“  
 ”یہ نوشاہہ نے بھی چاہا تھا۔“

میرے علاوہ ابصار نے بھی محسوس کر لی تھی کہ تمہارا جھکاؤ زید کی طرف رہا ہے۔ میں اپنی بات دہراؤں گی کہ میں تمہیں صرف چھیڑا کرتی تھی لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری شادی زید سے ہو۔“ نیلم بونتی ہی چلی گئی۔ ”تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم بھی شادی نہیں کرو گی کیونکہ جس سے تم محبت کرتی ہو، وہ شادی شدہ ہے۔ کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے تمہارے اور میں سمجھ گئی تھی کہ تم زید کو چاہتی ہو اور کیونکہ وہ شادی شدہ ہے اس لیے تم نے زید کی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہی ہوں ریمانے؟“  
 ”آج شاید پہلی بار تم سنجیدگی سے بات کر رہی ہو، اس لیے میں بھی سنجیدگی سے جواب دوں گی کہ تم نے بالکل ٹھیک سمجھا تھا۔ میں اگر خواب بھی دیکھتی تھی تو خواب میں صرف اسی کو دیکھتی رہی ہوں۔“  
 ”ان دنوں نوشاہہ اور زید میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ ابصار کا خیال تھا کہ یہ اختلافات دیر پا نہیں ہوں گے۔ وہ خود بھی زید سے اجازت مانگ رہا تھا کہ وہ نوشاہہ کے گھر جا کر اسے سمجھائے۔ میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ ان دونوں میں صلہ ہو جائے گی لیکن کل ابصار سے یہ سن کر میری جان نکل گئی کہ ابصار نے نوشاہہ سے قطع تعلقی کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور وہ تم سے ہی شادی کا خواہش مند ہے۔“  
 ”نکل مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے۔“ ریمانے مسکرا کر کہا۔  
 ”کوئی بات ہوئی تھی اس کی تم سے؟“ نیلم نے چونک کر پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے شادی کے سلسلے میں؟“  
 ”ہاں۔“  
 ”پھر تو تم نے اس کی بات مان لی ہوگی۔“ نیلم نے تیزی سے کہا۔  
 ”یقیناً۔“ ریمانے کہا۔ ”یہ تو میرا خواب تھا۔“  
 ”اوکا ڈا!“ نیلم کے منہ سے نکلا۔ ”اپنا فیصلہ بدل دو ریمانے! تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔“  
 ”کیوں۔۔۔۔۔۔ بہتر کیوں ہوگا؟“ ریمانے کا لہجہ خشک ہو گیا۔  
 ”ہم لوگوں میں یہ بات اکثر ہو چکی ہے کہ زید کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ فیض اوقات وہ عجیب سی باتیں یا حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ کیا تم وہ باتیں بھول گئیں؟“  
 ”بالکل نہیں بھولی لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہوڑے بہت نفسیاتی مسائل ہر شخص کے ساتھ ہوتے ہیں۔“  
 ”زید کا معاملہ زیادہ گہیر ہے۔“  
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

اور رات تمہیں خواب میں دیکھتے ہوئے گزر رہی ہے۔“  
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ نیلم بھی خوش نظر آ رہی تھی۔  
 ”ایک بات تم سے نہیں بتائی۔“  
 ”کیا؟“  
 ”کس سے ہوئی تھی تمہاری شادی اور طلاق تک نوبت کیوں پہنچ گئی؟“  
 ”طلاق کا سبب میری کوئی غلطی یا میری کوئی خرابی نہیں تھی۔“  
 ”وہ تھا کیوں؟“  
 ”یہ باتیں اب چھوڑو ابصار! ذہنی اذیت ہوتی ہے مجھے! ابصار نے سوچا یہ بات وہ پھر بھی بعد میں معلوم کر لے گا۔“  
 ☆☆☆  
 دوسرے دن دفتر میں نیلم بڑی بے چینی سے ریمانے کا انتظار کر رہی تھی۔ ابصار دفتر میں نہیں تھا۔ گزشتہ دو دن سے وہ ایک رپورٹس پر کام رہا تھا۔ اسی سلسلے میں مصروفیت تھی۔ اس نے بتا بھی دیا تھا کہ اس کی واپسی میں دیر لگ سکتی ہے یا شاید آج وہ دفتر آئی نہ سکے۔  
 اس نے یہ بھی بتایا تھا، زید کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ دفتر آئے گا لیکن وہ بھی اب تک نہیں آیا تھا۔ نیلم کی خواہش تھی کہ ریمانے سے پہلے دفتر آجائے۔ وہ اس سے بڑی رازداری سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی اس لیے ضروری سمجھ رہی تھی کہ وہ زید سے پہلے آجائے۔  
 آخر وہ زید کے کھنڈے دیر سے آئی لیکن نیلم کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ زید اس وقت بھی نہیں آیا تھا۔  
 ”میرے ساتھ آؤ ریمانے!“ اس نے ریمانے کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے جانے لگی۔  
 ”بات کیا ہے نیلم!“ ریمانے حیرت سے پوچھا۔  
 ”اٹھیناں سے بیچہ کر بتاؤں گی۔“  
 ”ریمانے کا ذہن الجھا رہا۔ نیلم اسے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں لے گئی جہاں اس وقت زیادہ لوگ نہیں ہوتے تھے۔ جو لوگ تھے، نیلم نے ان سے کچھ واسطے کی میز کا انتخاب کیا۔  
 ”ویر فور اُن کے قریب آ گیا۔“  
 ”چائے لے آؤ۔“ نیلم نے اس سے کہا۔ ”صرف چائے۔“  
 ”ویر چلا گیا۔ ریمانے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میز پر تھے۔ نیلم نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے، پھر کہا۔ ”میں تمہیں اکثر چھیڑتی تھی کہ کب شادی کرو گی اور یہ بات



بتانے لگی۔ وہ گم سم سمی تھی ریمیا کی ساری باتیں سن کر۔  
”سچ بتانا نیلم!“ ریمیا بولی۔

”کیا؟“

”تم تو نہیں چاہتی تھیں زید سے شادی کرنا؟“

”تم نے شاید یہ سمجھا ہے کہ میں نے تمہیں زید سے

ڈرانے کے لیے یہ ساری باتیں کی ہیں؟“

”یونہی بس خیال آگیا تھا، لیکن تم نے بڑے اعتماد

سے جواب دیا ہے۔ میں سو رہی کرتی ہوں تم سے۔“

نیلم نے چائے کی ایک پیالی ریمیا کی طرف بڑھائی

اور کہا۔ ”کیا میں امید کروں کہ تم زید کو نہیں بتاؤ گی؟“

”کیا نہیں بتاؤں گی؟“

”جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے۔ زید میرا بھی بہر حال

ایک اچھا دوست ہے۔ ٹھیک نہیں ہوگا اگر میرے اور اس

کے تعلقات خراب ہو جائیں۔“

”میں بھی نہیں چاہوں گی کہ دفتر کا ماحول خراب ہو۔“

”اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“

”اب تکلفات میں نہ پڑو۔ ہم جس طرح پہلے بے

تکلف رہے ہیں، اسی طرح اب بھی رہنا چاہیے۔“

”شادی کا ارادہ کب تک ہے؟“ نیلم نے چائے کا

ایک گھونٹ لیا۔ ”کل جو کچھ ہو گیا، اس کے بعد تو ہماری شادی

جلد از جلد ہو جانی چاہیے۔ میں آج ہی اپنی والدہ سے بات

کروں گی۔ یقیناً وہ خوش ہو جائیں گی۔ والد بھی میرے

مسلسل انکار کی وجہ سے چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ وہ بھی

چاہیں گے کہ.....“ ریمیا ہنسی۔ ”وہ بھی چاہیں گے کہ میں

جلد از جلد ٹلوں۔“

”والدین سمجھی اپنی بیٹی کو بوجھ نہیں سمجھتے لیکن جب لڑکی

کی عمر زیادہ ہو جائے تو ان کا فکرمند ہونا فطری بات ہے۔“

نیلم نے چھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ایک بات

عجیب ہوئی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”کل ہی تم دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے اور کل

ہی ابصار سے میری بات ہوئی ہے۔“

”شادی کے سلسلے میں؟“ ریمیا چونکی۔

”اور کیا بات ہوگی؟“

”ویری گڈ۔“ ریمیا خوش ہو گئی۔ ”کیا اچھا ہوا اگر ہم

دونوں کی شادیاں ساتھ ساتھ ہوں۔“

”ہم ایک ہفتے کے اندر شادی کر لیں گے۔ شاید اس

سے پہلے بھی کر لیتے لیکن ابصار چاہتا ہے کہ آج کل وہ جو

رپورٹ تیار کر رہا ہے، اس کے بعد ہی شادی ہو۔“

”میرے والدین بھی میری شادی میں جلدی کریں

گے۔ انہیں کوئی تیاری تو کرنی نہیں ہے۔ میرا جہیز نہ جانے

کب سے تیار پڑا ہے۔“

”میرے معاملے میں جہیز کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم

دونوں بہت سادگی سے شادی کریں گے۔“

”کچھ بھی ہو، شادی ایک دن ہی کریں گے۔“

نیلم ہنس کر رہ گئی لیکن اس ہنسی میں بھی فکرمندی شامل

تھی جو ریمیا ہی کے سلسلے میں تھی..... اسے اندازہ تھا کہ ریمیا

ابھی جذبات میں بہہ رہی ہے۔ اسے کچھ بھی سمجھانا، کسی

طرح بھی سمجھانا بے سود ہوتا مگر مستقبل میں اس کے لیے

پریشانی کھڑی ہو سکتی تھی۔ ماں بننے سے بچنے کے لیے

دواؤں کا استعمال ٹھیک تھا لیکن کسی وقت بھول چوک ہو جائے

تو نوبت ماں بننے تک آ ہی جاتی ہے۔

ریمیا چائے پی چکی تھی۔

”اب چلنا چاہیے۔“ نیلم نے کہا اور کچھ فاصلے پر

کھڑے ہوئے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

بل آنے سے پہلے ہی ریمیا کے فون کی تھن پیج آئی۔

کال اس کی ماں کی تھی۔

”خیریت؟“ ریمیا نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”توقع

نہیں تھی کہ آپ فون کریں گی۔ مجھے تو یاد نہیں کہ آپ نے

مجھے اس وقت فون کیا ہو جب میں دفتر میں ہوں۔“ پھر وہ

دوسری طرف کی کچھ بات سننے لگی۔ نیلم خاموشی سے اس کے

چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے ریمیا کے چہرے پر

حیرت کا تاثر دیکھا۔ وہ بولی۔ ”لیکن کیوں؟..... خاص

بات؟..... وہ آپ مجھے فون پر بتا دیں۔“ کچھ سننے کے بعد

اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اچھا..... آتی ہوں۔“

اس نے فون بند کیا۔

”کیا بات ہے ریمیا!“ نیلم بولی۔ ”ابھی کیوں بلایا

ہوگا انہوں نے تمہیں؟“

”صرف بلایا ہی نہیں ہے، یہ بھی کہا ہے کہ ایک ہفتے

کی چھٹی لے کر آنا۔“

”اوہو! ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”مجھے تو ایک ہی خیال آیا ہے۔“ ریمیا نے مسکراتے

ہوئے کہا۔ ”کسی وجہ سے میرے والدین نے فوری طور پر

میری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی لیے ایک ہفتے کی چھٹی کی

بات کی ہے اور تو کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی کہ اتنے دن کی



چھٹی پلٹی پڑے۔

وینر پل آئے۔ ادا کرنے کے بعد دونوں انھیں۔  
"نیلیم!" ریمانے ریلوڈنٹ سے نکلے ہوئے کہا۔  
"اس سے تو مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اب رہی خواہش تو وہ تم پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم ابصار سے کہو تو کیا وہ اپنی رپورٹ مکمل کرنے سے پہلے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگا؟"

"بات کرو گی اس سے۔"

"ضرور کرنا۔"

ریمان اپنی شادی کے خیال سے اتنی خوش تھی کہ دفتر میں داخل ہونے تک اسی بارے میں بات کرتی رہی۔ پھر وہ یہ کہہ کر اپنی میز کی طرف چلی گئی کہ چھٹی کی درخواست نامیپ کر لے۔ نیلیم اسے چھوڑ کر ابصار کی میز پر پہنچی۔  
"کہاں تھیں؟" ابصار نے پوچھا۔

"جائے پینے کے لیے ریمان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ تم اس وقت تک آئے نہیں تھے۔"

"ٹریک جام میں پھنس گیا تھا۔ غیر معمولی طور پر بہت دقت خالص ہو گیا۔ کیا بات ہے، اس وقت تم بہت سنجیدہ نظر آ رہی ہو؟"

"کل جب تم نے ان دونوں کی شادی کی بات کی تھی تو مجھے سنجیدہ نہیں ہوئی تھی کیا؟"  
"ہاں، ہوئی تو تھیں لیکن پھر ایسی باتیں چھڑ گئیں کہ میں تمہاری سنجیدگی کا سبب پوچھتا ہی بھول گیا تھا۔ خیال ہی نہیں رہا تھا اس کا۔"

"اس وقت بھی میں اسی وجہ سے سنجیدہ ہوں۔ اس بارے میں ریمان سے ابھی بات بھی کر چکی ہوں۔ دوست ہوں اس کی۔ میں بھی نہیں چاہوں گی کہ وہ اپنی زندگی مشکلات میں ڈالے۔ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے ابصار!"

ابصار اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔  
"ہاں۔" نیلیم نے زور دے کر کہا۔ "ریمان کی شادی زید سے نہیں ہونی چاہیے۔"

"وجہ؟"

"اب میں وجہ تمہیں آج ہی بتا دوں گی لیکن پہلے ایک کام اور کرنا ہے۔ یہ کوشش کرنا ضروری ہے کہ یہ شادی نہ ہو۔"

"اب کیا کوشش ہو سکتی ہے؟"

"کسی طرح بھی نوشاہ کو آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ زید کے پاس واپس لوٹ جائے۔"

"جب زید نا کام رہا تو ہم کیا کر سکیں گے نیلیم!"

"کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔"

"ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعد میں جب زید کو یہ بات معلوم ہوگی تو اس کا اثر ہمارے تعلقات پر پڑ سکتا ہے۔"

"نہیں بڑے گا۔"

"اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو؟"

"نوشاہ کی واپسی زید کے لیے خوش گوار ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ نوشاہ سے اس کی محبت کم نہیں ہوگی۔ کیا بھول گئے کہ اس واقعے سے اس کے ذہن پر اتنا دباؤ پڑا تھا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا۔"

"لیکن اب وہ طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

"جذباتی وار غصے کا فیصلہ ہے جو نوشاہ کی واپسی سے تبدیل ہو سکتا ہے۔" نیلیم نے کہا۔ "اب تم باتوں میں دقت خالص نہ کرو۔ زید اب تک دفتر نہیں آیا ہے۔ کہیں وہ طلاق نامہ تیار کرانے کے لیے کسی وکیل کے پاس نہ چلا گیا ہو۔"

"یہ تو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" ابصار نے کہا اور فوراً ہی اپنے موبائل پر زید سے رابطہ کیا۔

"ہاں ابصار! دوسری طرف سے آواز آئی۔  
"میرے دفتر نہ آنے کی وجہ بتانا چاہتے ہو گے؟"

"ہاں، یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔"  
"کل رات کچھ ایسا ہوا کہ میں بہت دیر تک جاگا۔ ابھی آنکھ کھلی ہے۔ ناشتا کر کے وکیل کی طرف جاؤں گا۔ میں یہ معاملہ آج ہی نمٹا دینا چاہتا ہوں۔ ویسے شام سے پہلے چکر لگاؤں گا دفتر کا۔"

"اچھا، بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔" ابصار نے رابطہ منقطع کر دیا۔

نیلیم اس کے قریب ہو کر ابصار کی باتیں سنتی رہی تھی۔ جیسے ہی ابصار نے رابطہ منقطع کیا، وہ جلدی سے بولی۔ "اب ہمیں ایک منٹ بھی خالص نہیں کرنا چاہیے۔ نوشاہ کو دو گھنٹے کے اندر اندر اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ زید کو گھر سے نکلنے میں گھنٹا بھر تو لگ ہی جائے گا۔ اس کے وکیل کا دفتر بھی اس کے گھر سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ پھر دونوں میں بات چیت ہوگی۔ اس کے بعد ہی ڈرافٹ بننے کی نوبت آئے گی جس میں ایک گھنٹے سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔"

ابصار کھڑا ہو گیا۔ "اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو کیا یہ ریمان کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟"

"میں اسے بہت کچھ سمجھا تو بچی ہوں۔ بعد میں زیادہ واضح طور پر بھی اسے بہت کچھ بتا سکیں گی۔"

سنگین خامتہ

"ابھی کیا باتیں ہوئیں؟"

"کہا تو ہے کہ بتا دوں گی۔ بات لمبی ہے۔ ابھی میرا ذہن صرف نوشاہ میں الجھا ہوا ہے۔"

وہ دونوں ریمان سے ملے بغیر ہی روانہ ہو گئے۔ کار ابصار کی تھی۔

"ذرا تیز چلاؤ۔" نیلیم نے کہا۔

رفقار خاصی تھی لیکن نیلیم کے کہنے پر ابصار نے کچھ اور بڑھا دی۔

☆☆☆

نوشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ صرف ایک سال کام کیا تھا جبکہ یہ اس کی مالی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے والد ایک اچھے بڑے تاجر تھے۔

ان دونوں کا استقبال کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تم دونوں کیوں آئے ہو۔"

"ان حالات میں ہونا بھی چاہیے۔" نیلیم نے کہا۔  
"زید کو ظلم ہے اس کا؟"

"نہیں۔ وہ تو فیصلہ کر ہی چکا ہے۔"

"عمل نہیں ہوگا اس پر! نوشاہ خفیف سمسٹرانی۔ اس نے فون پر بات کرتے ہوئے غصہ تو دکھایا تھا لیکن میں اسے بھی اسے دھکیلے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ مجھ کو بہت چاہتا ہے۔ مجھ سے دور رہنا تو وہ گوارا کر لے گا لیکن مجھے طلاق نہیں دے گا۔"

"اس کی دوسری شادی؟"

"وہ بھی میں صرف دھکیں سمجھتی ہوں۔"

"وہ اس وقت طلاق نامہ تیار کروانے کے لیے وکیل کے پاس جا رہا ہے۔"

"کیا؟" نوشاہ چونکی پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔ "نہیں..... نہیں ہو سکتا۔"

"ابھی فون پر ابصار کی بات ہو چکی ہے۔" نیلیم نے کہا، پھر ابصار سے بولی۔ "ایک بار پھر فون کرو اسے۔"

نوشاہ کو بھی اس کا جواب سنا دو۔  
ابصار نے اپنا موبائل سنبھالا۔ اب نوشاہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر ابصار۔ ابصار نے موبائل کا آئینہ آن کر دیا تاکہ زید کی آواز وہ بھی سن سکے۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" زید نے ہنس کر کہا۔ "ابھی فون کر چکے ہو مجھے۔ شاید یون گھٹا ہوا ہوگا۔"

"کسی خیال سے فون کیا ہے تمہیں۔ اب تم کہاں ہو؟"

"تقریباً تیار ہو چکا ہوں۔ گھر سے نکلنے ہی والا ہوں۔"

تمہیں بتا چاقا میں نے کہ میں وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔"

"یعنی آج ہی طلاق نامہ نوشاہ کو بھیجنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"میں نے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے تمہیں کہ ایک آدھ دن اور رک جاؤ۔ ممکن ہے بھرتی کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔"

"اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے ابصار! زید کی آواز آئی۔ "میں دفتر آتا تو بتا چاقا تمہیں۔ کل ریمان سے بات ہو چکی ہے میری۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہے۔"

نیلیم اس وقت نوشاہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ طلاق کے لفظ سے لے کر ریمان کا نام آنے تک اس کے چہرے کا رنگ پیکا پڑتا چلا گیا تھا۔

زید کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ "میں اگر اس سے کہوں کہ ہمیں آج ہی شادی کر لیتا چاہیے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ بات اب اس حد تک بڑھ چکی ہے۔ کل وہ مجھ سے جسمانی طور پر بھی قریب ہو چکی ہے۔"

نیلیم نے اس وقت تک ابصار کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ابصار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نیلیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت نوشاہ کا چہرہ حق پر چکا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم زید! ابصار کی آواز دہلی دہلی سی تھی۔

"تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ میں تم سے اتنی بڑی بات جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں۔ اچھا اب میں فون بند کر رہا ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔ ساری تفصیل ملاقات پر بتاؤں گا۔"

دوسری طرف سے زید نے رابطہ منقطع کیا اور اپنی ٹائی کی ٹاٹ ٹھیک کرنے کے لیے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کوٹ پہنا اور کار کی چابی انگلی میں گھماتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بہت آسودہ نظر آ رہا تھا، جیسے نوشاہ کی نسبت سے ساری انخیاں بھلا چکا ہو۔ ریمان کی قربت نے اس پر ایسا اثر طاری کیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے تک اس نشے سے سرشار رہا تھا۔ نوشاہ کی قربت اب اسے اتنی آسودگی نہیں دے پاتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ایک اچھے وکیل کے دفتر میں تھا۔ فون پر پہلے ہی اس سے بات ہو چکی تھی۔ وکیل نے بتا دیا تھا کہ آج اسے کسی کیس کے سلسلے میں عدالت نہیں جانا لہذا زید کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔

وکیل کے دفتر کی سیڑھیاں ملے کرتے ہوئے اپنی



مسل نہیں ہوگا۔ والد سے بات کرنے کے بعد والدہ نے آنے کا اشارہ کیا۔  
مجھے فون کیا۔

☆☆☆

نوشاب نے موبائل پر زید سے رابطہ کیا۔  
”مجھ۔“ زید کی آواز آئی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم خود  
مجھے کبھی فون نہیں کرو گی۔ جب سے کئی ہوں میں نے ہی تمہیں  
دوسرے فون کیا ہے۔“  
نوشاب نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور بولی۔

”کہاں ہو اس وقت؟“  
”ایک کام سے نکلا ہوا ہوں۔“ زید نے کہا۔  
”کیوں؟“

”ابھی مل مجھ سے۔“  
”عجب اتفاق ہے۔“ زید نے کہا۔ ”آج میں نے  
یہ دوسری ایسی کال ریسیو کی ہے کہ مجھ سے فوراً ملنے کے لیے  
کہا گیا۔ تم کہاں سے بول رہی ہو؟“

”اپنے گھر سے۔“  
”کوئی خاص معاملہ طے کرتا ہے؟“ زید کا انداز  
طنز یہ تھا۔ ”طلاق کے کاغذات میں آج تیار نہیں کر سکا۔  
کچھ دوسرا کام آن پڑا تھا۔“

”کب تک آسکتے ہو؟“  
”ایک گھنٹہ لگے گا۔“ کچھ ضروری کام سنا ہوا آؤں گا۔“  
”میں انتظار کروں گی۔“ نوشاب نے کہا اور فون بند  
کر دیا۔ اس کے چہرے پر گہری تنجید کی تھی۔ وہ ہلکتی لگی۔  
آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اس نے باہر کی کار کے رکنے  
کی آواز سنی۔ اس کے اعصاب میں کچھ تناؤ آ گیا۔ اس نے  
انجن کی آواز سے سمجھ لیا تھا کہ وہ زید ہی کی کار ہے۔

ایک منٹ بعد ہی اس نے تیز چڑھتے ہوئے قدموں  
کی آواز سنی۔ پھر زید سامنے آ گیا لیکن سامنے آتے ہی  
چونک پڑا۔ ”تم؟“ اس کے منہ سے نکلا۔  
”ہاں۔“ نوشاب نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”تم نے تو مجھے اپنے گھر بلا یا تھا۔“  
”کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ ابھی مجھے طلاق تو نہیں دی  
تم نے۔ طلاق ہو جاتی تو پھر یہ میرا گھر نہیں رہتا۔“  
”میرا خیال تھا کہ تم اپنے والد کے گھر سے بول  
رہی تھیں۔“

”اپنے والد کے گھر کو میں اپنا گھر کیسے کہہ سکتی  
ہوں۔ میرا گھر تو یہی ہے جہاں میں تمہارے ساتھ برسوں  
رہی ہوں۔“

زید نے ایک طویل سانس لی پھر اپنے کپڑوں پر نظر

”شادی ٹلنے کا سبب دوسرا ہے۔“ ریمانے کہا۔  
”والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اب میری شادی اس وقت تک  
نہیں ہو سکتی جب تک چچا چھک نہ ہو جائیں۔ والد میری  
شادی میں چچا کی شرکت چھٹی سمجھتے ہیں۔ تو ان کے  
تحریرت ہونے میں اور پھر یہاں آنے میں سات آٹھ  
مہینے لگ سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ زید نے سر ہلایا۔ ”اس بات نے تمہیں  
واقعی پریشان کر دیا ہوگا۔ تم نے اپنی والدہ سے کیا کہا؟“

”میں کیا کہہ سکتی تھی ان سے۔۔۔۔۔۔ بس ایک ہی  
بات ذہن میں آئی کہ ہم آج ہی سول میرج کر لیں۔  
میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ عدالت قریب ہے۔ اس  
سے پہلے کہ عدالت کا وقت ختم ہو جائے، ہمیں کورٹ  
میرج کر لینا چاہیے۔ میں میرج کا سرٹیفکیٹ اپنی والدہ  
کو دکھا دوں گی۔ اس طرح میرے نہ جانے کی راہ ہموار  
ہو جائے گی۔“

زید مسکرایا۔ ”جب یہ مل تم نے سوچ لیا تھا تو اتنی  
پریشانی کا کوئی جواز نہیں جتا۔ تم ہی نے کل کہا تھا کہ شادی  
دعوم و حام سے ہونا چاہیے ورنہ میں تو۔۔۔۔۔۔“

ریمانے اس کی بات کاٹی۔ ”پریشانی یہ تھی کہ اگر تم  
سے رابطہ نہ ہو سکا اور عدالت کا وقت ختم ہو گیا تو مشکل  
ہو جائے گی۔ لیکن ہے کہ سٹینس آج ہی کی کسی فلائٹ میں بک  
ہو جائیں۔“

”خیر!“ زید نے اطمینان سے کہا۔ ”عدالت کا وقت  
ختم ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ ہم ابھی شادی کر لیتے  
ہیں۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“

”یقیناً۔“ ریمانے اس ملاقات کے دوران میں پہلی بار  
مسکرائی۔

”کچھ ہو گی؟ میں نے تو تمہارے انتظار میں ابھی  
کچھ بھی نہیں کیا۔“

”اگر وقت ہے تو کچھ منگو لو۔“  
”وقت تو کافی ہے۔“ زید نے کہا اور وٹر کو قریب

سے کہا کہ چائیک ایک ضروری کام آ پڑا ہے اس لیے وہ اب  
کل آئے گا۔

”کل میں اس وقت عدالت میں ہوں گا۔“ وکیل  
نے کہا۔ ”دو گیس ہیں کل میرے۔ کل آپ تیسرے پہر کے  
بعد آئے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ زید نے کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور چند  
قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی کار کے قریب پہنچ گیا۔

دس منٹ بعد وہ اس ریسٹورنٹ میں تھا جس کا نام ریمانے  
نے دیا تھا۔

ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ شادی رک جائے؟ اس  
کے اچھے ہوئے دماغ میں یہ بات اس وقت تک گونجی رہی  
جب تک ریمانے آ گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے  
تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جلدی میں اسے اپنا حلیہ  
درست کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ہو۔ لپ اسٹک بھی ہلکی  
ہو چکی تھی۔

زید بولا۔ ”میں تم سے فون پر بات کرتے ہوئے  
زیادہ نہیں الجھا تھا لیکن تمہاری حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا  
ہوں کہ آخر کیا ہو گیا۔“

”ہاں زید! میں ڈر میں اب نہیں ہو سکتی۔ بہت جلدی  
تھی مجھے!“

”آخر ہوا کیا ہے کہ۔۔۔۔۔۔“

ریمانے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں دفتر میں تھی  
جب وہاں میری والدہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے نہ  
صرف فوراً گھر آنے کے لیے کہا کہ بلکہ ایک ہفتے کی چھٹی  
لینے کی بھی بات کی۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ اب کسی  
وجہ سے والدین میری شادی فوراً کرنا چاہتے ہیں ورنہ پچھلی  
لینے کی اور کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس وقت میری  
خوشی خاک میں مل گئی جب میں گھر پہنچی۔“

”وہ کیوں؟“ زید نے فوراً پوچھا۔

”میرے والد کے چھوٹے بھائی امریکا میں رہتے  
ہیں۔ ان کا فون آیا تھا کہ اس کے پاس۔۔۔۔۔۔ چچا کا اسکینڈل  
ہو گیا ہے اور اتنا شدید ہوا کہ انہیں تحریرت ہونے میں کم  
از کم چھ ماہ لگیں گے۔ والدہ نے سب سے پہلے تو بے اطلاع  
والد صاحب کو فون پر دی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بہت  
محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے فوراً امریکا جانے کا فیصلہ سنا  
دیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ جلد از جلد ملنے والی فلائٹ میں تین بیٹنیں  
بک کر ورتے ہیں۔ یعنی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا  
چاہتے ہیں۔ ہم ایک بار امریکا جا چکے ہیں۔ ویزے کا کوئی

جیب میں پڑے موبائل کی گھنٹی سنائی دی۔  
”کیا پھر ابصار کے پیٹ میں درد اٹھا ہے؟“ اس  
نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے موبائل نکالا اور پھر اسکرین پر  
نظر پڑنے ہی مسکرایا۔

”اسے اب کبھی لے بھی میرے بغیر جین نہیں  
آسکتا۔“ اس نے دوبارہ بڑبڑاتے ہوئے موبائل کان سے  
لگایا اور زینے پر ہی رک گیا۔

”ہاں رہا!“ وہ بولا۔ ”یہ پوچھنے کے لیے فون کیا  
ہوگا کہ طلاق نامہ تیار کر دیا میں نے یا نہیں؟ میں تمہارے  
سوال کرنے سے پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں اس وقت اپنے  
وکیل کے دفتر کی میز دھیاں طے کر رہا تھا۔“

”مجھے کچھ اور کہنا ہے زید!“ ریمانے کی آواز آئی۔ ”تم  
مجھ سے فوراً ملو۔“

”کیا ہو گیا؟“ زید کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

”ملنے پر بتاؤں گی۔“  
”وکیل سے کام کرو کہ کل لوں گا۔“  
”نہیں۔ یہ کام پھر کبھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کوئی ایسا کام آ پڑا ہے جو آج ہی  
کرنا ضروری ہے؟“

”آج نہیں، ابھی۔“ ریمانے زور دے کر کہا۔

”ایسا کیا ہو گیا جان من؟“  
”ہماری شادی ٹل سکتی ہے۔“  
”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ زید نے تیزی سے کہا۔

”ابھی تم وکیل کے دفتر کی میز دھیاں پر ہونا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ کیوں؟“  
”مجھے علم ہے تمہارے وکیل کا دفتر کہاں ہے۔“ ریمانے  
نے کہا اور پھر ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام لیا جو وکیل کے دفتر  
سے بہ مشکل دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

”یہ تو یہاں سے بہت قریب ہے۔“

”اسی لیے اس کا نام لیا ہے میں نے۔ میں وہاں پہنچ  
رہی ہوں۔ میں کچھ منٹ لگیں گے۔ انتظار کر لینا میرا۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“  
”میں اپنے گھر پر ہوں۔ اچھا بس۔۔۔۔۔۔“  
”دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔“

زید نے طویل سانس لے کر موبائل بند کرتے  
ہوئے جیب میں ڈالا اور سیز دھیاں اترنے لگے۔ سیز دھیاں  
اترے ہی اسے خیال آیا کہ وکیل تو اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔  
اس نے دوبارہ موبائل نکالا اور وکیل سے رابطہ کر کے اس



ڈالی جس پر کچھ کی چھینٹیں بڑی ہوئی تھیں۔  
 "ان چھینٹوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" نوشابہ بولی۔  
 "مجھے تم سے بات کرنا ہے، ان چھینٹوں سے نہیں۔"  
 "اچھا۔" زید ہنسا۔ "تو آؤ بیٹھو، کر دیا۔" وہ خود بھی آگے بڑھ کر بیٹھ گیا۔ نوشابہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔  
 "فیصل کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔  
 "وہ اپنے نانا کے پاس ہے، میں اکیلی آئی ہوں۔"  
 "اچھا!" زید نے طویل سانس لی۔ "کیا بات کرنے آئی ہو؟"

"صرف دو باتیں۔" نوشابہ نے کہا۔ "اب میں واپس آگئی ہوں۔ مطلب یہ کہ نہیں رہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ تم دوسری شادی نہیں کرو گے۔"  
 "تم نے فون پر کہا تھا کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"  
 "وہ میں نے اس یقین سے کہا تھا کہ تم صرف دھمکی دے رہے ہو۔ تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے کہ اس بارے میں سوچو گے بھی نہیں۔ مجھے مٹانے کی کوشش جاری رکھو گے اور آخر میں ایک شرط پر میں واپس بھی آ جاؤں گی۔"

"وہ شرط کیا ہے..... یا کیا ہوگی؟"  
 "ایک نہیں بلکہ دو شرطیں۔" نوشابہ نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ فیصل اب نانا ہی کے پاس رہے گا۔ میں وہیں جا کر اس سے مل آ یا کروں گی۔ تم بھی جا کر اس سے مل سکتے ہو لیکن میرے ساتھ ہی چلو گے۔"  
 "یہ شرط تو میں نہیں مان سکتا۔ یہ بات..... بلکہ بے لگی بات آخر تم نے سوچ کیسے لی اور کیوں سمجھ لیا کہ میں یہ شرط مان جاؤں گا؟"

"یہ تو ماننا پڑے گی تمہیں!" نوشابہ نے زور دے کر کہا۔ "میں اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔"  
 "خطرہ؟" زید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 "کیسا خطرہ؟"

"تم اسے مار ڈالو گے۔"  
 "میں اسے مار ڈالوں گا؟" زید حیرت سے بولا۔  
 "پاکل ہوئی ہو کیا؟"

"پاکل تو تم ہو زید!..... کئی بار کوشش کر چکی ہوں کہ تم اپنا نفسیاتی علاج کروالو۔ تمہارے ذہن میں یہ بات نہ جانے کیسے جم گئی ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے تم اسے مار سکتے ہو۔"  
 "یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں یہ بات

مذاق کہا کرتا تھا۔"  
 "میں نہیں مان سکتی اور تمہیں میری یہ شرط ماننی ہوگی کہ فیصل اب اپنے نانا ہی کے پاس رہا کرے گا۔"  
 "میں یہ شرط نہیں مانوں گا۔" زید نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
 "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں فیصل کے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی؟"  
 "ہاں۔"

"میرا خیال تھا کہ تمہیں مجھ سے شدید محبت ہے۔ تم میری یہ بات مان لو گے لیکن تمہارے نہ ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں غلط فہمی کا شکار رہی ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اور جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا تو میرے دل میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ شاید نہ رہے۔" نوشابہ کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے ابھی یہاں آنے کا فیصلہ بہت غلط میں کیا تھا، پھر بھی سوچا تھا کہ یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتے ہو۔ اس لیے میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ اگر تم نے میری شرط نہ مانی تو بھی میں اب یہیں رہوں گی۔"

"طلاق کے بعد اس کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔"  
 "تم مجھے طلاق نہیں دے گے۔ اس لیے نوشابہ کے لہجے میں جارحیت تھی۔  
 "مجھے یہ قدم اٹھانے سے کون روک سکتا ہے؟"  
 "اس صورت میں تم جیل کی آہنی سلاخوں کے چبھے ہو گے۔"  
 "اچھا!" زید طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "طلاق دینا اتنا بڑا جرم ہوگا؟"

"طلاق دینا جرم نہیں ہوگا۔ تمہارا جرم اس گھر کے پائیں بارش میں دفن ہے۔"  
 "زید کو خاصا ذہنی جھکا لگا۔" تم اس حد تک جاؤ گی؟"  
 "جب تم کسی حد تک بھی جاتے نظر آؤ گے تو پھر مجھے بھی ہر حد تک جانا پڑے گا۔" غصے سے زید کی مٹھیاں جھنجھکیں۔

"ابھی مجھے بھی اسی وقت نکل کرنے کا فیصلہ نہ کر بیٹھنا۔ میرا قتل تمہیں فوراً ہی جیل میں پہنچانے کا سبب بن جائے گا۔ یہاں آنے کی بجائے کہ باوجود میں مدفن لاش کے بارے میں لگھ کر نہیں محفوظ کر آئی ہوں۔ اگر میں نے روزانہ یہاں سے اپنے گھر فون نہ کیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ اس صورت میں میری وہ تحریر پولیس تک پہنچادی جائے گی۔"

سنگین خاتمہ

ان باتوں کی وجہ سے زید کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا جسم ٹھٹھل ہونے لگا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔  
 "وہ کل میں نے تمہاری محبت میں ہی کیا تھا۔ اس کی وہ باتیں میں برداشت نہیں کر سکا تھا جو اس نے تمہارے بارے میں کی تھیں۔"

"تو اب میری محبت ہی کی وجہ سے تمہیں میری شرط بھی مان لینا چاہیے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ میں تمہارا علاج کسی ماہر نفسیات سے کراؤں گی اور جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو فیصل بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے گا۔ ہماری زندگی پہلے ہی کی طرح خوشگوار ہو جائے گی۔"

زید ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹھٹھلے لگا۔ اب اس کے دل میں نوشابہ کے لیے ذرا بھی محبت نہیں رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ اب نوشابہ سے نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔  
 اس مسئلے کا کیا حل ہو..... وہ سوچ رہا تھا اور ٹھٹھل رہا تھا۔ نوشابہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ دس منٹ گزر گئے۔

"کب تک سوچو گے زید؟" نوشابہ بولی۔  
 "زید اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم ان معاملات میں حق بجانب ہو یا نہیں۔ آخر میری سمجھ میں آ گیا کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن میری بھی ایک بات تمہیں گوارا کرنا ہوگی۔ وہ بات میری مجبوری ہے۔"

"کیا مجبوری ہے تمہاری؟"  
 "میں شادی کر چکا ہوں۔"  
 "نوشابہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت بلندی سے نیچے گری ہو۔ اس نے تو زید کے پاس واپس آنے میں جلدی اسی لیے کی تھی کہ زید کو دوسری شادی کرنے کا وقت نہ مل سکے۔  
 "تم جھوٹ بول رہے ہو۔" نوشابہ کی آواز کا ٹپ تھی۔  
 "میں تمہیں میری سرفیقیت دکھا سکتا ہوں۔"  
 "عدالت کی شادی؟"

"ہاں۔" زید نے جواب دیا۔ "جب تم نے مجھے فون کیا، اس سے ذرا ہی پہلے ہماری شادی ہو گئی تھی۔"  
 "اگر یہ سچ ہے تو..... عدالتی شادی جتنی جلدی کی جاسکتی ہے، اتنی ہی جلدی قسم بھی کی جاسکتی ہے۔"  
 "میں اس لڑکی کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کر سکتا جس نے میری محبت میں شادی سے پہلے ہی اپنا آپ مجھے سونپ

دیا ہو۔"  
 "وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن....." نوشابہ ایک دم چپ ہو گئی۔  
 "زید چونکا۔" تمہیں کیسے معلوم؟"  
 "نوشابہ کو احساس ہوا کہ اس کے منہ سے یہ بات نہیں نکلتا چاہیے تھی۔ اسی لیے وہ بولنے بولنے لگا ایک چپ بھی ہوئی تھی۔  
 "میں معلوم ہو گئی کسی طرح؟"  
 "یہ بات میں نے صرف ابصار کو بتائی تھی۔ کیا وہ آیا تھا تمہارے پاس؟"  
 "میرے پاس کوئی نہیں آیا۔"  
 "زید سوچ میں پڑ گیا۔ نوشابہ نے محسوس کیا کہ زید نے اس کے جواب پر یقین نہیں کیا ہے۔  
 "موبائل کی گھنٹی بجی۔ زید چونکا۔ گھنٹی کی آواز اس کی جیب سے آئی تھی۔ اس نے موبائل نکالا۔ کال ریمارک تھی۔  
 ☆☆☆☆  
 "کہو ریمارک! ریمارک نے اپنے موبائل پر زید کی آواز سنی۔ "سرفیقیت دکھا دیا تم نے اپنی والدہ کو؟"  
 "والدہ بھی مجھے گھر پر۔"  
 "اچھا بھروسہ؟"  
 "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے زید! ریمارک نے کہا۔ "میں تمہاری ہی طرف آ رہی ہوں۔ گھر پر ہو؟..... تم نے کہا تھا کہ....."  
 "ہاں گھر پر ہی ہوں....." زید نے اس کی بات کاٹی۔  
 "پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ تم سے مل کر بتاؤں گی لیکن مائے ہی میں آئی ہے پٹینی بڑی کہ میں فون کرنے سے نہ سکی۔"  
 "کیا گڑبڑ ہو گئی ہے؟ تمہاری آواز سے تو پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ معاملہ کچھ یا وہ ہی گڑبڑ ہے کیا؟"  
 "ہاں زید!..... ڈیڈی تو سرفیقیت دیکھ کر آ رہے سے باہر ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے اور اب مجھی میں اپنی صورت نہ دکھانا۔"  
 "اوہ!"



"اور ابھی تو مارکیٹ بھی نہیں کھلی ہوئی۔"  
 "مبارک بچے تنگ نکلیں گے مگر ہے۔"  
 "جب ٹھیک رہے گا۔"  
 "ناشا کر کے کچھ دیر لان میں ٹھہریں گے۔ دیکھوں تو کیا حال ہے لان کا۔"  
 "کیا مانی نہیں ہے؟"

"چھ سات دن سے بیمار تھا۔ ابھی چونکیدار نے آکر بتایا کہ گزشتہ شام اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ چونکیدار کو بھی یہ اطلاع کسی سے ابھی ملی ہے۔ میں اسے جنازے میں شرکت کے لیے چھٹی دے دیتا لیکن اسی نے بتایا کہ کل رات ہی اس کی تدفین ہو چکی ہے۔"

"اوہ..... کیسا مانی تھا؟ میرا مطلب ہے کام اچھا کرتا تھا یا۔"  
 "کام تو اچھا کرتا تھا۔ بہر حال اب دوسرا مانی تو رکھتا ہی بڑے گا۔ لیکن کچھ دن بعد رکھوں گا۔ میں لان میں کچھ تبدیلی کرانا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ لان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہو اور مانی نہیں رکھو گے؟ تو کیا خود کرو گے تبدیلی؟"  
 "مانی کا کام نہیں ہوگا جو میں کروانا چاہتا ہوں۔"  
 "کیا کروانا ہے؟"

"جہیں نہیں کھیلنے کا بہت شوق ہے نا؟"  
 "ہاں۔ چھٹی کے دن ضرور جاتی ہوں۔"  
 "حق مانی لان خاصا بڑا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ وہاں ایک ٹینس کورٹ بنوایا جائے۔"

"اقتی زیادہ جگہ ہے لان میں؟"  
 "بہت زیادہ جگہ تو نہیں ہے لیکن شوقیہ طور پر چھوٹا کورٹ بھی بنوایا جاسکتا ہے۔ میں ٹینس بہت شوق سے دیکھتا ہوں لیکن کھیلنا نہیں جانتا یہاں تم سے سیکھ لوں گا۔ شام کو ہم دونوں ٹینس کھیلنا کریں گے۔"

"واہ!" ریمیا ہنس دی۔  
 "انجی باتوں میں ناشتا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں عقبی لان میں گئے۔ ریمیا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک ہی جگہ پودوں کا جھنڈ بڑی خوب صورتی سے بنایا گیا ہے۔"  
 "مانی خود ہی سب کچھ کرتا رہتا تھا۔"  
 "یہ جگہ معلوم ہوتا ہے کھودی گئی ہے۔ یہاں مانی کچھ اور بنانا چاہتا ہوگا لیکن..... تم نے ابھی بتایا نا کہ وہ کچھ دن سے بیمار تھا۔"

نیلیم اسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔

☆☆☆

دوسری صبح ریمیا کی آنکھ کھلی تو زید اس کے پہلو میں نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ روم سے آئی ہوئی، پانی کے گرنے کی مدد آواز سنی۔

نہا رہا ہے..... ریمیا کو خیال آیا اور پھر اس کے ذہن میں گزری ہوئی رات کی باتیں گونجنے لگیں۔ زید بہت رونا ٹھک باتیں کرتا رہا تھا۔ ریمیا نے نوشاہہ کے بارے میں بات کرنی چاہی تو زید نے کہا تھا۔

"اب آئندہ بھی تم اس کا نام بھی نہ لینا۔"  
 ریمیا نے بے چون و چرا اس کی بات مان لی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس معاملے میں زید کا سوز غراب ہو۔ اس نے محتاط ہو جانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس سے پہلے نیلیم کی ایک بات سچ ثابت ہو چکی تھی۔ زید نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ اسے بیٹی کا باپ بننا پسند نہیں۔

نوشاہہ کے معاملے میں جو واقعہ ہو چکا تھا، اس کا اسے افسوس تھا۔ وہ واقعی زید سے شادی نہ کرنی اگر زید نے نوشاہہ کو طلاق دینے کا قطعی فیصلہ نہ کیا ہوتا۔

زید ہاتھ روم سے نکلا۔ "جاگ نکلیں؟" وہ مسکرایا۔  
 "نیلیم؟"  
 "اس قسم کی جلدی سے غسل کر لو تو ناشتا کیا جائے۔"  
 "تم نہ کھیں جانا کچن میں!" ریمیا نے کہا۔ "ناشا میں ہی تیار کروں گی۔"

"پلو ٹھیک ہے۔ تو بس جلدی سے غسل کر لو۔"  
 "اب میں آرام لگا کر سو یا کروں گی تاکہ تم سے پہلے اٹھ کر ناشتا تیار کروں نا کہ دفتر پر دفتر پہنچا جائے۔"  
 "دفتر....." زید کچھ گتے کہتے رک گیا، پھر بولا۔ "تم غسل تو کرو۔"

ریمیا ہاتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ناشتے کی میز پر تھے۔  
 "دفتر جانے میں آج دیر ہو جائے گی۔" ریمیا نے گھڑی دیکھ کر کہا۔  
 "آج ہم چھٹی کریں گے۔" زید نے کہا۔ "تم نے پریس کر کے کل کے ہی کپڑے پہن لیے ہیں۔ آج دس بارہ جوازوں کی شاٹنگ کر لیتا۔ سینئر بھی اور جوتم ضروری سمجھو۔"

"آتے ہی تم پر بوجھ بن گئی۔"  
 "فصلوں باتیں نہ کرو۔"

"وہ کیا؟"

"ایک تو یہ کہ میں آج ہی ریمیا سے کورٹ میرج کر چکا ہوں۔"  
 ابصار اور نیلیم چونک گئے۔ ابصار نے موبائل کا پیکیج کھول دیا تھا اس لیے نیلیم بھی اس کی آواز سن رہی تھی۔  
 "دوسرے یہ کہ نوشاہہ بھی آئی تھی۔" زید نے دوسرا جملہ کہا۔

"یہ تو درامائی صورت حال بن گئی ہوگی۔" ابصار نے تیزی سے کہا۔  
 "ہاں۔"  
 "تجربہ؟"

"ریمیا کا رویہ مثبت تھا لیکن نوشاہہ جیسے سے انکو مٹی تھی۔ ریمیا تو چاہتی تھی کہ وہ دونوں ہی میرے ساتھ رہیں لیکن نوشاہہ نے اسے بہت برا بھلا کہہ ڈالا اور وہیں اپنے والد کے گھر چلی گئی۔ ریمیا بہت افسردہ ہے۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ تعلیمات میں ہمیں کل کی وقت بتاؤں گا۔"

"دفتر میں؟"  
 "جہاں بھی موقع ملا۔"  
 "تفصیل جاننے کے لیے آج کی رات بے چینی میں مگر رہے گی۔"  
 دوسری طرف سے مزید کچھ غیر رابطہ منتقل کر دیا گیا۔

نیلیم بولی۔ "سب کچھ کراے پر پانی پھر گیا۔"  
 "ایک خاص بات تمہیں کی تم نے؟" ابصار بہت سنجیدہ نظر آیا۔  
 "نہیں تو۔ کیا بات؟"

"اس کے لہجے میں وہ دوستانہ انداز نہیں تھا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اکثر کچن اور اجنبیت بھی اس کے انداز میں۔"  
 نیلیم غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی، پھر بولی۔  
 "کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو گیا کہ تم باہم دونوں نوشاہہ کے گھر گئے تھے اور اسے کچھ باتیں بتاتی تھیں؟"

"ہوسکتا ہے۔" ابصار نے پھر خیال انداز میں سر ہلایا۔ "لیکن یہ بات اسے نوشاہہ نے تو نہیں بتائی ہوگی۔"  
 "تو پھر اس کا بچہ خشک ہونے کا سبب ہوگا اور ہوسکتا ہے۔"  
 "ملاقات ہو تو زیادہ بہتر اندازہ ہو سکتا ہے یا شاید وہ خود ہی مجھ سے اس بات کی شکایت کرے۔"  
 "ریمیا سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"  
 "غیر!" ابصار طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔  
 "جو ہوگا، سامنے آئی جائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔"

"اب بھی ہے۔" نیلیم نے نظریں جھکا کر کہا۔  
 "کیونکہ اس کی وہ بیوی میں ہی ابصار!"  
 ابصار نے ایک طویل سانس لی، پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب تم نے یہ ساری باتیں بتانا شروع کی تھیں، مجھی میرے ذہن میں یہ خیال کھلایا تھا کہ تم دوسری لڑکی کا حوالہ دے کر دراصل اپنی ہی کہانی سنارہی ہو۔"

"کیسے سمجھ گئے تم؟"  
 "چھٹی جس کہو اور۔"  
 "تمہیں یہ جان کر کیا لگا کہ میں بھی تمہارے دوست کی بہوی رہ چکی ہوں۔"  
 "اس سے میرے لیے کیا فرق پڑ سکتا ہے نیلیم تم اس کی بیوی تھیں یا کسی اور کی۔ یہ تم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم مطلقہ ہو۔"

"اب..... یعنی جب ہم شادی کر لیں گے تو تم زید کے سامنے کیسا محسوس کرو گے؟"  
 "میں اس پر بھی ظاہر نہیں کروں گا کہ تم مجھے اس بارے میں بتا چکی ہو اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کرے گا۔" ابصار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "غیر ایہ بات تو کچھ میں آئی کہ تم نے جو کچھ بھی کیا، ریمیا کی بھلائی کے لیے کیا، لیکن ابھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ نتیجہ کیا نکلا۔"

"وہ تو زید سے ہی معلوم ہوگا یا ریمیا اور نوشاہہ سے۔"  
 "اچھا اب آخری بات۔" ابصار نے کہا۔ "ہماری شادی کب ہوگی؟" اس نے شوق نظروں سے نیلیم کی طرف دیکھا۔

"نوشاہہ کا معاملہ معلوم ہو جائے، ایک یہ ابھن تو ختم ہو پھر ہم جب چاہیں شادی کر لیں گے۔"  
 "نوں کرو زید کو۔"

"ہاں، کیا تو جاسکتا ہے۔ فون کرنے کا جواز بھی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وکیل سے مل کر طلاق نامہ تیار کروا کے دفتر کا چکر تو لگے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ اسی بارے میں بات کی جاسکتی ہے۔"

"تو کرو!"  
 ابصار نے اپنا موبائل نکال کر زید سے رابطہ کیا۔  
 "ہاں ابصار!" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تم شاید پوچھنا چاہتے ہو کہ میں دفتر کیوں نہیں آیا؟"  
 "ہاں اسی لیے فون کیا تھا۔"  
 "دراصل معاملات کچھ سمجیر ہو گئے تھے۔"



”ہاں۔ میں اسی جیسے میں فینس کورٹ بنواؤں گا۔“  
 زید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب بتاؤ، کیا اس کے لیے مالی رکھنے کی ضرورت ہے؟“  
 ”اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا تا کہ تم کیا بنانا چاہتے ہو۔“ ریمہ بھی مسکرائی۔ ”لیکن مالی کی ضرورت تو ہے۔ لان کے باقی حصوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کچھ دن سے ان کی دیکھ بھال نہیں ہوئی۔“  
 ”فینس کورٹ بیٹنے کے بعد ہی سب ٹھیک کر دیا جائے گا مالی رکھ کر۔“

”یہ تیل بھی مر جھا رہی ہے۔“  
 ”کہنا نا جان! فینس کورٹ بیٹنے کے بعد یہ سب ٹھیک کر دیا جائے گا۔“  
 اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے وہ خاصی دیر تک لان میں ٹپکتے رہے، پھر گھر میں لوٹے۔ زید نے کہا۔ ”ایک کپ چائے اور ہو جائے۔ اس کے بعد چلتے ہیں بازار۔“  
 ریمہ نے کچن کا رخ کیا۔ چائے پینے کے بعد وہ دونوں گھر سے روانہ ہوئے۔ شاپنگ میں ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ پھر انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔  
 گھر کی طرف واپس آتے ہوئے زید نے کہا۔ ”تم اپنا استعفا آج ہی لکھ لیتا۔ صبح دفتر جاؤں گا تو تینا جاؤں گا۔“  
 ریمہ چونکی۔ ”کیا مطلب؟“  
 ”اب تم ملازمت نہیں کرو گی۔“  
 ریمہ کو یاد تھا کہ نوشابہ نے بھی شادی کے بعد فوراً ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اس کی ملازمت بھی زید نے ہی چھڑوا دی ہوگی۔

”گھر پر ایسی بڑی کیا کروں گی؟“ وہ بولی۔  
 ”گھر میں انسان اپنے لیے بہت سے شغل کر سکتا ہے۔ گانے سنو، فلمیں دیکھو، وڈیو گیمز کھیلو۔ انٹرنیٹ بھی استعمال کرو۔ فیس بک پر بھی ایجادات گزرسکتا ہے۔ اپنی دوستوں کو بھی بلاسکتی ہو۔ خود بھی کسی دوست سے ملنے جا سکتی ہو۔ ارے ہاں! ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ کل تمہارے لیے نئی کار بھی آجائے گی۔“  
 ریمہ ہنسی۔ ”کیا کیا کرو گے میرے لیے؟“  
 ”کسی فلمی ہیرو کی طرح میں آسمان سے تارے تو ڈر لانے کی بات تو نہیں کروں گا۔“ زید نے ہنس کر کہا۔ ”باقی سب کچھ کرنا ہے تمہارے لیے۔“  
 ”شادی تو ہماری ایسے ہی ہوگی۔ جو بے تکلف دوست ہیں، انہیں تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ ان کی شکایت

دور کرنے کے لیے ان کی ایک دعوت تو کرنی چاہیے۔“  
 ”وہ تو کی ہی جائے گی۔ معلوم تو ہو جائے گا سب کو۔ میں تمہارا استعفا لے کر تو جاؤں گا ہی۔ سوالات تو مجھ سے ہی شروع ہوں گے اور میں یہ بات کسی سے چھپانا بھی نہیں چاہتا۔ کوئی جرم تو نہیں کیا ہے ہم نے؟“  
 ”میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے میری محبت مل گئی۔“ ریمہ نے کہا اور اپنا سر زید کے شانے پر رکھ دیا۔

☆☆☆☆

اسی دن ابصار نے زید کو پھر فون کیا۔ زید نے ہنس کر کہہ دیا۔ ”شادی کر کے کیا ایک دن کی پچھلی بھی نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال کل یعنی طور پر آؤں گا۔ چاہو تو سب کو بتا دینا کہ ریمہ سے میری شادی ہو گئی ہے۔ اب وہ ملازمت بھی نہیں کرنے گی۔ کل میں اس کا استعفا لے کر آؤں گا۔“  
 اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن زید اس کا استعفا لے کر دفتر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ہی ریمہ کے موبائل پر نیلم کی کال آئی۔

”میں کل ہی سے..... بے چین تھی تم سے باتیں کرنے کے لیے لیکن اس خیال سے خون چیر گیا کہ تمہارے ساتھ زید بھی ہوگا۔“  
 ”ہاں۔ کل کے بعد سے اب تک ہم دونوں ساتھ ہی رہے ہیں۔ زید کے دفتر جانے کے بعد اب ایکی ہوئی ہوں۔“  
 ”زید کو یہاں دیکھنے کے بعد ہی نہیں فون کیا ہے۔“  
 ”میں خود بھی تم سے کچھ باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ زید نے میرے لیے کارلی ہے۔ آج ہی کسی وقت آجائے گی۔ کل تم سے دفتری اوقات میں ہی ملنے آؤں گی لیکن کسی اور جگہ!“

”نئی کار کے لیے مبارکباد!“  
 ”تھینکس ڈیر!“  
 ان دونوں میں مختصر بات ہوئی۔  
 ریمہ کے لیے نئی کار آگئی۔ اس شام بھی انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ نئی کار کی ڈرائیونگ ریمہ ہی نے کی۔ زید اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ دفتر میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ وہ کسے کیا جواب دیتا رہا تھا۔  
 اس کے اگلے دن تین بجے ریمہ کی نیلم سے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوئی جو دفتر سے خاصا دور تھا۔ ملاقات کا وقت اور ریسٹورنٹ کا تعین فون پر کر لیا گیا تھا۔  
 ”شکایت ہے مجھے تم سے۔“ ریمہ نے چھوٹے ہی

## سنگین خاتمہ

کہا۔ ”نوشابہ کو تم نے ہی بتایا ہوگا کہ میں اور زید شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔“  
 ”کیا یہ تمہیں نوشابہ نے بتایا ہے؟“ نیلم نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”اس نے دانستہ نہیں بتایا۔ بس ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا اس کے منہ سے جس سے یہ بات ظاہر ہو گئی۔ زید کا خیال ہے کہ یہ بات نوشابہ کو ابصار نے بتائی ہوگی۔“  
 ”لیکن دفتر میں اس نے ابصار سے کچھ نہیں کہا۔“  
 ”وہ اس بات کی وجہ سے تعلقات میں کمی نہیں لانا چاہتا ہوگا۔“

”یہی بات ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اس کے مزاج کے خلاف ضرور ہے۔ وہ بہت معمولی باتوں پر لوگوں سے خفا ہو جاتا ہے۔“  
 ”خیر، اسے چھوڑو۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں زید کے لیے سب کچھ برداشت کروں گی لیکن تم نے چاہا کہ ہماری شادی نہ ہو۔“

”میں چاہتی تھی کہ تم مستقبل میں پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں تمہاری بھلائی چاہتی تھی۔ مجھے اعتقاد ہو گیا تھا کہ تم بہت جذباتی ہو رہی ہو اس لیے میں تمہیں کچھ بھی بتاؤں زید کے بارے میں، ہم شادی کر کے ہی مانو گی۔ اسی لیے میں نے چاہا تھا کہ نوشابہ ابس چلی جائے تو تم زید سے شادی نہیں کر سکو گی۔ خیر!..... اب تو جو ہو رہا تھا، ہو چکا۔ اب میری دو ایک باتیں اور سن لو میں تمہیں زید کے مزاج سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ تم وہ غلطیاں نہ کرو جو زید کے مزاج پر گراں گزریں گی۔ اب یہ میں نہیں جانتی کہ تم میری باتوں پر اعتبار کرو گی یا نہیں۔“

”اب تو کروں گی۔“ ریمہ نے کہا۔ ”تمہاری ایک بات بالکل سچ ثابت ہو چکی ہے۔ زید کو لڑکی کا باپ بننا گوارا نہیں۔“  
 ”اسے اور بھی کئی چیزیں گوارا نہیں۔“  
 ”وہ بھی مجھے بتا دو نیلم! میں ہر بات کا خیال رکھوں گی۔ میں زید کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔“  
 ”مگر کن باتوں کا خیال رکھو گی ریمہ!“  
 ”ہر بات کا خیال رکھوں گی۔ میں نے کہا نا، میں زید کو کھونا نہیں چاہتی۔“  
 ”ایک وعدہ کرو، حالانکہ تم ایک..... اچھا خیر،



”لیکن آج ہی کیوں؟“ زید نے جرح کی۔  
 ”وہ امریکا سے واپس تو آئیں گے اور والدہ مجھ سے رابطہ ضرور کریں گی۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں ان سے کیا بات کروں گی اور کس طرح کروں گی۔“  
 ”دو تین دن کے بعد خیال آیا ہے کہ ہمیں اس کا؟“  
 ”یہ دن تو تمہاری محبت کی سرشاری میں گزر گئے۔“  
 ”تو کچھ دن میں وہ سرشاری ختم ہو جائے گی؟“  
 ”کیسی باتیں کرنے لگے تم زید! ریمیا اپنی جگہ سے اٹھ کر زید کے پہلو میں جا بیٹھی۔ ”دو تین صدیاں بھی میری سرشاری ختم نہیں کر سکیں۔ بس توجہ! انھیں اس لیے ہوئی کہ آج میں ذرا دیر کے لیے سو گئی کی تو والدہ خواب میں نظر آئی تھیں۔ وہ دونوں امریکا سے واپس آ جائیں اور والدہ سے ایک بار بات ہو جائے تو یہ انھیں بھی ختم ہو جائے گی۔“  
 زید نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ زید کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کال کرنے والا ڈی ایس بی اشرف تھا۔ اس سے زید کی واقفیت بھی تھی۔ ایک نامور جرنلسٹ کی حیثیت سے اس کے تعلقات پولیس کے بہت سے لوگوں سے تھے لیکن اس وقت ڈی ایس بی کی کال اسے نہ جانے کیوں غیر متوقع لگی۔  
 ”بی اشرف صاحب!“ اس نے ماؤ تھیں میں کہا۔ ”کیسے یاد کر لیا اس وقت؟“ پھر کچھ سننے کے بعد بولا۔ ”ضرور تعریف لائے، میں گھر پر ہی ہوں۔ اگر مجھے وہ معلومات ہوں گی تو ضرور بتاؤ گا آپ کو۔۔۔۔۔۔ جی ہاں، آجائے! میں ڈسٹرپ نہیں ہوں گا۔“ اس نے فون بند کر دیا۔  
 ”کون آرہا ہے۔۔۔۔۔۔ کون تھا؟“ ریمیا نے پوچھا۔  
 ”ڈی ایس بی ہے ایک۔ اشرف نام ہے۔“  
 ”پولیس!“ ریمیا کالج گھر آیا ہوا سا تھا۔  
 ”ختم تو پریشان ہو گئی!“ زید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پولیس میں بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں میرے۔ ان لوگوں کو اگر کسی کے سلسلے میں کچھ معلومات درکار ہوں تو یہ اکثر مختلف جرنلسٹوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ اچھے جرنلسٹوں کو پولیس سے زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔“  
 ”وہ ابھی آرہا ہے؟“  
 ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ تم سن تو چکی ہو۔ اس میں اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“  
 ”وہ مجھے تو نہیں جانتا ہوگا۔“  
 ”وہ نوشاہہ کو بھی نہیں جانتا۔ اگر کبھی کوئی پولیس آفسر

وہ جھٹکھٹکھٹ کر آیا ہو تو وہ لاش اس کے علم میں آجکتی ہو۔“  
 ”زید تو یہ بات اسے ہرگز نہیں بتا سکتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نوشاہہ سے شادی کرنے کے بعد بھی اس نے کوئی ٹکٹ لیا ہو؟“  
 ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“  
 ٹیلیم کو پھر ٹیکس کورٹ کا خیال آ گیا تھا جو زید بنانا چاہتا تھا۔ وہیں اس نے ایسی جگہ بھی دیکھی تھی جو کھدو اگر بند کی جانی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ وہاں بھی کوئی لاش دفن ہوئے ہو؟ ہمیشہ کے لیے چھپانے کے لیے زید وہاں ٹیکس کورٹ بنوانا چاہتا ہو؟ یہ خیال اس کے دماغ میں تو آیا لیکن اس نے ٹیلیم سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔  
 ”نوشاہہ کے پاس تم ابصار کے ساتھ گئی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“  
 ”یہ شہ زید کو بھی ہوا ہے۔“  
 ”دو تو ہوگا۔ مجھے اس سلسلے میں تشویش ہے۔ ابصار کے لیے بھی زید کے دل میں گروہ بڑھ گئی ہوگی۔“  
 ”تم نے مجھ سے پہلے اس کی بات کسی کو نہیں بتائی؟“  
 ”نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں۔ اگر وہ میری وجہ سے قانون کی زد پر آتا تو میں ممکن ہے کہ حضانہ پر رہا بھی ہو جائے۔ اس صورت میں وہ میری جان کا بھی دشمن ہو جائے گا۔ اب مجھے سوچنا ہوگا کہ ابصار کو کس طرح سمجھاؤں کہ وہ زید کے معاملے میں محتاط رہے۔ کیا جواز پیش کروں گی اس کا۔ یہ تو شاید مناسب یا ممکن نہیں کہ میں اسے بھی ٹکٹ کے بارے میں بتا دوں۔“  
 ”صرف میری خاطر تم دونوں نے یہ پریشانی مول لی ہے۔ میں تم دونوں کا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گی۔“  
 ٹیلیم کچھ ٹیکس بولی۔ اب وہ بھی پریشان نظر آنے لگی تھی۔  
 ☆ ☆ ☆  
 اسی دن گھر پر ریمیا اور زید شام کی چائے پی رہے تھے۔ زید نے کہا۔ ”میں نے بات کر لی ہے۔“  
 ”کیا!“ ریمیا اس طرح چونکی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔  
 زید نے اسے غور سے دیکھا، پھر بولا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تک کل سے مختلف نظر آ رہی ہو۔ میں دوبارہ محسوس کر چکا ہوں کہ تم کسی خیال میں گم ہو جاتی ہو۔“  
 ”وہ۔۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔۔ والدین آج بہت یاد آرہے ہیں۔“ ریمیا نے بات بتائی۔

”اگر تم نے کسی خوب صورت مرد کی طرف ذرا سی توجہ سے بھی دیکھ لیا تو اسے برا لگے گا۔ وہ مرد دوستوں سے تمہاری بے تکلفی بھی پسند نہیں کرے گا۔ تم ٹیکس کورٹ جانی ہو۔ وہاں بھی تمہاری کچھ مردوں سے اچھے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان کی بے تکلفی بھی زید کی نظر میں آئی تو اس کا پارہ چڑھ جائے گا۔“  
 ریمیا کو اس ٹیکس کورٹ کا خیال آیا جو زید اپنے گھر کے لان میں بنوانا چاہتا تھا جس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ وہ گھر میں ہی ٹیکس کھلا کرے۔  
 ٹیلیم نے مزید کہا۔ ”اگر کسی مرد نے تمہاری تعریف کر دی تو کچھ قیامت ہی آجائے گی۔“  
 ”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔۔ میرے اختیار کی بات نہیں کہ کسی کو اپنی تعریف کرنے سے روکوں۔ میں زید کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہوں لیکن مجھے کیا معلوم کہ کوئی شخص کب میری تعریف کرے گا۔“  
 ”اسی لیے میں نے شاید کہا بھی تھا کہ میں تم کو مستقبل کی پریشانیوں سے بچانا چاہتی ہوں لیکن میں نہیں یہ سب کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اب تو مجبوراً بتا دیا کیونکہ تم شادی کر چکی ہو۔ تمہیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔“  
 ”یہ تو شاید اسی صورت میں ممکن ہے کہ کچھ سے لگنا ہی چھوڑ دوں۔“  
 ”زید کے ساتھ تو باہر لگنا ہی پڑے گا۔“  
 ریمیا اب واقعی بہت پریشان نظر آنے لگی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”زید کا قاتل ہونا بھی میرے لیے پریشان کن ہے اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن وہ سب کچھ ہے جو تم نے مجھے ابھی بتایا ہے۔“  
 ”یہ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ شادی کر کے تم اپنا مستقبل پریشانیوں میں جھونک دو گی۔“  
 ”ہوں۔“ ریمیا کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ سوچ بچار میں مصروف تھی۔  
 ”یہ سب کچھ نوشاہہ نے اس طرح سن لیا ہوگا۔ وہ بڑبڑائی۔  
 ”یہ تو نوشاہہ ہی بتا سکتی ہے۔“  
 ”اب مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔“ ریمیا نے کہا۔  
 ”نوشاہہ نے زید کے گھر سے جاتے وقت اسے دھمکی دی تھی۔ کہا تھا کہ اگر زید نے اسے طلاق دی تو وہ بھی پھر کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ لان میں دفن لاش سے باہر ہو گئی ہو۔“  
 ”یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس نے پودوں کا

تمہیں یہ بات بتانے بھی ہے۔“  
 ”یعنی۔۔۔۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ ریمیا ہلکا مٹی۔  
 ”نوشاہہ سے پہلے اس نے تم سے شادی کی تھی؟“  
 ”ہاں۔“ ٹیلیم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اور پھر اس شخص کی لاش اپنے عقی لان میں دفن کر دی گئی۔ بعد میں اس جگہ پودوں کا ایک جھنڈ بھی بڑی خوب صورتی سے بنوایا تھا۔ خوب صورتی سے جھنڈ بنانا اس کے مالی کا کمال تھا۔“  
 ریمیا کو ایسا محسوس ہوا جیسے خون اس کی رگوں میں جمند ہونے لگا ہو۔ وہ ایک دن پہلے ہی عقی لان میں پودوں کا ایک جھنڈ دیکھ چکی تھی۔  
 ”میں ابصار کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔“ ٹیلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن یہ بات میں نے اسے بھی نہیں بتائی۔“  
 ”ٹکٹ کے کیا تھا؟“  
 ”کلب میں کوئی ملا تھا۔ وہ اور زید ایک دوسرے کے دوست تو نہیں تھے لیکن ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس شخص نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ وہیں کے اثرات تھے جو اس نے میری تعریف کر دی۔ یورپ کے لوگ تو کسی سے اپنی بیوی کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ کسی سے اپنی بیوی کی تعریف سن کر لوگ برا بن جاتے ہیں۔ بس یہ نہیں ہوتا کہ وہ تعریف کرنے والے کو ٹکٹ کر دیں۔ زید کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہے۔“  
 ”اگر میں پودوں کا وہ جھنڈ کھدوا دوں؟“  
 ”تو تمہیں وہاں ایک انسانی جگر لے گا، یا شاید صرف ہڈیاں ملیں کیونکہ اس شخص کو دفن ہونے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد زمین میں دفن ہوئی لاش کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔“  
 ”تم نے مجھے بڑی خوف ناک بات بتائی ہے۔“  
 ”تم وہ جھنڈ کھدوا نہیں سکتیں۔“ ٹیلیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”زید تمہیں ایسا کرنے ہی نہیں دے گا۔ وہ تم سے کہے گا کہ اتنی خوب صورت چیز کیوں تباہ کرنا چاہتی ہو۔“  
 ”اس سے طلاق تم نے لی تھی یا اس نے دی تھی؟“  
 جواب میں ٹیلیم نے اسے بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو ابصار کو بتا چکی تھی پھر اس نے کہا۔ ”نوشاہہ پر تو مجھے حیرت ہے کہ اس نے ایک طویل عرصہ زید کے ساتھ گزار لیا۔ نہ جانے کیا کچھ برداشت کیا ہوگا اس نے۔ تم شاید نہ کر سکو۔“  
 ”وہ کیا باتیں ہیں؟“ ریمیا نے پریشانی سے پوچھا۔



ہے۔ اب تم میری بات سنو..... ابصار نے جو پرچہ چھوڑا ہے، وہ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں ہوں۔ اس نے لکھا ہے..... نیکم ڈیر! تھوڑی دیر پہلے زید کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ آج ریمانے کوئی خاص خوش بٹائی ہے کھانے میں اور ابھی مجھ سے کہا ہے کہ نیکم اور ابصار کو بھی کھانے پر بلا لو۔ میں نے اسے بتایا کہ نیکم تو ابھی والدہ سے ملنے کی ہوئی ہے، رات کو نہ جانے کس وقت آئے تو اس نے کہا..... چلو تم آ جاؤ اور سرشام ہی آ جاؤ۔ کچھ گپ شپ رہے گی کھانے سے پہلے۔ میں نے ہائی بھری تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ چند روز تو چپ رہا لیکن اب وہ زیادہ بے چین ہو گیا ہے۔ وہ گلے شکوے ہی کرنا چاہتا ہوگا۔ میں بھی اسی لیے جا رہا ہوں کہ ذہن سے یہ بوجھ تو ہٹے۔ تم اگر دس سے پہلے آ جاؤ تو تم بھی وہاں آ جاؤ۔ میں تمہیں فون کرتا لیکن اس میں نہ جانے کیا خرابی ہوئی ہے۔ کام ہی نہیں کر رہا ہے اس لیے یہ پرچہ چھوڑے جا رہا ہوں۔

”یہ..... کیا بات ہوئی۔“ ریمانے کہا۔ ”مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا زید نے۔ اس نے ابصار کو اس وقت فون کیا ہوگا جب میں مارکیٹ روانہ ہوئی تھی۔“

”یہ اور خطرناک بات ہے۔ اس نے ابصار کو تنہائی میں بلایا ہے۔ خدا خیر کرے۔ تم جلدی گھر پہنچو، میں بھی روانہ ہوئی ہوں بلکہ روانہ ہو چکی ہوں۔ یعنی گھر سے نکل آئی ہوں اور کار کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ تم کم مارکیٹ میں ہو؟“

ریمانے مارکیٹ کا نام بتایا۔

نیکم بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم دس منٹ میں پہنچ جاؤ گی۔ مجھے بھی چندہ منٹ سے زیادہ نہیں گھنٹے چاہئیں۔ ایک بات اور بتا دوں۔ پرچے کے آخر میں ابصار نے دو وقت بھی لکھا ہے جب اس نے پرچہ لکھا تھا۔ وہ وقت اب سے بارہ منٹ پہلے کا ہے۔ وہ تمہارے گھر پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ تم جلدی پہنچو ریمانہ وہاں نہ جانے کیا عمل جائے۔“

ریمانے نیکم کی کار کا آئین اشارت ہونے کی آواز بنی۔

”تم نے ابصار کو یہ نہیں بتایا تھا کہ زید ایک کل بھی کر چکا ہے؟“

”نہیں۔“ نیکم نے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ بات میں ابصار کو بھی نہیں بتا سکتی۔ تمہارے سامنے بس زبان پھسل گئی تھی میری۔ اب اس وقت میں سمجھتا رہی ہوں۔ اگر ابصار کو بتا دیتی تو وہ محتاط رہتا۔“

”دعا کرو کہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ میں بہت تیزی سے کار چلا رہی ہوں۔ میرے سامنے تو زید کوئی زیادتی نہیں کرے

ہو جائے گا۔“ زید کا کھڑی ہو گئی۔

”اچھا، جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ نیکم نے فون کر کہا۔

☆☆☆☆

ریمانہ دوسرے دن شام کو گھر سے نکلی تھی۔ اسے چکن کے لیے کچھ خریداری کرنی تھی مگر شہر روز اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں کچھ خاص چیزیں نہیں تھیں۔ ان میں دو ایک ایسی چیزیں بھی تھیں جو شاہد استنبال ہی نہیں کرتی ہوگی لیکن ریمانہ جو دو ایک خاص ڈشز بناتی تھی، ان کے لیے وہ چیزیں ضروری تھیں۔ سب کچھ خریدنے میں ایک گھنٹہ کا پھر وہ واپسی کے لیے اپنی کار میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی کھنکھائی۔ اسکرین پر اس نے نیکم کا نام دیکھا۔

”ہیلو!“ اس نے کال ریسیو کی۔ ”کیا بات ہے نیکم؟“

”تم کہاں ہو؟“ نیکم کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔

”کیوں؟ کیا بات ہے؟“

”گھر پر ہوں؟“

”نہیں۔ کچھ خریداری کرنی تھی۔“ ریمانے جواب دیا۔ ”مارکیٹ میں ہوں، بلکہ روانہ ہو رہی ہوں۔ کار میں بیٹھ چکی ہوں۔ آخر بات کیا ہے؟ تم گھبرائی ہوئی کی لگ رہی ہو۔“

”تم نے آج مجھے اور ابصار کو چانک کھانے پر بلایا ہے؟ یعنی ابھی؟“

”نہیں تو۔“

”اوہ گاڈ!“ نیکم کے منہ سے نکلا۔

”یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے تمہیں اور ابصار کو.....“

”میں بتاتی ہوں۔“ نیکم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی کار اسٹارٹ کر کے اپنے گھر روانہ ہو۔ جلدی پہنچنا ہے تمہیں گھر۔ تم کار چلاؤ۔ میں بتاتی ہوں۔“

ریمانے فوراً آئین اشارت کیا اور کار حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں اب بولو..... میں روانہ ہو چکی ہوں۔“

”میں آج دفتر نہیں آئی تھی۔ والدہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ گھر پر نہیں رہیں۔ میں انہیں دیکھنے چلی گئی تھی۔ ابھی گھر کوئی ہوں۔ یہاں مجھے ابصار کا پرچہ ملا ہے۔“

”ابصار کا پرچہ تمہارے گھر پر؟“ ریمانے حیرت سے کہا۔

”ابصار ہی کے گھر پر۔ اب بھی میرا گھر ہے۔ اچھے ہوئے حالات کے باعث ہم دونوں بھی اچھے ہوئے تھے۔ سوچا یہ تھا کہ کسی ہوٹل میں تمام دوستوں کو جمع کر کے تقریب کے دوران اعلان کریں گے کہ ہم دونوں نے شادی کر لی

آرچہ اور ایڈ فورڈ ریمانہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

”غلط سمجھ رہے ہیں آپ۔“ زید بول پڑا۔ ”یہ میری دوسری بیوی ہیں۔ میں جن کی بات کر رہا ہوں، وہ آج کل اپنے والدین کے پاس کئی ہوئی ہیں۔“

”تو کیا.....؟“ ڈی ایس بی اشرف بولا۔

زید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ سوچو۔ طلاق کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ بس کچھ دن کے لیے اپنے والدین کے ساتھ وقت گزارنے چلی گئی ہیں۔ وہی کچھ بتا سکتی ہیں مسٹر بیرٹن کے بارے میں۔ کیسینو میں ان سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی۔“

آرچہ اور ایڈ فورڈ نے کچھ سوالات اور کیے۔ زید اطمینان سے ان کے جوابات دیتا رہا۔ ریمانے سکون محسوس کیا۔ فوری طور پر اسے خیال آیا تھا کہ کہیں بیرٹن کا قاتل بھی زید تو نہیں۔

دس منٹ تک سوال و جواب کے بعد آرچہ نے کہا۔

”ہم آپ کی بیوی سے بھی ملنا چاہیں گے۔ ہمارا مطلب ہے وہ جو آپ کے ساتھ بیٹرس کئی تھیں۔“

”کسی وجہ سے وہ فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتیں۔“

زید نے کہا۔ ”میں آپ کو ان کا پتا دے دیتا ہوں۔ وہاں جا کر ہی آپ ان سے مل سکتے ہیں۔“

”کوئی حرج نہیں۔ ہم پہلے جا سکیں گے۔“

زید نے انہیں نوشاہہ کے والد کے گھر کا پتا دے دیا۔ اس دوران میں زید نے ان کی تواضع کی۔ انہوں نے صرف ایک ایک ڈرنک لی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد ریمانہ بولی۔ ”میں تو ڈر گئی تھی کہ نہ جانے کیا معاملہ ہے..... اب نوشاہہ انہیں نہ جانے کیا بتائے۔“

”جو جانتی ہوگی، وہی بتا دے گی۔ تم مت سوچو اس بارے میں۔“

”چلو نہیں سوچتی۔“ ریمانے مسکرانے کی کوشش کی

ورنہ نیکم سے بات کرنے کے بعد اس کے وجود سے مسکراہٹ کا سفر شاید غائب ہی ہو گیا تھا۔

”اب آج سے ریٹائرمنٹ باڑی ختم..... اب میں کچھ سنبھالوں گی۔“

شادی کے بعد سے اب تک وہ ریٹائرمنٹ میں ہی کھانا کھاتے رہے تھے۔

”اب تو خاصا وقت ہو گیا ہے۔ کل سے سنبھالنا۔“

”ابھی تو خاصا وقت ہے۔ ڈیزہ گھنٹے میں سب

مجھ سے ملے آیا ہے تو نوشاہہ کبھی اس کے سامنے نہیں آئی۔“

”تو میں کبھی اندر چلی جاؤں گی۔“

”نوشاہہ خود ہی نہیں آئی تھی ڈرائنگ روم میں۔ میں نے اسے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ تم سے بھی نہیں کہوں گا کہ چلی جاؤ۔ بیٹھو اطمینان سے۔“

نیکم نے بڑے اطمینان سے باتیں کی تھیں لیکن ریمانہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

آدھے گھنٹے سے بھی کچھ کم وقت میں نہ صرف ڈی ایس بی اشرف وہاں موجود تھا بلکہ اس کے ساتھ دو یورپین بھی تھے۔ تین پولیس کا کنبیل بھی ان کے ساتھ آئے تھے لیکن انہیں باہر چھپ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

”مائی سز۔“ زید نے تعارف کرایا۔ ”اور یہ ہیں میرے کرم فرماؤ ڈی ایس بی اشرف۔“ وہ انگریزی میں بولا تھا کہ یورپین بھی کچھ سکھ گئیں۔

ڈی ایس بی اشرف اور ریمانہ میں رکی جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر ڈی ایس بی نے یورپین کا تعارف کرایا۔ ”یہ مسٹر آرچہ ہیں۔ اور یہ مسٹر ایڈ فورڈ۔ آج ہی فرانس سے آئے ہیں۔“

”اوہ!“ زید مسکراتا رہا۔ ”ابھی کچھ ہی دن پہلے میں فرانس سے آیا ہوں۔“

”یہ اسی لیے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ وہاں ایک اہم شخص مسٹر بیرٹن کا قاتل ہو گیا تھا۔ یہ اسی کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ قاتل کے بعد کی چند فلائش میں کتنے غیر ملکی بیٹرس سے اپنے وطن گئے ہیں۔ اس قاتل کے سلسلے میں ان سب سے پوچھ گچھ کی جائے گی کہ شاید ان کی کسی بات سے قاتل کا کوئی سراغ مل سکے۔“

”یا انہی میں سے کوئی قاتل ہو؟“ زید نے فون کر کہا۔

ڈی ایس بی ہنسا۔ ”اب یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات کے دل میں کیا ہے۔ یہ تو یہی بتا سکتے ہیں۔“

آرچہ اور ایڈ فورڈ مسکراتے لگے۔ ادھر نیکم کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔

”آپ نے شاید مسٹر بیرٹن کا نام تو سنا ہوگا؟“

آرچہ بولا۔ ”ان کی کوئی نہ کوئی خبر دوسرے تیسرے دن اخبار میں آتی رہتی تھی۔“

”آپ مسٹر بیرٹن اسکاٹ کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”جی ہاں وہی۔“

”ان سے میری ایک ملاقات ہوئی تھی ایک کیسینو میں۔“ زید نے کہا۔ ”البتہ میری بیوی انہیں جانتی تھیں۔ جب وہ وہاں زید نیکم تھیں تو مسٹر بیرٹن ان کے کلاس فلپو تھے۔“



”تمہارا ہی ہے۔ دروازے نکال کر لائی ہوں۔“  
 ریمہ کی مائیںس تجزی سے چلنے لگی تھیں۔

”تعلیم کو شہ ہو سکتا ہے۔“ ابصار کی آواز میں ہلکی سی

یوں بالکل کا اسپیکر کھول دیا تھا کہ وہ بھی تمہارا جواب سن سکے۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے یورج میں کھڑی ہوئی



"خوب!" زید مسکرایا۔ "میں نے چاقو نکال کر ابصار سے اپنے مذاق کو اتنا تک پہنچا جاتا تھا۔ اس بہانے پہ بھی جان لیا کہ تم بے وقوف عورت ہو۔"

"میں اب ان باتوں میں نہیں آؤں گی۔" زید نے کہا۔ "چاقو بند کر کے اپنی جیب میں ڈال لو۔"

"اوکے۔ کرتا ہوں۔" زید نے چاقو بند کرتے ہوئے کہا۔ "درد تم بے وقوفی میں گولی چلا بیٹھو گی۔" اس نے زید کی طرف قدم بڑھایا۔ "تم نے آخر سوچ کیسے لیا کہ میں ابصار کو جکڑ کر قتل کرنے والا ہوں۔"

"میری طرف مت آؤ۔" زید چلی۔ "درد نہ میں ڈیگر وہاں دوں گی۔"

زید اپنی جگہ رک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اب بھی تھی، جیسے وہ واقعی بس مذاق کے موڈ میں ہو۔

جال میں ابصار اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے وہ زرد چہرے کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"اب ابصار سے دور ہو جاؤ زید!" زید کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں ابصار کو آزاد کرنا چاہتی ہوں۔"

"بے وقوف!" زید نے منہ بنایا۔ "اب بھی تم یہ سمجھ رہی ہو کہ۔۔۔"

زید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں نے ایک درد مند شخص سے محبت کی ہے۔"

"دیکھو میرا! یقین کرو کہ یہ سب مذاق ہو رہا ہے۔"

"میں ایک قاتل کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

"قاتل؟" زید سوالیہ انداز میں ہنسا۔ "ابصار تمہارے سامنے زندہ ہے اور تم مجھے قاتل کہہ رہی ہو۔"

"پودوں کے اس جھنڈ میں کسی کی لاش دفن ہے؟"

زید نہ صرف چونکا بلکہ اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ ہونٹوں سے مصنوعی مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔

"ہلو یہاں سے۔" زید کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔

زید نے خود کو کھینچا دینے کی کوشش کی اور بولا۔

"جیسے کسی نے بیکار ہے کہ اس جھنڈ میں کسی کی لاش دفن ہے اور اسے میں نے قتل کیا ہے۔ اپنا دامغ ٹھیک رکھو میرا! ابصار کوشش ابھی خود سے آزاد کیے دیتا ہوں۔ بعد میں تم اس جھنڈ کو کھدو اور خود کھد لیا کہ وہاں کوئی لاش دفن نہیں ہے۔"

اس کے انداز سے ایسا ظاہر ہوا جیسے وہ ابصار کی طرف بڑھتا چاہتا ہو۔

"نہیں۔" زید نے اس بار بھی جھج کر کہا۔ "تم بے وقوف کہتے رہو مجھے لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں۔ تم جال کے پاس جا کر خود کو ابصار کی آڑ میں کر لو اور چاقو نکال کر اس کی گردن پر بھی رکھ دو گے۔ مجھے دھمکی بھی دو گے کہ اگر میں نے ریو اور اپنے ہاتھ سے نہ پھینکا تو تم چاقو ابصار کے سینے میں اتار دو گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھیں چاقو دوٹی بھی آتی ہو۔ تم چاقو مجھ پر ہی پھینک دو گے اور شاید اتنے باہر بھی ہو گے کہ میں اس چاقو سے خود کو بچا نہ سکوں۔ نہیں زید!۔۔۔ اب میں بے وقوف نہیں ہوں گی۔ جال سے دور بیٹھو۔"

"جلو بیٹ جاتا ہوں۔" زید نے منہ بنا کر کہا۔ "تم زید کو آزاد کرو اور مجھے ریو اور کی زد پر لیے رہو۔ میں ابھی تم دونوں کو عثمانی لان میں لے چلوں گا۔ وہاں کدال موجود ہے۔ میں خود وہ پودے کھود کر پھینک دوں گا۔ زمین بھی کھود دوں گا۔ تم خود کھد لیا کہ وہاں کوئی لاش نہیں ہے۔ کسی نے درغلا یا ہے نہیں میرے خلاف۔"

"کی حالت تو تم جال کے پاس سے بیٹھو۔" زید نے ہونٹ سمجھنے لیے۔ وہ اب کی صورت۔۔۔ بھی زید کے جھانسنے میں آنے والی نہیں تھی۔

زید ایک ٹھنڈی سانس لے کر جال سے کچھ دور بیٹھ گیا۔ زید آگے بڑھی۔ وہ جال کے قریب پہنچی تھی کہ زید کی آواز سنائی دی۔ "تو۔۔۔ تو میرا خیال۔۔۔ ٹھیک ہی نکلا۔"

کمرے کی چھوٹیں دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا یا کیا ہونے والا تھا۔

زید کی ساری توجہ جال میں پھنسے ہوئے ابصار اور زید کی طرف تھی اس لیے زید کی آواز سن کر وہ چونکی اور مل دوہل کے لیے اس کی نظر نیچے کی طرف گئی۔ ابھی وہ ایک لمبے سے زید نے فائدہ اٹھایا۔ وہ جست لگا کر زید پر جا رہا تھا۔ زید اس جھنگ سے زمین پر گر گیا۔ زید اس کے اوپر تھا۔ اس نے فوراً سنبھل کر زید کے ہاتھ سے پتوٹل چھینا جاپا۔ زید نے فوراً اپنا ہاتھ دوسری طرف کیا تو زید کا ہاتھ اس کی کلائی پر پڑا۔

"چھوڑ دے ریو اور کتنا!" زید غرایا۔ "اچھا ہوا کہ وہ کتنا بھی آگنی جس نے تجھے پودوں کے اس جھنڈ کے بارے میں بتایا ہے۔"

زید نے پوری قوت سے ریو اور زید سے دور رکھنے اور خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس میں اس وقت بلا کی قوت نہ جانے کیسے آگنی تھی کہ زید فوری طور پر ریو اور چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

سنگین خامتہ

"نیلیم!" زید چلی۔ "میرا کرمیری!"

نیلیم بیہوش کی کھڑی رہ گئی تھی۔ زید کی آواز ہی اسے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لائی۔ اس نے جھپٹ کر زید کو شاید اپنی پوری طاقت سے دھکا دیا۔ زید ایک طرف گر تو گیا لیکن زید پر اس نے اپنی گرفت اتنی مضبوط رکھی تھی کہ وہ آزاد نہ ہو سکی۔ اس جھنگ میں دونوں کی پوزیشن کچھ اس طرح ہوئی کہ ریو اور کی نال زید کی پیشانی سے جا لگی اور ٹیکہ پر زید کی پیشانی سے خون اچھل کر نیلم پر آیا۔ خود زید ایک طرف لڑھک کر سہکتا ہوا گیا تھا۔ گولی اس کے دماغ میں ہی بیٹھ گئی ہوئی تھی اس لیے وہ فوری طور پر سموت کی آغوش میں چلا گیا۔

زید ایک دم کھڑی ہوئی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کس طرح کیا ہو گیا تھا۔ جب اس کی نظر زید کی لاش پر پڑی تو پھر اس پر سے ہٹ نہ سکی۔ وہ پلٹیں جھپکائے بغیر لاش کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریو اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اس کی دماغی حالت یکجہاں ایسی ہوئی تھی کہ وہ دوزخ فریب آتے ہوئے قدموں کی آواز بھی نہیں سن سکی۔

قدموں کی وہ آواز پولیس کے لوگوں کی تھی۔

بقول زید کے اس کا "عثمانی مذاق" ایک عقین جیتے پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد نیلم اور ابصار اسی جھنگ کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بیٹھا ہوا پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔

"میرا نام اشرف ہے۔ میں ڈی ایس پی ہوں۔ زید سے میری واقفیت تھی۔ میں دو ایک دن پہلے ہی یہاں آیا تھا۔ میرے ساتھ فرانسسی پولیس کے دو آفیسر بھی تھے۔ وہ خاص طور پر زید سے اور اس کی بیوی سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئے تھے۔"

ڈی ایس پی اشرف نے مختصر طور پر سب کچھ بتایا، پھر کہا۔ "ان دونوں پولیس آفیسرز نے زید کی بیوی سے بھی بات چیت کی تھی۔ ان دونوں ہی سے بات کر کے اس قتل کے سلسلے میں کوئی کیونہیں مل سکا تھا۔ وہ دونوں واپس جا چکے ہیں مگر ان کی وجہ سے۔۔۔ یا یہ کہہ لیں کہ یہاں آنے سے میرے علم میں ایک عجیب بات آئی۔ ان پولیس آفیسرز کو زید سے ملانے کے بعد مجھے تفتیش کے لیے ایک اور جگہ جانا تھا۔ اس لیے میں نے دو کاشیوں اور ایک سراغ رساں

کے کو اپنے ساتھ رکھا تھا لیکن انہیں اندر نہیں لایا تھا۔ ایک پولیس کاشیوں کے کولان میں ادھر ادھر گھماتا رہا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ عثمانی لان میں جا کر کتا ایک جگہ رک کر بھونکے گا۔ وہ بھونکا بھی جاتا تھا اور اس جگہ کی زمین بھی سونگھتا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس جگہ زمین میں کوئی خاص چیز دفن تھی۔ میرا زیادہ خیال اس طرف گیا کہ وہاں کوئی لاش دفن ہے۔"

نیلیم اور ابصار پر سکوت طاری تھا۔ نیلم کی آنکھیں کچھ بھیگی ہوئی تھیں۔

ڈی ایس پی نے خاموش ہو کر کسی کو نام لے کر پکارا۔ فوراً ایک کاشیوں اندر آیا۔ ڈی ایس پی نے اس سے پوچھا۔ "معلوم ہوا کچھ؟"

"ابھی تک کوئی بھی بتانے نہیں آیا۔"

"اگر کوئی اطلاع آئے تو فوراً اندر آ کے اطلاع دیتا۔"

"جی سرا!"

"بس جاؤ۔۔۔"

کاشیوں کے جانے کے بعد ڈی ایس پی نے پھر بولنا شروع کیا۔ "لاش کا خیال آ جانے کے بعد مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا خیال درست ثابت ہوگا۔ زید کے بارے میں یہ بات میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے گھر کے لان میں کوئی لاش دفن ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کے ماضی کے بارے میں جھان بین کروائی۔ اس کے اخباری کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ کسی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا بھی تھا کہ وہ کسی نفسیات سے ملے تو وہ مشورہ دینے والے پر ہنر جاتا تھا۔ آخر آج میں نے فیصلہ کیا کہ وہ جگہ کھدو اور دیکھی جائے۔ میں نے اس وقت ہنگامی طور پر سرج و وارنٹ حاصل کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے تو زید سے اس بارے میں پوچھ کچھ کروں گا اور اگر اس سے مجھے سلی بخش جواب نہ ملے تو پھر کھدائی کرواؤں گا۔ سرج و وارنٹ کی موجودگی میں زید مجھے روک تو نہیں سکتا تھا۔"

اسی وقت دنگ دے کر ایک انسپکٹر اندر آیا۔ "سرا!" اس نے آتے ہی کہا۔ "ایک لاش ملی ہے۔ خاصی گل چکی ہے۔ شناخت بھی مشکل ہے۔"

ڈی ایس پی نے لمبی سانس لی۔ "تو میرا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ اب سارا لان ہی کھدو اور۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ قتل کرتے رہنا اس کی نفرت بن گئی ہو۔ نفسیاتی تفریق تو وہ تھا ہی۔"

انسپکٹر اشبات میں سر ہلا کر واپس چلا گیا۔

"آپ لوگوں کو زید پر بھی اس قسم کا شبہ ہو کہ وہ۔۔۔"



نیلیم سے پہلے ابصار بول پڑا۔ ”کم از کم میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا ہوگا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس نے مجھے بلا کر میرا کیا حال کیا تھا۔ اب بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔“

”ہوں۔“ ڈی ایس پی کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ ”تو میں بتا رہا تھا کہ گیٹ پر پہنچتے ہی مجھے ہنگامے سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ پھر میں پولیس والوں کے ساتھ یہاں بے تحاشائی محسوس پڑا اور یہاں میں نے جو کچھ دیکھا، وہ بھی میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔“ ڈی ایس پی نے اب ابصار کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا بیان ہے کہ آپ نوشاہہ صاحبہ سے اس کی صلح کروانا چاہتے تھے اور کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر ان کے گھر چلے گئے تھے اس لیے وہ آپ کی جان لینے پر تل گیا تھا۔“

”جی۔“ ابصار نے آہستہ سے کہا۔

”میری تحقیقات کے مطابق آپ اس کی پہلی بیوی ہیں یا نہیں۔ آپ میرے منہ سے یہ بات سن کر اس کا اعتراف بھی کر چکی ہیں۔ کیا آپ نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا؟“

”کم از کم اس حد تک تو محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی کا قاتل ہوگا۔“ نیلیم نے جواب دیا۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اسے اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھنی ہوگی ورنہ اسے اعانت جرم میں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور اسے سزا بھی مل سکتی ہے۔

ڈی ایس پی پھر کچھ سوچنے لگا تھا کہ نیلیم پھر بول پڑی۔ ”ریماء کے سلسلے میں آپ کیا کریں گے؟“

”انہیں گرفتار تو کیا جائے گا۔ مقدمہ تو چلے گا ان پر لیکن آپ نے جو حالات بتائے ہیں، ان کی روشنی میں تو سچ کی جاسکتی ہے کہ عدالت انہیں کوئی سزا دے۔“

”اس حالت میں اسے گرفتار کریں گے؟“ نیلیم کی آواز بھر گئی۔

”ممکن ہے اتنی دیر میں اس نے سنبھال لے لیا ہو۔“

”ابھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر انہیں گرفتار کر کے ہاسپٹل اسی لیے نہیں بھیجا ہے ابھی کہ شاید وہ سنبھل جائیں اور میں یہیں ان کا بیان لے لوں۔ آئیے چل کر دیکھتے ہیں۔“

ڈی ایس پی کے ساتھ وہ دونوں بھی اٹھے۔ پھر وہ جس کمرے میں داخل ہوئے، وہ زید کا بیڈروم تھا۔ ریماء بستر پر چٹ لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”ریماء!“ نیلیم نے اسے پکارا۔

ریماء نے آہستگی سے سر اٹھا کر ان تینوں کی طرف

دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان میں سے کسی کو بھی نہ پہچانتی ہو۔

”ریماء!“ نیلیم نے اس کے قریب جا کر اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”میں نیلیم ہوں ریماء!“

ریماء اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھی کوشش نہیں کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیلیم نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ابصار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی وقت ایک کانسٹیبل نے اندر آ کر اطلاع دی۔ ”سر! ایک صاحبہ آئی ہیں۔ ایک بڑی عمر کی خاتون اور ایک مرد بھی ان کے ساتھ ہیں۔ وہ اپنا نام نوشاہہ بتا رہی ہیں اور روتی بھی جا رہی ہیں۔“

نیلیم نے ہی فون پر نوشاہہ کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ اب ساری عمر رونا ہی نوشاہہ کا مقدر بن چکا تھا۔ اس کے دل سے زید کی محبت ختم نہیں ہوئی تھی۔

ریماء کو پولیس اسی وقت اپنے ساتھ لے گئی۔ اسی رات پودوں کا جھنڈ بھی کھود ڈالا گیا تھا اور وہاں سے بھی ایک لاش ملی تھی۔

”ہمارا کام اب بھی ختم نہیں ہوا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”اب یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ ان دونوں کو کیوں قتل کیا گیا تھا اور وہ کون تھے۔“

لان سے کوئی تیسری لاش نہیں ملی تھی۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ عدالت نے ریماء کو کسی بھی قسم کی سزا نہیں دی تھی۔

عدالت سے ہی نیلیم اور ابصار اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس کے والدین کو بھی اس کی اطلاع اس وقت دے دی گئی تھی جب وہ امریکا سے لوٹے تھے۔ حالات جان کر ماں کا جگر تو گویا پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہ ریماء کی زندہ لاش اپنے گھر لے گئے تھے۔ نیلیم اور ابصار کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ریماء کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ سکتے۔

نیلیم اور ابصار بھی خاصے دن تک اس کے لیے افسردہ رہے۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ نوشاہہ کے لیے بھی..... اس کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ اپنا خاصا وقت زید کی قبر پر گزارا کرتی تھی۔

ریماء بھی خود فراموشی کی کیفیت سے کبھی باہر نہیں آسکی۔